شب گزیدہ

عنیزہ سید



پیش لفظ

لفظ اور قلم کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اتنا ہی پرانا جتنا لکھنے کا عمل پرانا ہے۔ لکھنے کے عمل کی ایجاد یا دریافت سے قبل لوگ صرف سوچا کرتے تھے، سوچ کو کبھی کبھار سنا بھی دیا کرتے تھے۔ مگر پھر لکھنے کا عمل ایجاد ہوا اور لفظ اور قلم کا رشتہ بھی جڑ گیا۔

ہر پڑھا لکھا شخص سوچتا ہے اور لکھتا ہے مگر ہر پڑھا لکھا شخص لکھاری نہیں ہوتا۔ لکھاری صرف وہ ہوتا ہے جو صرف اپنی ذات کی سوچ نہیں سوچتا۔ اس کی سوچ انفرادی نہیں اجتماعی ہوتی ہے۔ وہ سب کو سوچتا ہے اور اس سوچ کو لفظوں میں ڈھال دیتا ہے۔ ان صفات کا حامل شخص ہی لکھاری کہلاتا ہے۔

آج سے تقریباً انیس سال قبل اللہ کی ذات کے خاص کرم کے سبب میرے قلم نے میری سوچ کا ناتا لکھے ہوئے لفظ سے جوڑا اور میں بھی انسانوں کی اس صنف کا ایک معمولی سا حصہ بن گئی جسے لکھاری کہتے ہیں۔

کئی برس تک یہ رشتہ تسلسل سے قائم رہا۔ پھر زندگی میں در آنے والی نئی نئی مصروفیات کے سبب اس رشتے کے تسلسل میں توقف ہونے لگا۔ انہی دنوں میں اچانک ''شب گزیدہ'' کی تصنیف کا آغاز ہوا۔

''شب گزیدہ'' کی کہانی عرصہ سے میرے ذہن میں تھی۔ مگر اسے باقاعدہ لکھنے کا آغاز 2000ء میں ہوا۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کے حوالے سے کوئی نئی کہانی تو ہرگز نہیں کہی جا سکتی، مگر کردار و واقعات کے تسلسل نے غالباً اس کو ایک ایسا نیا انداز عطا کیا کہ اس کے حوالے سے ملنے والی فیڈ بیک بے حد حوصلہ افزا رہی۔ اگر اس کہانی کی مصنفہ ہونے سے قطع نظر ایک غیر متعلقہ قاری کی حیثیت میں میں خود اس پر تبصرہ کروں تو میرا خیال ہے کہ ''شب گزیدہ'' نے ڈائجسٹ کے ادب میں ایک نئی جہت کا آغاز کیا اور یقیناً یہ مختصر ناول میرے تصنیفی کیریر میں بھی ایک ٹرننگ پوائنٹ

ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد اس معیار سے کم تر کہانی لکھنے کو میرا کبھی دل نہیں چاہا۔

زندگی کے چھوٹے چھوٹے انجانے تجربات پر مبنی اس کہانی کو لکھنے میں میرے ساتھ بہت سے لوگوں نے تعاون کیا۔ میری والدہ جو میری ہر تحریر میں سورس آف انسپائریشن (Source of Insipration) کی حیثیت رکھتی ہیں' میرے والد جن کے ہاتھ ہمیشہ میری کامیابی کی دعا کے لیے اٹھتے ہیں' میری بہنیں جو میری سب سے بڑی نقاد ہیں' میرے مرحوم بہنوئی زوار بھائی جنہوں نے ہمیشہ میری ہر تحریر کی تعریف کی (کبھی کبھار بغیر پڑھے بھی) میرا بھانجا علی زر جس کو میری کوئی بھی تحریر کبھی بھی قابلِ مطالعہ نہیں لگی مگر جو ہر جگہ میرے حوالے سے اپنا تعارف ضرور کرواتا ہے۔

اور یقیناً میں شب گزیدہ کبھی تحریر نہ کر سکتی اگر میرے شوہر کا بھرپور تعاون میرے ساتھ نہ ہوتا۔ ان دنوں انہوں نے مجھے گھر کی ہر ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا اور میرے بچوں (جو ان دنوں بہت چھوٹے تھے) کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ ایک طرح سے ''شب گزیدہ'' میرے شوہر کی اس بھرپور خواہش کا نتیجہ تھی کہ میں کچھ لکھوں۔ میں ان تمام لوگوں کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس ناول کی تصنیف میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

میں ادارہ ''خواتین ڈائجسٹ'' کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے اپنے صفحات میں ''شب گزیدہ'' کو جگہ دی اور اب اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

عزیز قارئین.... ''شب گزیدہ'' پڑھیے اور اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

دعا گو

عنیزہ سید

عزیز احمد کے فون نے ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی مجھے شرمندہ کر دیا۔ ہر بار کی طرح وہ میرے نہ ملنے کا شکوہ کر رہا تھا اور میں معذرت خواہانہ انداز میں مخصوص الفاظ دہرائے چلا جا رہا تھا۔

''ہمارا تو اب تک نہیں' مگر تمہارا تو یہاں آتے ہی خون سفید ہو گیا شاید۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''نہیں۔'' میں اسے بتانا چاہتا تھا' میرا خون سفید نہیں ہوا نہ ہی میں اپنوں سے دور ہونے کا تصور کر سکتا ہوں مگر وضاحتیں میرے لیے ہمیشہ سے دقت طلب کام رہی ہیں' وقت کی کمی کا قصہ' مصروفیت کا دکھڑا' میں اس کو کیا سناتا وہ ہر بات سے خود بھی آگاہ تھا مگر شکوہ کرنا پھر بھی اس کا حق تھا۔

''دو ماہ ہو گئے یار! جب میں تمہارے پاس گیا تھا اور تمہارے آنے کا وعدہ لے کر آیا تھا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''بس یار! یہ پیسے کی ایجاد نے زندگی میں جس رفتار کو داخل کر دیا ہے۔'' میں نے گھسی پٹی بات کو نئے انداز میں کہنے کی کوشش کی۔

''خیر خیر۔'' وہ میری اس اکتائی ہوئی وضاحت کو کاٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ بتاؤ ٹھیک طرح سیٹ ہو گئے یا نہیں کوئی خاص دقت کوئی پریشانی؟''

''قطعی نہیں- مزے ہیں بس یہ عدیم الفرصتی-'' میں نے ایک بار پھر کہنا چاہا' مگر الفاظ کی عدم دستیابی کی وجہ سے رک گیا-'' خیر یہ طے ہے کہ جب بھی فرصت ملی ،آپی آپ پہنچ جاؤں گا تمہاری طرف-'' گویا بوجھ میرے سر سے ان ہی الفاظ کو اتارنا تھا-

''انشاء اللہ-'' اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا تھا-

''انشاء اللہ-'' میں نے زیر لب دہرایا- اجنبی' زمین پر اجنبی لوگوں کے درمیان اجنبی زبان میں گفتگو کرتے جہاں سارا دن گزر جاتا تھا' وہاں یہ مانوس الفاظ ایک دم کس قدر چونکا دیتے ہیں' اس کا احساس مجھے پہلی بار ہوا تھا-

''اپنے ہاں تو ہم بات بے بات یہ لفظ بولے جاتے ہیں انشاء اللہ- ماشاللہ وغیرہ وغیرہ' میں نے سوچا ''ہاں بھئی عزیز! احمد جب بھی فرصت ملی ضرور حاضر ہو جاؤں گا انشاء اللہ-'' میں نے مسکرا کر زیر لب کہا-

عزیز احمد سے میرا برسوں پرانا تعلق تھا- ہم نے اکٹھے گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کیا تھا- ایم اے میں داخلہ بھی اکٹھے ہی لیا تھا' مگر ایم اے کے بعد عزیز احمد کے دل میں جانے کیا بات آئی کہ وہ اپنے ماحول اور اپنے شہر سے بیزار سا نظر آنے لگا- میرے اور دیگر دوستوں کے سمجھانے پر بھی اس پر چھائی وہ کیفیت دور نہ ہو سکی اور پھر ان ہی دنوں اس کے لاشعور نے وہاں سے کوچ کر جانے کا فیصلہ کیا-

''میں ذرا کہیں جا رہا ہوں-'' ایک روز لارنس گارڈن میں کھڑے اس نے میرے کان میں سرگوشی کی-

''کہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا-

''بس یونہی کہیں کام سے-'' اس نے گول مول سا جواب دیا-

بس یونہی کہیں کام کے لیے وہ گھر سے ایسا نکلا کہ لندن جا کر دم لیا- ایک ماہ کے بعد اس کا خط لندن سے ملا-

''وہاں جو بے چینی سی تھی' یہاں آ کر پتا نہیں کیسے کم ہو گئی ہے- ٹھنڈا ملک ہے غالباً اس لیے-''

اس نے لکھا تھا-

پھر اس کے خط ایک تواتر سے آتے رہے- پہلے پہل وہ یونہی ادھر ادھر چھوٹے موٹے کاموں پر ہاتھ مارتا رہا پھر اچانک راوین کے اردو سیکشن کی ایڈیٹری کام آ گئی' اسے بی بی سی کے اردو سیکشن میں نوکری مل گئی- اس وقت سے اب تک وہ وہاں ہی تھا ہول ٹائمر کی حیثیت میں-

عزیز احمد سے میری دوستی ویسی نہیں تھی جیسی عام طور پر کسی کے ساتھ ہوا کرتی ہے- بلکہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب عزیز اور میں بغیر الفاظ کے ایک دوسرے سے گفتگو کیا کرتے تھے اور ذہنی ہم

آہنگی کا یقیناً یہ وہ نقطہ ہے جس سے آگے کا کوئی تصور ہی نہیں- ہماری سوچ' دلچسپیاں' معمولات زندگی' رہن سہن اور سب سے بڑھ کر حالات و مسائل ایک سے تھے اور یہی مشترکہ حالات' ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آنے کے بعد وہاں پہنچانے کا باعث تھے جہاں میں نے جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے والا معاملہ شروع ہو جاتا ہے پڑھائی کے دور میں ہم ہمیشہ ایک ساتھ رہے تھے- گھنٹوں بے مقصد شہر میں گھومتے بتھے زندگی اور زندگی کے حقائق کا ہم نے مل کر اس قدر قریب سے مشاہدہ کیا تھا کہ اس کے رموز و اسرار سمجھ میں آنے لگے' تھے- معلوم نہیں کیسے مگر ایسا بار بار ہوا کہ عزیز احمد کے لندن چلے آنے کے بعد بھی جب جہاں اسے کوئی پریشانی لاحق ہوئی' مجھے اکثر پاکستان میں بیٹھے ہی علم ہو جاتا (ایسا ہی دعواوہ بھی میرے لیے کرتا ہے) ہمارے درمیان خطوط کا سلسلہ عرصہ ہوا منقطع ہو چکا تھا' کئی برسوں کے بعد مجھے اس کا خط ملا-

''کل اتفاق سے پاکستان ہاؤس جانا ہوا' امیدواروں کی فہرست میں تمہارا نام پڑھا اور شکر ادا کیا 'امید قائم رکھو' ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائے گا-''

اس نے لکھا تھا-

میں جانتا تھا کہ میری یہاں پر تقرری میں عزیز احمد کا بڑا ہاتھ تھا- اتنے برسوں میں اس کی بہت سے لوگوں سے شناسائی ہو چکی تھی اور میرے لیے 'لابی' بنانے میں اور بہت سی باتوں کے ساتھ اس کی خوش گفتاری کا بھی بڑا حصہ تھا- مگر اتفاق تھا کہ ہیتھرو ایئر پورٹ پر اپنے استقبال کے لیے آئے ہوئے گنے چنے چند لوگوں کے ساتھ ہی اس سے ملاقات کے بعد میں اس سے ملنے کا وقت ہی نہ نکال سکا تھا اور وہ بھی شاید مجھے آزما رہا تھا ہر بار فون پر گلے شکوے کے بعد وہ یہ ضرور کہتا-

''ہمارا تو اب تک نہیں مگر تمہارا تو یہاں آتے ہی خون سفید ہو گیا شاید-''

اور میں زیر لب وقت کو کوستا رہ جاتا- پہیے کی ایجاد اور انسانی زندگی کی رفتار کا فارمولا دہراتا مگر میں جانتا تھا کہ عزیز احمد جیسے دوست کے لیے معذرت خواہانہ انداز میں ادا کیے یہ جملے کافی نہیں تھے- سو اس ہفتہ کو میں نے اس کے پاس جانے کا پکا پروگرام بنا لیا-

آکسفورڈ اسٹریٹ میں بی بی سی کا بیرونی نشریات کا دفتر تھا- یہ بات عزیز احمد نے مجھے یہاں آتے ہی بتا دی تھی- بالائی منزل پر جگہ جگہ رک رک کر دریافت کرنے پر بالآخر میں نے عزیز احمد کا کھوج لگا ہی لیا- وہ ٹاک ریکارڈ کروا رہا تھا- ایک عزیز احمد کے دیرینہ دوست تھے ان سے گفتگو کے دوران اردو سروس کے بارے میں میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا- خود تیار کی ہوئی کافی وہ میرے سامنے رکھ ہی رہے تھے جب دروازہ کھلا اور کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا-

''رضوی صاحب! یہ کوئی بات ہے' وعدہ کرتے ہیں' وقت دیتے ہیں' بلا لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں ابھی گنجائش نہیں- اب ہمیں اتنا ہی گرا پڑا سمجھا جانے لگا ہے-''

غصیلی نسوانی آواز پر میں نے لاشعوری طور پر سر اٹھایا اور رضوی صاحب کے کمرے کی ہر چیز پس منظر میں چلی گئی سوائے اس کے جو ابھی ابھی دروازہ کھول کر اندر آئی تھی اور تیز غصیلی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی-

''اب میرے پاس تو اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا-'' وہ کہہ رہی تھی ''دیکھیں جی یہ وہ شہر ہے جہاں پر ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے نہ ایک سیکنڈ آگے نہ ایک سیکنڈ پیچھے مگر ہمارے ہاں افوہ بھئی' پاکستانیت نبھانا تو کوئی یہاں کے لوگوں سے سیکھے-'' وہ بولے چلی جا رہی تھی-

''ہونا کیا ہے؟'' وہ کچھ ٹھنڈی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی-

''مشتاق صاحب نے کہا نہیں تھا مجھ سے کہ بچوں کے پروگرام کے لیے نغمہ ریکارڈ کروانا ہے' وقت بھی دیا دن بھی- اب آئی ہوں تو معلوم ہوا کہ اس بار کے لیے میں نہیں شازیہ مختار نغمہ ریکارڈ کروا رہی ہیں- میرا تو ضائع گیا نا' دن بھی اور وقت بھی ویک اینڈ پر سو کام ہوتے ہیں آدمی کو-''

رضوی صاحب اس کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے-

''کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے جی!'' انہوں نے اس سے گفتگو روک کر درمیان میں مجھ سے کہا اور پھر اس سے مخاطب ہوئے مگر مجھے کافی کا دھیان ہی نہیں رہا تھا- میں عالم تحیر میں تھا' بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا' میری زبان گنگ تھی اور اس وقت ایک لمحہ کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا ایک ایک عضو مفلوج ہو چکا تھا-

''ٹھیک ہے جی' ضرورت تو آپ کو ہے مجھے نہیں میرے کرنے کے سو کام ہیں' جب آپ کو ضرورت ہو گی تو خود ہی بلا لیں گے-''

اس نے اچانک اپنا بیگ سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک اچٹتی ہی نظر مجھ پر ڈالی اور یقیناً اس نظر میں شناسائی کی کوئی چمک نہیں تھی اور ظاہر ہے کہ مجھے دیکھ کر اس پر وہ کیفیت طاری ہونے کا بھی کیا سوال تھا جو اسے دیکھنے پر اس وقت سے اب تک مجھ پر طاری تھی-

''کافی آپ نے پی نہیں؟'' رضوی صاحب نے مجھے چونکا دیا- میرے حواس اپنی جگہ پر آنے لگے اور مجھے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کمرے کی باقی اشیاء بھی پیش منظر پر موجود ہیں- میں نے ٹھنڈی کافی کی پیالی اٹھائی اور ایک سیکنڈ میں اپنے اندر انڈیل لی-

''کمال ہے صاحب! آپ نے ٹھنڈی کافی ہی پی لی-'' رضوی صاحب مسکرائے-

''کوئی بات نہیں جی' اس میں آپ کے خلوص کی حدت جو شامل تھی-'' میں نے رسمی سا جملہ کہنا چاہا مگر الفاظ میرے حلق سے نکل نہ پائے تھے کہ عزیز احمد کمرے میں داخل ہوا-

''اب یوں لگتا ہے کہ تمہارا خون دوبارہ سے سرخ ہونے لگا ہے-'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے

ہوئے کہا- ''چلو چائے پیتے ہیں-'' اس نے مجھے فوراً ہی وہاں سے اٹھا دیا اور رضوی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوا مجھے لیے باہر نکل آیا-

بی بی سی کینٹین پر وہ مجھے کئی ایک شناسا چہروں کی جانب لے گیا ''یہ فلاں شاعر صاحب ہیں' یہ فلاں ادیب-'' وہ مجھے بتا رہا تھا ''تمہیں یاد ہو گا' فرصت کے وہ قیمتی لمحات جب ہم پاک ٹی ہاؤس میں گزارنے کی سعادت حاصل کرتے تھے تو ان سے کتنی لمبی بحثیں چلتی تھیں' اب یہ یہاں ہی ہوا کرتے ہیں پارٹ ٹائمر کی حیثیت میں اور یہ وہ شاعر ہیں' وہ ادیب ہیں' وہ آرٹسٹ ہیں جو ہماری ہی طرح کے تھے'' اس نے کچھ اور لوگوں کی طرف اشارا کیا ''ان کے ساتھ ہم نے شامیں اور سنگتیں منائی تھیں-''

ماضی کی وہ خوشگوار یادیں اچانک میرے ذہن کی اسکرین پر اتر آئیں'' ہاں یہ وہی جانے پہچانے لوگ تھے-'' میں ان سے مصروف گفتگو ہوا- لیکن جلدی ہی مجھے محسوس ہونے لگا کہ گزرتا وقت سب ہی پر اپنے اثرات چھوڑ چکا تھا- ان کی گفتگو' ان کی دلچسپیاں اور خیالات بدل چکے تھے اور اب یہ جانے پہچانے چہرے درحقیقت اجنبی سے لگنے لگے تھے- میں جلدی ہی اکتا سا گیا-

''عزیز احمد میں تم سے ملنے آیا تھا-''

میں نے زور و شور سے مصروف گفتگو عزیز سے بار بار کہا- ''ابھی یار ابھی-'' وہ مجھے تسلی دیتا اور اپنی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ سے جوڑ لیتا-

میں نے یونہی اکتائے ہوئے ذہن کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا اور پھر چونک گیا وہ ایک کونے میں بیٹھی کسی نکتے پر غالباً تقریر کر رہی تھی- کم از کم انداز تو ایسا ہی تھا- ویک اینڈ پر جو ڈھیروں کام اسے نبٹانا تھے' یقیناً اس وقت وہ انہیں بھلا چکی تھی-

''یا خدا! کیا واقعی یہ حقیقت ہے؟'' میں نے مسلسل اس کو دیکھتے ہوئے نجانے کتنی بار یہ سوچا- اگر وہ حقیقت تھی تو میرے ذہن کو اسے دیکھنے کے بعد کیا سوچنا چاہیے-

''وہ جس کو کبھی میرے دل نے ثبوت حق کہا تھا اور پھر ایک وقت ایسا آیا تھا کہ اسے میں نے سراب مسلسل قرار دیا تھا- آج وہ بصورت سراب میری نئی آزمائش کے طور پر میری سامنے موجود تھی- اس کی شخصیت پر بھی گزرتے وقت نے بہت سے اثرات چھوڑے تھے- لیکن بلاشبہ وہ اس کا وہ وقار اور اس کی شخصیت کا وہ پرانا تاثر اب بھی اس کے شکوہ رفتہ کی ایک جھلک دکھا رہا تھا- اس کے چہرے پر بڑھتی عمر کا اثر ضرور تھا مگر اس کی سادگی اور اسرار کا تاثر اب بھی قائم تھا- اس کی آنکھوں میں ویسی ہی گہری سوچ اور افسردگی کی جھلک تھی- اس کے لمبے بال اب تراشیدہ شکل میں شانوں پر پڑے تھے مگر ان کی خوب صورتی اور چمک اب بھی قائم تھی- وہ عمر اور تجربے میں ضرور آگے بڑھی تھی' مگر اس کی شخصیت کا تاثر بھی عہد رفتہ سے جدا نہ ہو پایا تھا-

ہر بار ہی ایسا ہوتا تھا زندگی جب کچھ عرصہ ایک روٹین پر چلنے کی عادی ہوجاتی میں اس سراب مسلسل کا شکار ہوجاتا تھا اور اب کے تو خاصا عرصہ ہوگیا تھا تیرہ سال یا پھر شائد چودہ سال غالباً پندرہ سال' لیکن میرے خیال سے سالوں' دنوں' مہینوں کا اعداد و شمار بیکار تھا' وقت کے ہر حصے میں یہ سراب مسلسل میرے لاشعور میں موجود رہا تھا- جب ہی تو آج اس پر نظر پڑتے ہی میں پھر- خود کو پانے اور پھر کھوئے جانے کی اس کیفیت میں محسوس کر رہا تھا جو میری گزشتہ زندگی کا ایک حصہ تھی-

اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ ایک عرصہ کے بعد مجھے یہاں دوبارہ نظر آ جائے گی تو شاید میں کبھی ادھر نہ آتا- عزیز احمد سے ملنے کے لیے سیدھا اس کے گھر چلا جاتا- مگر میری قسمت میں غالباً ازل سے آب اور سراب کا یہ کھیل لکھ دیا گیا تھا' میں اس سے نجات کیسے حاصل کر سکتا تھا-

''چلو یار! چلیں-'' عزیز احمد نے اچانک ہاتھ مار کر مجھے میری سوچ سے چونکا دیا- میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا-

''کیسا لگا تمہیں پرانے لوگوں سے مل کر-'' ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف آتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا-

''پرانے لوگ-'' میں تلخی سے ہنسا- ''یہ یکسر نئے لوگ تھے کم از کم میرے لیے اور میں ان کے پاس بیٹھا خود کو خاصا بے جگہ محسوس کر رہا تھا-''

''اور اسی لیے میں نے زبردستی تمہیں اتنی دیر وہاں بٹھائے رکھا تاکہ تم جان سکو کہ تبدیلی کیا چیز ہوتی ہے- محض لفظ سے واقفیت کوئی بات نہیں ہوا کرتی حقیقت میں اس کیفیت کو خود پر محسوس کرنا اصل بات ہوتی ہے-'' عزیز احمد ہمیشہ سے بالتفصیل لیکن مبہم باتیں کرنے کا عادی تھا-

''یہ بھی کچھ ضروری نہیں کہ انسان ہر کیفیت کو خود پر ضرور ہی محسوس کرے-'' میں نے بے دھیانی میں کہا-

''تم اتنے سالوں میں ذرا بھی نہیں بدلے- اب تک ویسے کے ویسے ہی ہو Excapeist (فراریت پسند)-'' عزیز احمد نے اپنا من پسند طنزیہ فقرہ میری طرف اچھالا-

''نہیں' میں فراریت پسند نہیں ہوں-'' میں نے کہنا چاہا- ''لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مجھے تلخ حقائق کبھی بھی پسند نہیں رہے یہ اور بات ہے کہ تلخ حقائق اپنی تمام تر تلخ اور کاٹ کے ساتھ میرے سامنے آتے رہے ہیں کہ میں خود کو فراریت پسند کا دیا گیا یہ ٹائٹل بھی کبھی منصفانہ قرار نہ دے سکا اور اگر میں فراریت پسند ہوتا تو کیا اس ایک سوچ سے چھٹکارا پانے میں کامیاب نہ ہو چکا ہوتا جو اس وقت سے مسلسل میرے ذہن پر چھائی ہوئی ہے جب سے میں نے اس کو وہاں دیکھا ہے-'' میں خود سے گفتگو کرتے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا-

''میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے ملنے آئے تھے' خود اپنے آپ سے نہیں-'' ...... پکاڈلی کے زیر زمین

ٹیوب اسٹیشن پر پہنچ کر عزیز نے کہا-

''تم سے ملنے کے لیے تمہارے گھر چلتے ہیں-'' میں نے دوستانہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی-

عزیز احمد کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس کے بیوی بچوں کے درمیان بیٹھے ہوئے میں کچھ دیر کے لیے بھول گیا کہ آج مجھ پر برسوں پرانی کیفیت طاری ہے- بہت دن کے بعد خالص گھریلو بلکہ خالص پاکستانی گھریلو ماحول میسر آیا تھا اور میں واقعی اس ماحول کو ترس گیا تھا-

عزیز نے اس چھوٹے سے گھر کو پاکستانی ثقافت کا نمونہ بنا رکھا تھا- سندھ کے مشہور پیڑھے جن پر اجرک چڑھے کشن دھرے تھے' بلوچی کڑھائی کی بیڈ شیٹس' پنجاب کے روایتی مونڈھے اور سرحد کے مشہور ظروف' اتنا شناسا سا ماحول غریب الوطنی میں ایک نعمت سے کم نہیں یہ میں نے اب جانا تھا-

رات کے کھانے کے بعد عزیز اور میں دیر تک اکیلے بیٹھے باتیں کرتے رہے- ہم پرانی باتیں دہرا رہے تھے' پرانی یادیں' اور پرانے قصے-

''اور جب تم وہاں ہوتے تھے بک ہاؤس میں-'' کسی بات کا حوالہ دینے کے لیے عزیز نے کہا تو میں ایک دفعہ پھر چونک گیا-

''بک ہاؤس میں-'' میں نے زیر لب دہرایا- ''ہاں وہی تو ایک نقطہ آغاز تھا اس سراب مسلسل کے تعاقب کا-'' مجھے یاد آ گیا-

''عزیز! آج جن چہروں سے تم نے مجھے ملوایا- وہ سارے کے سارے نہ جانے کیوں مجھے اجنبی محسوس ہوئے-'' میں نے اچانک کہا-

''میں نے بتایا تھا نا کہ تبدیلی-'' اس نے فلسفہ جھاڑنے کا آغاز کرنا چاہا-

''مگر ایک جگہ مجھے یہ تبدیلی محسوس نہیں ہوئی-'' میں نے اس کی بات کاٹ دی-

''ہاں' میں واقعی اب تک ویسے کا ویسا ہی ہوں- کم از کم تمہارے لیے-'' وہ مسکرایا-

''میں تمہاری بات نہیں کر رہا-'' میں اس کی غلط فہمی پر بے اختیار ہنس پڑا-

''پھر کس کی کر رہے ہو؟''

''یار! ایک مدت کے بعد مجھے آج وہ سراب دوبارہ نظر آ گیا' جس سے فرار حاصل کرنے کے لیے میں نے لاکھ جتن کیے تھے-''

''Excapeism-'' اس نے زیر لب وہی لفظ دہرایا-

''سراب وغیرہ کچھ نہیں ہوا کرتے' ایک چیز ہوتی ہے جس کے ناقابل حصول نظر آنے پر ہم اپنی شکست کا اعتراف کرنے کے بجائے اسے ناقابل حصول قرار دے دیتے ہیں' اگر ہر چیز کو حقیقت جان کر اس کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس سراب وغیرہ کے الوژن سے با آسانی نکل سکتے ہیں-'' وہ پھر ادق گفتگو کرنے لگا-

''عزیز! میں نے اس کو غیر حقیقی کبھی نہیں سمجھا' مگر اس کے بار بار ملنے اور پھر قریب جانے کی خواہش کرنے پر غائب ہو جانے پر ہی میں نے اس کو سراب خیال کیا تھا۔''

''تم قریب جانے کی خواہش چھوڑ دیتے' سراب خود بخود حقیقت بن جاتا۔'' وہ یوں مسکرایا جیسے میرا انداق اڑا رہا ہو۔'' خیر' یہ تو بتاؤ کہ وہ سراب ہے کون جو آج تمہیں ایک بار پھر نظر آ گیا؟''

''وہ سراب مسلسل جس کو میں نے ثبوت حق کہا تھا' آج اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی اپنے شکوہ رفتہ کے آثار لیے وہاں موجود تھی۔'' میں جانتا تھا کہ اس مبہم سے جواب کے باوجود کم از کم عزیز احمد میری بات سمجھ چکا ہوگا۔

''عائشہ نیازی۔'' عزیز کی آگے پیچھے جھولتی ایزی چیئر ایک جگہ معلق ہو گئی۔'' عائشہ نیازی'' اس نے اپنی پیشانی پر انگلیاں پھیریں۔

''عائشہ نیازی!'' اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بغیر میرے بتائے ہی سمجھ جائے گا۔

''لیکن وہ یہاں کہاں؟'' اس کی بات پر میں چونک گیا۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ عائشہ نیازی یہاں موجود ہو اور عزیز احمد کو اس کے بارے میں علم نہ ہو۔

''ہاں' آج میں نے اس کو وہاں دیکھا تھا۔ پہلے وہ تمہارے رضوی صاحب کے کمرے میں آئی اور پھر وہ کینٹین میں بھی تھی۔''

''عائشہ نیازی!'' وہ ایک بار پھر زیر لب دہراتا مراقبے میں چلا گیا۔

''غالباً بچوں کے پروگرام کے لیے گیت ریکارڈ کروانے آئی تھی مگر یار! یہ تو ہمیں اس سے پہلے علم نہیں تھا کہ وہ خوش گلو بھی ہے۔ گویا آرٹسٹ بھی ہے ایک صنف میں۔'' میں بولتا گیا۔

''بچوں کا پروگرام نغمہ۔'' عزیز اپنے مراقبے میں سے نکل آیا'' اور عائشہ نیازی'' اس نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد میں نے دیکھا اس کے چہرے سے الجھن کے آثار ختم ہو گئے تھے اور وہ پرسکون نظر آنے لگا تھا۔

''ہاں عائشہ نیازی۔ وہ تمہارا سراب مسلسل۔ وہ تمہارے بقول ایک ثبوت حق۔'' اس نے کہا ''مگر یار مرتضیٰ حسین! وہ اب عائشہ نیازی نہیں آشا چاٹگام والا ہے' غالباً اسی وجہ سے میں بھی پہچان نہ پایا تھا۔''

''آشا چاٹگام والا'' ایک یکسر نیا نام جس سے میرے کان قطعی آشنا نہیں تھے۔ میں چونک گیا۔ ہاں وہ واقعی سراب تھی۔ عزیز نے یکا یک موضوع گفتگو بدل دیا کچھ دیر مزید ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے اٹھ گیا۔

''بات یہ ہے مجتبیٰ!'' جاتے جاتے اس نے پلٹ کر کہا۔'' میں اپنے بارے میں یہ دعوا بڑے فخر

سے کیا کرتا ہوں کہ میں اپنا بیان کبھی نہیں بدلتا۔ مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنا بیان بدلنا پڑتا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ سراب وغیرہ کچھ نہیں ہوتا' یہ ہماری سوچ ہے سوچنے کا انداز ہے جو حقیقت کو سراب میں بدل ڈالتا ہے اور یہ کہ تم قریب جانے کی خواہش ترک کر دو تو سراب خود بخود حقیقت میں بدل جائے گا مگر اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بعض مرتبہ حقیقت کو وہم سمجھ لینا ہی ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے جس کو اب تک سراب سمجھتے آئے ہو اس کو سراب ہی سمجھتے رہو۔ تبدیلی کی کیفیت کو خود پر طاری کر کے محسوس کرو۔ وہ عائشہ نیازی تھی لیکن اب وہ آشا چاٹگام والا ہے اور یار اب وہ...... خیر چھوڑو۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا'' بہر حال'' اس نے کندھے اچکائے'' شب بخیر'' لائٹ بجھا کر باہر جاتے ہوئے بھی اس نے ایک بار عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

''عائشہ نیازی؟ آشا چاٹگام والا!'' عزیز احمد تبدیلی کی اس قیامت خیز کیفیت کو بیان کر کے خود تو سونے کے لیے جا چکا تھا۔ مگر میرے لیے وہ یقیناً ایک بے خواب شب چھوڑ گیا تھا۔ تبدیلی کی اس کیفیت کو خود پر طاری کر کے محسوس کرنے کے لیے میرے لیے لازم تھا کہ میں ان دنوں' مہینوں اور سالوں کا تجزیہ کروں جو گزر چکے ہیں۔ عائشہ نیازی کو اس طرح یاد کروں جس طرح میں نے اس کو دیکھا تھا' اس سے ملا تھا اور اس سے گفتگو کی تھی اور پھر اس نکتے پر پہنچوں جہاں میں اس تبدیلی سے ٹکرایا تھا جسے آشا چاٹگام والا کہتے تھے میں نے آنکھیں بند کر کے ذہن کے ڈبے میں بند سلائیڈز جوڑنے کی کوشش کی اور جلد ہی میں آج سے بیس برس قبل کے زمانے میں موجود تھا۔

ثبوت حق
(اک سراب مسلسل)

بیس برس قبل میں نے ایم اے...... فائنل کا امتحان دیا تھا اور اس کے بعد میں نہ صرف ذہنی وجسمانی طور پر بلکہ معاشی طور پر بھی بیکار تھا۔ گو پڑھائی کے دوران بھائی جان نے میری ہر ممکن مدد کی تھی' مگر اس عرصے میں بھی مجھے کئی کئی ٹیوشنز بھی پڑھانا پڑتی تھیں اور امتحان کے بعد تو ظاہر ہے کہ کوئی وجہ نہیں تھی جو بھائی جان اپنا دست شفقت میرے سر پر دھرے رکھتے۔ مگر امتحان ختم ہو جانے کا مطلب یہ بھی ہرگز نہیں تھا کہ میں اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا۔ لیکن میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی ظاہر ہے کہ بھائی کو کچھ اتنی پروا نہیں تھی' سو اس معاشی بیکاری کے دور میں' میں نے کئی بار یہ سوچا کہ ٹیوشنز کے بجائے کوئی ایک اور مستقل ذریعہ ہونا ضروری ہے۔ مجھ پر بھابھی کے مسلسل بدلتے ہوئے تیوروں اور بدمزاجی کا بوجھ بھی دن بدن بڑھ رہا تھا۔ بھابھی کی بدمزاجی پر میں ان کو موردالزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک بھائی جان کی تنخواہ ان کے گھر کی ضروریات اور ان کے بچوں کی تعلیم اور ضروریات' ان کی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کافی نہیں تھی' اور اوپر سے میں بھی ایک لمبے عرصے سے ان پر ایک اضافی خرچ کی صورت میں

پڑا ہوا تھا- ویسے تو اس میں میرا بھی کچھ اتنا قصور نہیں تھا- ابا جی اور اماں کی وفات کے بعد میں خود بخود بھائی جان کی ذمہ داری بن گیا تھا- لیکن بھابھی کی اپنی سوچ تھی جو بہت سارے سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں بدلی تھی- اس کے علاوہ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مجھے مستقبل کی کوئی پروا نہیں' ان کے نزدیک میں ایک لاپروا' بے فکر اور فضول خرچ قسم کا لڑکا تھا اور بے کار کی دوستیوں میں وقت ضائع کرتا تھا-

بھابھی کی اس سوچ نے ایم اے فائنل کے امتحان کے بعد مجھے چھوٹی موٹی نوکری تلاش میں بہت خوار کیا تھا- مگر میری تعلیم ادھوری تھی اور تجربہ صفر' ظاہر ہے کہ نوکری خواہ چھوٹی موٹی ہی سہی یونہی تو نہیں مل جایا کرتی ایسے میں ہمیشہ کی طرح عزیز احمد ایک غیبی فرشتے کی صورت میری مدد کو آیا-

''پرسوں چچا رفیق نے مجھ سے پوچھا کہ میں بک سیلنگ (کتب فروشی) کر سکتا ہوں یا نہیں؟''

اس نے مجھے آواز دے کر گھر سے باہر بلانے کے بعد دروازے پر کھڑے کھڑے ہی بتایا (بھابھی کو عزیز کا میرے پاس آنا سب سے زیادہ برا لگتا تھا-)

''کیوں یہ کیوں پوچھا انہوں نے؟'' میں نے حیرت سے کہا-

''یار! فلاں نہیں ہیں بک سیلرز-'' اس نے مال کی قدیم اور مشہور دکان کا نام لیا- ''وہاں کچھ لوگ جاننے والے ہیں چچا رفیق کے انہیں پتا چلا کہ ان لوگوں کو اپنے اردو سیکشن کے لیے بندہ چاہیے' بس یہی بل کاٹنا' فہرستیں بنانا کتابوں کا حساب کتاب رکھنا وغیرہ وغیرہ-''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' میں نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا-

''میں نے کہا' مجھے تو کچھ ایسا شوق ہے نہ تجربہ' ہاں مجتبیٰ سے پوچھتے ہیں اس کو کتابیں پڑھنے اور چرانے کا بہت شوق ہے-'' اس نے مذاق سے کہا (ان دنوں ہم لائبریریوں سے کتابیں اٹھا لینے کا کام بھی کیا کرتے تھے' کیونکہ ہماری جیبیں انہیں خریدنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں-)

''مگر یہ تم نے کیوں کہا' تم تو خود کتابی کیڑے ہو' ہر دم ان میں غرق اور لائبریریوں اور بک اسٹالز پر خود کو خاصا ایٹ ہوم محسوس کیا کرتے ہو-'' میں نے چونکتے ہوئے کہا-

''چھوڑو یار! تمہیں پتا ہے میری غیر مستقل مزاجی' نہ ہی مجھ سے بار بار بل کاٹے جائیں گے نہ ہی خوش اخلاقی دکھائی جائے گی' بہت سارے کاموں میں گڑبڑ کر دینے کے بعد میں جلد ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ لوں گا وہاں سے' بہتر یہی ہے کہ شروع ہی تم کرو یہ کام تم بڑے آرام سے ایڈجسٹ کر لو گے وہاں' پیسے بھی معقول مل جایا کریں گے' اس روز روز کی بک بک سے تو چھٹ جاؤ گے-'' آخر میں اس نے سنہری جملے بولے-

میں جانتا تھا کہ عزیز احمد کی اپنی حالت مجھ سے چنداں مختلف نہیں ہے- بلکہ وہ تو جوائنٹ فیملی سسٹم کا مارا ہوا تھا- اس کے گھر میں اپنے بہن بھائیوں' چچاؤں' پھوپھیوں' ان کی اولادوں اور نجانے کس

کس کی بھرمار تھی- اس کے ابا ہمیشہ سے اس کے پڑھنے کے خلاف تھے اور بے حد و حساب کنجوس تھے وہ ہر وقت اس کو کسی کام پر لگ جانے کی نصیحت کیا کرتے تھے اور اس کی جیب اکثر و بیشتر کسی بھی قسم کی رقم کے بوجھ سے آزاد رہا کرتی تھی- اس کے اکثر کام ادھار پر چلتے تھے- مجھ سے زیادہ اس کو اس نوکری کی ضرورت تھی- مگر کبھی کبھی اپنی ضرورتوں اور پریشانیوں کا عفریت ہمیں کچھ اس طرح سے پیش نظر رکھنا پڑتا ہے کہ دوسروں کے مصائب سے ہم جانتے بوجھتے ہوئے آنکھیں چرا لیتے ہیں' میں بھی عزیز احمد سے ڈنڈی مار گیا- میں نے دوبارہ اس سے اصرار نہیں کیا کہ وہ یہ نوکری خود کر لے- میں نے اس کے خلوص' محبت اور قربانی کی داد بھی صرف اپنے دل ہی میں دی اس کے سامنے بیان کرنے سے گھبراتا رہا مبادا یہ سنہری موقع میرے کسی جذبات کی نذر نہ ہو جائے اور یوں خاموشی سے اس کے چچا رفیق کے ساتھ اس عظیم الشان دوکان میں داخل ہو گیا جہاں اس سے پہلے ہم خالی خولی کتابیں دیکھنے اور ان کی فلیپ پڑھنے میں گھنٹے لگا دیا کرتے تھے-

اس نوکری کا زمانہ میری زندگی کا سنہری زمانہ تھا- میرے چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں- دائیں بائیں' آگے پیچھے کتابوں کے انبار کے درمیان مجھے بڑا ہی مزا آتا تھا- بل کاٹنا' فہرست بنانا' ترتیب دلوانا' کتابیں سمٹوانا مجھے کوئی بھی کام مشکل نہیں لگتا تھا- ایک اضافی مزا جو ہر دوسری بات پر حاوی تھا وہ یہ تھا کہ میں ذرا سی فرصت ملنے پر اپنے آگے دھری کتابوں کے مطالعے میں باآسانی غرق ہو جاتا' اس زمانے میں' میں نے سارا پرانا اور نیا آنے والا ادب پڑھ ڈالا تھا اور اس سہولت کا حصول کسی بھی اور شعبے میں ناممکن تھا- دوپہر میں دو گھنٹے کے لیے میں فری ہوتا اور یہ دو گھنٹے شروع ہونے سے پہلے ہی عزیز میرے پاس آ جاتا- پھر ہم مال کے مشہور و معروف حلیم نان کھاتے' یا ریگل کے دہی بڑے' جیب ذرا بھاری ہوتی تو لارڈز یا شیزان کا چکر لگا لیتے اکثر و بیشتر پاک ٹی ہاؤس میں گھس جاتے- شام کو جب میں فرغ ہو جاتا تو پاک ٹی ہاؤس کا ایک اور چکر لگاتا اور پاک ٹی ہاؤس کی رونق اس وقت عروج پر ہوا کرتی تھی- ان ہی دنوں میں میری شناسائی ان تمام لوگوں سے ہوئی جو آج بی بی سی کینٹین میں مجھے قطعی اجنبی دکھائی دیے تھے-

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب میں نے پہلی بار اپنے اردگرد کے ماحول کا بغور مشاہدہ شروع کیا کتابیں خریدنے والوں کا ایک ہجوم سا اردگرد رہتا- میں جب خود فارغ ہوتا تو دیکھتا رہتا' کون کیسا ہے' کیا خریدنے آیا ہے' کون واقعی خریدنے آیا ہے اور کون صرف دیکھنے آیا ہے' کسے واقعی کتاب سے عشق ہے اور کون محض خود کو باذوق کہلوانا چاہتا ہے- بہت جلد میرے لیے لوگوں کے چہروں اور حرکات و سکنات کے ذرا سے مشاہدے کے بعد ان کی مالی حالت اور ان کی مختلف عادات کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہ رہا بلکہ مجھے اس کام میں بھی مزا آنے لگا- وہاں آنے والوں میں کئی لوگ ایسے بھی تھے جو اکثر بلکہ باقاعدہ آیا کرتے تھے- کئی ہفت روزہ' ماہانہ' سہ ماہی

رسالوں کی خریداری کے لیے' کئی اپنی ضرورت کے لیے ہر نئی آنے والی کتاب کے لیے اور کئی ہماری طرح محض فلیپ پڑھنے کے لیے آتے تھے اور ان ہی باقاعدہ آنے والوں میں وہ بھی تھی جس کی پہلی مرتبہ آمد پر ہی میں چونک گیا تھا- اس وقت میرے سیکشن میں بہت کم لوگ تھے اور مجھے فی الوقت کوئی بل بھی نہیں بنانا تھا- میں غیر ارادی طور پر اپنے قریب رکھے بک شیلف کے ارد گرد کھڑے کتابیں دیکھتے لوگوں کا مشاہدہ کر رہا تھا- اسی وقت لڑکیوں کا ایک غول اندر آ گیا-

''یقیناً کالج سے فارغ ہوتے ہی ادھر آ گئی ہیں-'' میں نے دل میں حسب معمول اندازہ لگایا- غول اندر آتے ہی ادھر ادھر بکھر گیا- کوئی اسٹیشنری والے حصے میں چلی گئی' کوئی انگلش رومانس کے تازہ اسٹاک کی جانب اور کوئی گریٹنگ کارڈز کی طرف' ایک دو میرے سیکشن کی جانب آ گئیں- مختلف شیلفوں کی ایک ایک کتاب اٹھا کر غور سے دیکھتے رہنے کے بعد ان میں سے ایک میری طرف آئی-

''دیکھیں' یہ کتابیں کہاں رکھی ہیں؟'' اس نے کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا- آواز بے حد دھیمی تھی-

کاغذ پر لکھے تمام ناموں سے میں ناآشنا تھا-

گودڑ کا لعل' حرماں نصیب' منٹو کے بہترین افسانے-''

''جی یہ کتابیں تو ہمارے ہاں نہیں ہیں-'' میں نے آہستگی سے جواب دیا-

''پھر کہاں ملیں گی؟'' اسی دھیمی آواز میں پوچھا گیا-

''اردو بازار کے کسی فٹ پاتھ پر غالباً اگر ان کا کوئی وجود اس دنیا میں باقی رہ گیا ہے تو-'' میں نے اندازاً کہا-

''وہاں-'' وہ بے ساختہ بولی ''وہاں تو میں پتا کر چکی ہوں-...... کاغذ میرے ہاتھ سے واپس لیتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑائی اور اپنی سہیلیوں کی جانب مڑ گئی- اس دور میں اس طرح کی لڑکیوں جیسا کہ وہ گروپ تھا' میں ادب پڑھنے کا خصوصاً اچھا اور مستند اردو ادب پڑھنے کا ذوق بہت کم پایا جاتا تھا یہ میرے اتنے عرصے کی کتب فروشی کا تجربہ تھا- اسی لیے اتنا گاڑھا ادب مانگنے والی نوعمر لڑکی نے مجھے یکدم چونکا دیا-

''کیا پس منظر ہوسکتا ہے ان خاتون کا-'' میں نے حسب عادت اندازہ لگانے کی کوشش کی اور سر اٹھا کر بغور اس کی جانب دیکھا' اب وہ درمیانی ٹیبل پر بکھرے تازہ رسالوں کا معائنہ کر رہی تھی- اس کا قد عام لڑکیوں سے لمبا تھا' رنگت سرخ وسفید' نین نقش تیکھے اور آنکھیں چہرے کے مقابلے میں خاصی بڑی مگر عجیب نہیں لگ رہی تھیں- اس کی پشت پر لٹکتی سیدھے بالوں کی دراز چٹیا نے مجھے بے اختیار ''واہ'' کہنے پر مجبور کر دیا- اس کی ناک میں چمکتی کیل' کلائیوں میں پڑی سو

نے کی چار چوڑیاں' اور گلے میں پڑے اللہ کے پاک نام سے مزین سونے کی زنجیر اس کی مالی حیثیت خود بتا رہی تھی- ''پھر وہ اور یہ ادب'' میں نے ذرا سا جز بز ہوتے ہوئے سوچا اور پھر میری نظر اس گروپ کی دیگر لڑکیوں پر پڑی-

''ارے ہاں-'' پھر جیسے میں سمجھ گیا- اس گروپ کی باقی لڑکیاں اس وقت کے ہائی فیشن کا منہ بولتا نمونہ تھیں- بغیر آستین یا چھوٹی آستین کی فٹنگ والی قمیصوں' چنے ہوئے نائیلون گلاس کے ڈوپٹوں میں ملبوس' کچھ کے بال بے ڈھنگے طریقے پر کٹے ہوئے' کچھ نے بالوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے مصنوعی جوڑے اٹکا کر چہرے کے دائیں بائیں مصنوعی کرلز لٹکائے ہوئے تھے اور نچلی ہیل کے پلیٹ فارم شوز' لکڑی کی ہیلوں والے بے ڈھب موٹے موٹے جوتے پہنے ہوئے ان میں سے ہر ایک خود کو حسینہ عالم سمجھ رہی تھی مگر بظاہر لاپروا بے نیاز نظر آنے کی کوشش فرما رہی تھی- ایسے چہرے اس بک شاپ کی روٹین تھے روزانہ ایسا مجمع وہاں لگا ہی رہتا تھا- مگر وہ لڑکی ہر بات میں ان سے مختلف تھی- اس نے موٹی کاٹن کی پلین شلوار اور چھوٹے پھولوں کی براؤن نسبتاً ڈھیلی قمیص پہن رکھی تھی مجھے اس کا لباس آج تک یاد ہے- پاؤں میں بند جوتے اور شانوں کے گرد اون کی ہلکی شال لپیٹ رکھی تھی- بالوں کی دراز چوٹی اسے سب سے مزید منفرد بنا رہی تھی- اس کے اطوار باقی سب سے مختلف تھے- وہ سب ہاؤ ہو کے ساتھ انگریزی میں گٹ پٹ کر رہی تھیں- جبکہ وہ سنجیدگی اور متانت سے اپنی ساتھی لڑکیوں سے مخاطب ہوئی تھی-

''کسی اونچے مگر سلجھے ہوئے گھر کی سلجھی ہوئی لڑکی' جسے ادب کا شوق ورثے میں ملا ہے' اس کے دادا یا نانا کی کوئی بڑی سی لائبریری ہوگی یقیناً اور اس میں سے یہ چند کتابیں مس ہوگئی ہوں گی جنہیں یہ تلاش کرتی پھر رہی ہے-'' میں نے اپنے معائنے کے اختتام پر فیصلہ داغا-

''واٹ اے چینج-'' پھر میں دل ہی دل میں خوش ہوا- میری آنکھیں یقیناً ایک نئے پن کے احساس سے دوچار ہوئی تھیں- میں نے ایک بار پھر اسے ایک نظر دیکھا اور دل ہی دل میں اس تبدیلی کے نظارے کے لیے اس کا مشکور ہوا اس کے بعد گاہکوں کا ایک ہجوم امڈ آیا اور اس سے نمٹنے کے دوران وہ دکان سے چلی گئی-

اس شام میں ایک عرصے کے بعد بلا وجہ خوش ہوتا رہا- عزیز احمد کو لے کر شیزان چلا گیا- شیزان کی مہک اٹھتی چائے اور تازہ پیٹریوں سے انصاف کرتے ہوئے میں بات بے بات ہنستا رہا-

''کیا بات ہے یار؟'' عزیز احمد نے اس عرصے دسویں مرتبہ پوچھا- ''کیا تنخواہ میں اضافہ ہوگیا ہے؟''

''ہر خوشی اور دکھ کے پیچھے کسی فنانشل معاملہ کا ہونا ضروری تو نہیں-'' میں نے مسکرا کر کہا-

''پھر؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا-

''پھر یہ کہ عزیز احمد صاحب! آج میں ایک نئے پن کے احساس سے دوچار ہوا ہوں' ایک جیسی

روٹین میں اچانک تبدیلی اور یہ اچانک پن تو ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔''
''کیا نیا؟ کتاب، پھول، خوشبو، یا پھر۔'' عزیز احمد نے میری توجہ کا مرکز بن جانے والی ہر ممکنہ چیز کا نام لیا۔
''نہ کتاب نہ پھول نہ ہی خوشبو بس یا پھر۔''
''یعنی ایک نیا چہرہ۔'' اس نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
''بغیر تمہارے بتائے میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ چہرہ کس صنف سے تعلق رکھنے والی ہستی کا ہوگا، مگر یار! یہ نیا پن وغیرہ بے کار کی باتیں ہیں۔ چیزیں، انسان چہرے سب ایک سے ہوتے ہیں یہ تو ہم ہیں جو انہیں ایک خاص Perspective (تناظر) جج کرتے ہیں۔'' ادھر بات میرے منہ سے نکلی ادھر عزیز احمد کا فلسفہ شروع ہوگیا۔
''چلو ایک خاص Perspective میں سہی مگر بات یہ ہے کہ واقعی مجھے آج بڑے دنوں بعد اپنی روٹین میں ذرا سا فرق محسوس ہوا ہے۔ عزیز یار! میں چہروں اور انسانوں کی کرید لگانے کا ماہر ہونے لگا ہوں اور آج صبح نو بجے تک میں تمہاری اس بات سے سو فیصدی متفق تھا کہ سب چہرے ایک سے ہوتے ہیں سب انسان بھی ایک سے ہوتے ہیں۔ میری نظروں کے سامنے سے روزانہ ایک سے چہرے اور انسان گزرتے ہیں، عصری روٹین سے میل کھاتے چہرے اور انسان، سادگی اور معصومیت سے ناآشنا لوگ، مگر آج صبح نو بجے کے بعد میرا نظریہ بدل گیا ہے۔ چہروں کے اس ایک سے ہجوم میں ایک نیا چہرہ مجھے آج نظر آیا۔ جو خود آگاہ نہیں تھا، جسے زمانے کی ہوا چھو کر بھی نہیں گزری تھی، جو ایک ازلی معصومیت کا پرتو تھا، جو سادگی کا مرقع تھا اور۔'' میں کہہ رہا تھا۔ عزیز احمد نے میری بات کاٹی۔
''بس بس۔'' اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بڑے عامیانہ انداز میں تعریف کر رہے ہو۔ اس چہرے کی، کچھ احساسات انسان کو اپنے تک بھی محدود رکھنے چاہئیں۔'' اس کی یہ بات سن کر میں یک دم خاموش اور سنجیدہ ہوگیا۔
''ہاں یہ البتہ ایک اچھی بات ہے۔'' خاموشی کو بھانپتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنا چشمہ درست کیا ''کہ تم کو کچھ دیکھ کر نئے پن کا احساس ہوا اس سے پتا چلتا ہے کہ حادثات زمانہ نے تمہارے اندر کے انسان کا ابھی تک کچھ نہیں بگاڑا۔''
''تمہیں معلوم ہے کہ حادثات میرا ابھی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے، میری قوت برداشت بے حد مضبوط ہے۔'' میں نے اسی خفگی سے کہا۔
''ہاں، ہاں!'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا ''مجتبیٰ! یہ محض اتفاق ہے۔'' پھر وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ''ایک چیز تم کو نظر آئی۔ تم خوش ہوگئے اس خوشی کی وجہ سے ہمیں شیزان کی چائے اور

پیسٹریاں کھانے کو ملیں، خوشی کے ذرہ بھر احساس کو بھی یوں ہی منانا چاہیے کیونکہ یہ احساس بڑا قیمتی اور نایاب ہوتا ہے یہاں سے جانے کے بعد وقت گزر جائے گا۔ آج کا دن ختم ہو جائے گا اور پھر شاید یہ احساس بھی ختم ہو جائے، اس لیے بہتر ہوگا کہ تم ابھی سے دل میں سوچ لو کہ یہ سب وقتی ہے۔ نئے پن کا احساس اور اس کی خوشی بھی، اب وہ چہرہ اس اژدھام دنیا میں گم ہو جائے گا۔ کون جانے تمہیں پھر نظر بھی آئے گا یا نہیں اس کی تلاش کا خناس دل میں بٹھا نہ لینا، یہ کچی عمر کی جذباتیت کے مترادف ہوگا۔''
وہ کہہ رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ مگر میں اس کو کیا بتاتا کہ اس چہرے کی تلاش اور اس کی جستجو کا خناس تو اسی وقت میرے ذہن میں سما گیا تھا جب میں دکان سے باہر نکلا تھا۔ آج دکان سے باہر کی دنیا میں بھی میں نے ہر چہرے کو کھوجا اور دیکھا تھا۔ یہ ایک لاشعوری کیفیت تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ کب تک مجھ پر حاوی رہنے والی تھی۔
اس روز گھر واپسی پر بھی میں طمانیت کے احساس سے سرشار تھا۔ بھابھی نے اتنی دیر سے آنے کا برا مانتے ہوئے بھی کھانا میرے سامنے لا رکھا۔ جب سے میں نے وہ نوکری شروع کی تھی۔ مجھے کم از کم کھانا گرم ملنے لگا تھا۔ مگر اس روز میں نے اشتہاء کے باوجود بھی کچھ نہ کھایا۔ کھانا باورچی خانے میں رکھ کر آہستگی سے چائے کا ایک کپ تیار کیا اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں آکر پینے لگا۔ آج اس کمرے کی قلعی اکھڑی دیواریں اور کم روشنی کے بلب کی زرد روشنی مجھے بری نہیں لگ رہی تھی۔ چارپائی کی چوں چوں بھی بیزاری میں مبتلا نہ کر پائی تھی۔ نیچے گلی میں سے گزرتے چوکیدار کے جوتوں کی گھس گھس اور ڈنڈے کی آواز بھی کوفت پیدا کرنے کا باعث نہ بن سکی تھی سب کچھ اچھا ہو گیا تھا یا میری نظروں کے لیے ایک ثانوی چیز بن کر رہ گیا تھا اصل چیز تو وہ چہرہ تھا جو میرے تصور میں براجمان تھا اور وہ آواز جو میری سماعتوں میں محفوظ تھی۔
''دیکھیں یہ کتابیں کہاں رکھی ہیں؟'' اور اس رات میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ حقیقی اور ذاتی خوشی کا احساس اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ آپ کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور پھر اس کے بعد آپ دوسرے احساس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

☆☆

خوشی اور نئے پن کا وہ احساس واقعی کچھ دن مجھ پر چھایا رہا تھا میں دکان پر بیٹھا اپنے پاس سے اٹھنے والی ہر نسوانی آواز پر چونک کر بغور دیکھتا، اس سے قبل میں اکثر سر جھکائے جھکائے ہی کتابوں کے بل بنا دیا کرتا تھا دکان کے وسیع ہال کے ہر کونے پر گاہے گاہے نظر ڈالتا شاید لیکن وہ جو کچھ دن پہلے ہوا تھا محض اتفاق تھا اور اس خوشگوار احساس کا اثر خود بخود زائل ہونے لگا۔
لیکن پھر ایسا ہوا کہ وہ محض اتفاق دوبارہ ظہور پذیر ہوا، اس روز میں لوگوں کے درمیان گھرا ہوا

تھا- نئی آئی کتابوں کی لسٹ کے مطابق انہیں مختلف ریکس میں رکھوا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی میز پر آئے لوگوں کے بل بھی کاٹ رہا تھا-

''بات سنیں' ایک روز میں نے ہاں ''ظالم محبت'' رکھی دیکھی تھی-'' شاید میرا لاشعور ہردم اس آواز کا منتظر تھا- کتابوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر میرا ہاتھ لگنے سے میز سے نیچے گرا اور میں پورے کا پورا پیچھے کی طرف گھوما- وہ میرے پیچھے والے دیوار گیر بک ریک کے قریب کھڑی تھی- معصومیت' سادگی اور زمانے کی ہوا سے ناآشنا تاثر لیے ہوئے وہ نیا چہرہ لاکھ عزیز احمد کہے کہ میں نے اس کو بیان کرنے کے لیے بڑے عام سے الفاظ کہے تھے' میرا خیال تھا کہ اس کو بیان کرنے کے لیے ان کے علاوہ اور کوئی الفاظ تھے ہی نہیں' یہ اس کا پہلا اور دیرپا مضبوط تاثر تھا-

''آپ کی کتابیں؟-'' اس نے میرے سوالیہ انداز میں دیکھنے پر آہستہ سے کہا- ''گر گئیں-''

''جی!-'' میں نے ذرا خجالت سے جھک کر کتابیں اٹھائیں- اسی لمحے میں ایک ہاتھ نے دو کتابیں میری طرف بڑھائیں- میں کیش میمو اپنی طرف کھسکا کر بل بنانے لگا- پھر ایک اور ہاتھ آیا اس کے بعد ایک اور اس روز میرے سیکشن میں کافی رش تھا اور مجھے سر اٹھانے کی فرصت نہیں مل رہی تھی- پندرہ بیس بل پھرتی سے منٹوں میں کاٹنے کے بعد میں نے ذرا بے چینی سے پیچھے مڑ کر دیکھا- میرا خیال تھا' وہ جا چکی ہوگی- لیکن وہ وہیں کھڑی کتابیں ٹٹول رہی تھی-

''ظالم محبت-'' میں نے لاشعوری طور پر وقت ضائع کرنے کی خاطر سر کھجا کر سوچنا شروع کیا ''ظالم محبت'' اس کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ میں واقعی سوچ رہا ہوں ایک بار پھر بڑبڑایا-

''حجاب امتیاز علی کی- ظالم محبت-'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا-

''حجاب امتیاز! میں پھر بڑبڑایا- ''اچھا ظالم محبت'' پھر جیسے میں سمجھ گیا حالانکہ میں اس وقت ہی سمجھ گیا تھا جب اس نے پہلی بار پوچھا تھا- ''وہ تو میرے خیال سے آخری کاپی تھی- اب تو وہ آؤٹ آف اسٹاک ہو چکی-''

''ہائے!'' اس کا دل جیسے بری طرح دکھ گیا ''میں نے اسی روز کیوں نہ خرید لی-'' وہ پیچھے دیکھتے ہوئے اپنی دوست سے مخاطب ہوئی تم نے ہی مجبور کر کے مجھے ''دی جسٹس'' خریدوا دی حالانکہ گالزوردی' زہر لگتا ہے مجھے اور ظالم محبت ختم ہو گئی' تمہیں کیا پتا' کتنا چارم ہے اس کتاب میں کتنی فسوں خیز کتاب ہے وہ اور'' وہ جھنجھلا کر بول رہی تھی اور اس کے انداز میں ذرا بھی مصنوعی پن نہیں تھا ''بھاڑ میں جائے گالزوردی-''

''خیر اب یہ تو نہ کہو' سچ سچ بتاؤ بھلا جس روز سے خریدی ہے' اس روز سے اس سے چمٹی ہوئی ہو یا نہیں- اب بھی تم کو زہر لگتا ہے وہ؟''

دوست نے ناک سکیڑ کر کہا- اپنی وضع قطع اور مصنوعی بناوٹ کی بنا پر وہ کہیں سے بھی اس کی

دوست نہیں لگ رہی تھی-

''اب کب آئے گی ظالم محبت؟'' وہ اس کا تبصرہ ان سنا کر کے دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی-

''جہاں تک میرا خیال ہے' وہ آؤٹ آف پرنٹ بھی ہے آج کل- دیکھیں دوسرا ایڈیشن کب چھپتا ہے-'' میں نے اپنی مسکراہٹ دبا کر کہا-

''کہیں اور سے نہیں مل سکتی؟'' وہ مایوسی سے بولی ''مگر کہاں میں ہر جگہ دیکھ چکی ہوں-'' پھر اس نے خود ہی جواب دیا-

''چھوڑو پرے- کسی لائبریری سے لے کر پڑھ لیں گے-'' دوست نے مشورہ دیا-

''پڑھ تو میں چکی ہوں' میں تو اس کو خرید کر اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی-''

''تو پھر کسی لائبریری سے اڑا لیں گے-'' دوست لاپروائی سے بولی-

''تمہارا تو دماغ خراب ہے-'' وہ بھنا کر بولی ''اچھا جی بہت شکریہ-''

اس نے مجھ سے کہا اور دوست کا ہاتھ پکڑ کر انگلش سیکشن کی طرف بڑھ گئی اور میں جوان کی گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا- اپنی میز کے گرد امنڈ آنے والا رش دیکھ کر دوبارہ ادھر مڑ آیا- ایک بار پھر بل کاٹتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ عزیز احمد کے پاس میں نے ایک بار ''ظالم محبت'' دیکھی تھی' کاش وہ مجھ سے کہے اور میں اس کو کتاب پیش کرنے کی آفر کروں- اپنے کام میں مصروف میں نے بار بار کن اکھیوں سے اسے دیکھا- انگلش کلاسیک کے لیٹسٹ ارائیولز کے ریک کے قریب کھڑی وہ کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھی- اس روز اس نے ہلکے گلابی رنگ کی پرنٹڈ قمیص سادی شلوار کے ساتھ پہن رکھی تھی اور ہلکا سا اوپن سوئیٹر (اس کے بارے میں چھوٹی سی چھوٹی بات میرے حافظے میں آج بھی اسی طرح محفوظ ہے) بالوں کی دراز چٹیا اسی طرح پشت پر پڑی تھی-

''چھوڑو پرے' دفع کرو-'' وہ اپنی دوست سے کچھ کہہ رہی تھی میرے بہت دھیان سے سننے پر وہ کہتی سنائی دی- پھر وہ کاؤنٹر کی جانب چلی گئیں اور پے منٹ کر کے اپنے لفافے وصولنے لگیں-

میں نے ایک خاتون کا بل کاٹا اور اسی اثنا میں وہ جا چکی تھیں-

''کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے' جو میں اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں-'' اس شام پاک ٹی ہاؤس میں عزیز احمد کے ساتھ چائے پیتے ہوئے میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا- زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ میں نے اپنی کوئی انتہائی ذاتی بات عزیز احمد سے نہیں کی تھی-

''آج میں اپنی کہانی دے کر آیا ہوں ریڈیو اسٹیشن ممتاز حمید کو-'' وہ اپنے اس سفر کے لمحہ آغاز کی کہانی سنا رہا تھا جس کی منزل آج اس کا بی بی سی کے پاکستانی سیکشن میں موجود ہونا تھا-

''پھر-'' میں بے دھیانی میں بات کر رہا تھا-

''اپروو تو ہو چکا ہے' اگلے ایک دو ہفتے میں کام شروع ہوگا' دیکھو اوپر جانے کے لیے زینہ ملتا ہے یا

پاؤں تلے سے زمین ہی نکل جاتی ہے' بڑا مشکل کام ہے یار! اپنی تسلی کے لیے کسی راستے کا انتخاب کرنا-'' وہ بھی کچھ کھویا ہوا تھا- بقول اس کے لکھنے لکھانے کا کام باقاعدہ شروع کر کے اس نے ایک طرح سے جوا کھیلا تھا-

''بڑا ہی مشکل کام ہے' اپنے لیے راستے چننا' کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ابا کی بات مان لیتا' پڑھنا وڑھنا چھوڑ کر کسی دکان وغیرہ پر کام شروع کر لیتا-'' اس نے جیب سے ڈبیا نکال کر تیسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا- ''زندگی آسان ہو جاتی-'' کہتے کہتے اس کی نظر دروازے پر پڑی ''ارے اشفاق احمد' مجتبیٰ یار! یہ بڑے دن پیچھے نظر آئے-''

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا- کوئی اور دن ہوتا تو میں بھی شاید اس میز کی طرف بھاگتا جہاں اشفاق احمد بمعہ اپنے مشہور و معروف گروپ کے براجمان ہونے والے تھے مگر آج کی بات دوسری تھی- آج میرا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا اور میری نظروں کے سامنے ٹی ہاؤس کے ان مانوس چہروں کے بجائے ایک معصوم' نازک اور سادہ چہرہ تھا- میرے کانوں میں دھیمی نرم آواز گونج رہی تھی- ''اور اگر اس کا پس منظر وہی ہوا جو آپ نے سوچا ہے میاں صاحبزادے تو آپ کے اس احساس کی آگاہی پر بغیر گنے کتنے جوتے پڑ سکتے ہیں؟'' پھر اچانک میں اپنے ایک نئے خیال پر مسکرا اٹھا-

''میرا خیال تھا کہ تم خود ہی بتا دو گے' اس لیے اس وقت سے پوچھا نہیں-'' رات گئے واپسی پر عزیز نے خاموشی سے چلتے ہوئے اچانک کہا-

''کیا؟'' میں چونک گیا-

''وہی جو ساری شام سوچتے رہے ہو اور بتا نہیں رہے-'' اس نے اطمینان سے کہا- ہاں اگر ایسا معاملہ عزیز احمد کے ساتھ پیش آتا اور وہ مجھے نہیں بتاتا تو میں بھی خود ہی جان لیتا بغیر اس کے بتائے-

''کیا بات ہو سکتی ہے-'' میں نے آہستہ آواز میں پوچھا-

''میرا خیال ہے کہ آج تم دن کے کسی حصے میں ایک مرتبہ پھر اس نئے پن کے احساس سے دوچار ہوئے ہو-'' اس نے اطمینان سے انکشاف کیا- بلاشبہ وہ میری رگ رگ سے واقف تھا-

''اچھا پھر؟'' میں نے اسی آہستہ آواز میں کہا-

''مجتبیٰ! اگر تمہاری زندگی میں اس ''نئے پن'' کے احساس نے کوئی وقتی اہمیت حاصل کر ہی لی ہے تو بھی پلیز اپنی آواز کو اتنا پست تو نہ کرو' یوں جیسے تم کسی بات پر شرمندگی محسوس کر رہے ہو-'' اس نے مجھے ڈانٹا-

''وقتی طور پر-'' میں نے اس کی ہدایت کے مطابق باآواز بلند اس کے کہے جملے کا یہ اہم حصہ اچک کر کہا- وہ اچانک رک کر چند ساعتوں تک مجھے غور سے گھورتا رہا-

''اچھا چلو' اس سے ذرا زیادہ ٹائم کے لیے سہی-'' گھورنے کا شوق پورا کر کے وہ دوبارہ چلتے

ہوئے بولا-

''خیر اس کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ اب تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی جانب کرتے ہوئے کہا-

''مجھے کیا کہنا ہے' یہ وقت تمہارا ہے- اس وقت ایک جذبہ ایک سوچ اور احساس تمہارے ذہن پر حاوی ہے میں اس وقت جو بھی کہوں گا تم کو غلط لگے گا' بلکہ برا محسوس ہوگا-''

''پھر بھی-'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا-

''پھر بھی-'' اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر مسکرا دیا ''پھر بھی یہ کہ بہت عام سی بات ہے روٹین سے ذرا ہٹ کر ایک چیز دیکھی اور اس کو مرکز نگاہ بنا لیا- وہی ایک نقطہ ہر ایک چیز پر حاوی اس کے ارد گرد آگے پیچھے کی تمام وسعتیں بھول گئے- لیکن اس میں تمہارا ابھی قصور نہیں' زندگی میں ایسے ادوار آتے ہی رہتے ہیں- ویسے کیا آج پھر وہ تمہاری دکان پر آئی تھی؟''

اپنی بات مکمل کر کے اس نے ایک بار پھر مجھے دیکھا اور ہم دونوں ہی بے ساختہ ہنس دیے- پھر میں نے اس ٹینس صورت حال سے نکل کر بڑے آرام سے عزیز کو آج کی پوری واردات سنائی اور اس کے سامنے ''ظالم محبت'' کے لیے دست طلب دراز کیا-

''ہاں ہوتی ہے ظالم-'' اس نے بات سن کر اچانک کہا ''یہ محبت وغیرہ سخت ظالم ہوتی ہے- سننے میں تو یہی آیا ہے-'' پھر وہ مسکرایا-

''تجربہ کر کے دیکھو-'' میں نے اسے چھیڑا-

''خیر میرا تو قطعی کوئی ارادہ نہیں تجربہ کرنے کا' البتہ تمہارے ہاتھ خوب موقع آیا ہے اور جسے تم گنواتے دکھائی نہیں دیتے' میاں! آج ظالم محبت مانگ رہے ہو کیا خبر کل بات اس سے بڑھ کر خوشبو پر آ جائے پھر پھول پر اور پھر-''

''کہتے مجھے ہو اور کر خود رہے ہو عامیانہ باتیں-'' میں نے اس کی بات کاٹی ''مجھے یہ بتاؤ کہ کب لاؤ گے کتاب؟''

''کل ہی انشاءاللہ پہنچ جائے گی' کیا پتا کس وقت وہ قابل قدر ہستی تمہارے ہاں آ دھمکے- کتاب تو بہرصورت تمہارے پاس ہونی چاہیے-'' وہ ہنسا اور سانندہ کلاں کی طرف مڑ کر اندھیرے میں کھو گیا-

☆☆

مجھے ''ظالم محبت'' اپنے پاس رکھ کر زیادہ دن اس کا انتظار نہیں کرنا پڑا- اگلے روز عزیز احمد نے ظالم محبت مجھے لا کر دی اور اس کے دو روز کے بعد لنچ کے وقفے سے ذرا پہلے وہ دکان پر موجود تھی' یہ محض اتفاق تھا کہ وہ میری توقع کے برعکس اتنی جلدی میرے سامنے موجود تھی- دروازے سے اندر داخل ہو کر وہ سیدھی میرے سیکشن کی طرف بڑھی اور اس نے سامنے والے ریک کے نچلے خانے

میں رکھی "علی پور کا ایلی" اٹھائی' چند صفحے ٹٹولنے کے بعد اس نے ذرا فاصلے پر کھڑی اپنی دوست کو مخاطب کیا "بہت ضخیم اور قدرے مہنگی ہے-" اس کی آواز بلند تھی- میں نے با آسانی سن لی-

"بہت کیا ہے؟" دوست نے انگریزی زدہ لہجے میں دریافت کیا-

"بڑی موٹی-" اس نے کتاب ذرا بلند کر کے دکھایا- "بھئی فی الحال تو گنجائش نہیں- اگر وہ ظالم محبت-"

کتاب ریک میں رکھتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا- میں منتظر تھا مگر عین وقت پر بے نیاز سا نظر آنے کی خاطر میں نے سر جھکا کر اپنے سامنے دھرے کاغذ ترتیب دینا شروع کر دیے-

"بات سنیں وہ ظالم محبت کے بارے میں کہا تھا آپ سے؟"

"جی!" وہ ذرا مسکرائی "لیکن ظاہر ہے کہ اتنے لوگوں کی آمد و رفت میں آپ کو کہاں یاد رہا ہو گا- وہ کتاب آئی یا نہیں-"

"ظالم محبت-" میں نے سوچنے کی اداکاری کی- "جی ہاں!" پھر میں نے ایسے چٹکی بجائی جیسے کچھ یاد آ گیا ہو اور اپنی میز کی دراز کھولی "اتفاق سے میرے پاس ایک اپنی کاپی موجود ہے- یہ آپ لے سکتی ہیں ورنہ کتاب تو آؤٹ آف پرنٹ ہے شائد آپ کو علم ہو-" مجھے اپنی عیاری پر خود بھی ہنسی آ رہی تھی-

"اوہ سو نائس آف یو-" وہ اچانک ہنس دی "لیکن مجھے یہ کتاب پڑھنے کے لیے نہیں چاہیے میں تو اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں خرید کر-"

پھر وہ کچھ سوچنے لگی- "دراصل مجھے بہت پسند ہے یہ کتاب' لیکن مل نہیں رہی اس لیے میں نے آپ سے پوچھا تھا- یہ تو آپ کی اپنی کتاب ہو گی بیچنے کے لیے تو نہیں ہے نا؟" اس نے ذرا للچائی ہوئی نظروں سے کتاب کا کور دیکھتے ہوئے کہا-

"نہیں- بیچنے کے لیے تو نہیں ہے-" میں جو اس کے بات کرنے کے دھیمے اور سلجھے ہوئے انداز سے خاصا مبہوت ہو چکا تھا چونک کر بولا "لیکن آپ اس کی اتنی مداح ہیں' ادب کی قدر دانی میں نے آپ کی طرح کی لڑکیوں میں کم ہی دیکھی ہے' اس لیے' آپ اس کو رکھ لیں-" میں نے کتاب دوبارہ اس کی طرف بڑھائی-

"بہت شکریہ- لیکن-" وہ پھر رک کر سوچ میں پڑ گئی- "اچھا میں آپ کو اس کی قیمت ادا کر دیتی ہوں-"

"جی نہیں' میں یہ کتاب بیچ نہیں رہا بلکہ اردو ادب کی ایک قدر دان کو تحفتاً پیش کر رہا ہوں-" میں نے سنجیدگی سے کہا- وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی- پھر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستگی سے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی-

"مجھے معلوم نہیں کہ مجھے یہ کتاب لینی چاہیے یا نہیں' لیکن آپ جس طرح کہہ رہے ہیں میں انکار بھی نہیں کر سکتی بہت شکریہ بہر حال-"

وہ تیزی سے پیچھے مڑ کر اپنی دوست کے پاس چلی گئی اور اتنی ہی تیز رفتاری سے اس کو لے کر دکان سے باہر نکل گئی- میں نے دروازے کے شیشے سے اس کو سڑک کراس کر کے دوسری جانب جاتے دیکھا اور ہنس دیا- وہ واقعی اپنی عمر کی دیگر لڑکیوں سے مختلف تھی- معصوم اور انجان خالص اور سادہ- اس کے بارے میں میرے خیالات مزید پختہ ہو گئے- حقیقت میں میرا دل اس نقطے پر اٹکنے لگا تھا-

پھر ایسا کئی بار ہوا' وہ کتابیں خریدنے کے لیے آتی' کبھی کسی کتاب کے بارے میں مجھ سے دریافت کرتی' کبھی بل کٹواتے ہوئے حال احوال دریافت کرتی اور چلی جاتی- اس کے جانے کے بعد اکثر میں سوچا کرتا کہ اس نے کبھی بھول کر بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ میں ہر ہفتے اور' کبھی کبھار مہینے میں کتنے دن اس کا منتظر رہتا ہوں اور اس کی آمد مجھے کس احساس سے دوچار کر جاتی ہے- مگر میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا- جو میرا احساس تھا وہ میرا احساس تھا- خالصتاً ذاتی' کوئی اس کو مجھ سے چھین نہیں سکتا تھا- میری ذہنی آسودگی' میری زندگی کی ایک اچھوتی تفریح اس کے بارے میں سوچنا اور اس کی آمد کی خواہش کرنا تھا- عزیز احمد میری ان باتوں پر کبھی ہنستا اور کبھی خفگی کا اظہار کرتا اس کے خیال میں میں احمقانہ باتوں میں اپنا وقت برباد کر دیا تھا- جبکہ بقول اس کے اس وقت تک میں عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا تھا جہاں میرے شعور کو کم از کم اتنا پختہ تو ضرور ہو جانا چاہیے تھا کہ میں ایسی احمقانہ سوچوں کو آسانی سے خدا حافظ کہہ سکوں غالباً وہ ٹھیک ہی کہتا تھا- مگر میرا ذہن اس کی نصیحتوں پر عمل کرنے سے بارہا قاصر ہو جاتا-

"تم بات کو غلط رخ دے رہے ہو' غلط زاویے سے دیکھ رہے ہو- کسی کو پسند کرنا یا کسی کے اچھے لگنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ضرور ہی اس سے محبت کر رہے ہیں-" میں نے ایک بار اس سے کہا-

"یقیناً یہ مطلب نہیں ہے-" اس نے اطمینان سے جواب دیا- "پسند تو ہم بہت سے لوگوں کو کرتے ہیں- ان لوگوں سے ہم ملتے ہیں باتیں کرتے ہیں ان کی خوبیوں کو سراہتے ہیں یہ ایک عام روٹین کی بات ہے- کئی شخصیات ایسی ہوتی ہیں- جو اپنے عمل کی وجہ سے' اپنے کارناموں کی وجہ سے ہمارا آئیڈیل بن جاتی ہیں- سیاسی لیڈر' ادیب شاعر' مصلح وغیرہ ان کو بھی ہم پسند کرنے کے ضمن میں لا سکتے ہیں- مگر کسی کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی محض اتفاقیہ ملاقاتوں پر ہزاروں لوگوں میں سے صرف ایک ہی شخصیت کا انتظار اور پھر اکثر و بیشتر اسی کے بارے میں گفتگو یقیناً کسی اور سوچ کی عکاسی کرتی ہے خصوصاً جب اس شخصیت کا تعلق صنف مخالف سے ہو-"

"ہاں شائد' اس کی یہ بات بھی اس کی بہت سی اور باتوں کی طرح درست تھی میں نے ذہنی طور پر اس سے ہار مانتے ہوئے تسلیم کیا- "لیکن میں چاہوں گا کہ تم اسے ایک بار ضرور دیکھو تمہیں اس کے کچھ منفرد ہونے کا احساس ضرور ہو گا-" میں نے اسے اکسایا-

"جو احساس تمہارے لیے سم قاتل ثابت ہوا' میں اسے محسوس کرنے کی خواہش نہیں کر سکتا-"

اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

عزیز احمد اس کو ایک بار دیکھ لینے والی میری بات شاید کبھی نہ مانتا۔ مگر یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ وہ ایک روز خود بخود اسے نظر آ گئی۔ وہ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور ہم دونوں کے پاس ہی پیسوں کا تقریباً تقریباً خاتمہ ہو رہا تھا۔ لیکن عزیز احمد کا اصرار تھا کہ پلازا میں لارنس آف عریبیہ کا آخری شو ضرور دیکھا جائے۔ نجانے کہاں کہاں سے پیسے اکٹھے کر کے اس نے ٹکٹ خریدے اور تیسرے درجے میں بیٹھ کر ہم دونوں نے فلم دیکھی۔ وہ غالباً اس سال دسمبر کی یخ ترین رات تھی۔ شو ختم ہونے کے بعد باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ بارش آدھے گھنٹے سے متواتر برس رہی ہے۔

''اب پہنچ چکے تم گھر۔'' میں نے عزیز احمد سے کہا۔

''اسی میں تو مزا ہے یار! انسان جب تک قدم قدم پر خوار نہ ہو زندگی کا لطف نہیں آتا۔'' اس کی منطق نرالی تھی۔ ہمارے اردگرد مختلف لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے انتظام میں مصروف تھے۔ جن کے پاس گاڑیاں تھیں وہ سکون سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑیوں کے لاک کھول رہے تھے۔ اکا دکا ٹیکسیوں کی آمد پر ہجوم ادھر کو لپکتا باقی لوگ مختلف شیڈز کے نیچے پناہ گزین تھے۔ ''چنا کرارا' چائے خوشبودار' بے بی چپس' چیونگ گم'' کی آوازیں بلند کرتے چھابڑیاں اٹھائے چلتے پھرتے دکاندار سینما ہال سے باہر نکل کر گاہک تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

''مول پھلی گریم (مونگ پھلی گرم) ایک کونے سے آواز آئی تو عزیز احمد ادھر کو لپکا۔ گرم مونگ پھلی اس کی کمزوری تھی۔

''یہاں گھر جانے کے لالے پڑے ہیں تم مونگ پھلیاں خریدتے پھر رہے ہو۔'' میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔

''انجوائے کرو یار! فکروں میں زندگی کیوں تباہ کر رہے ہو۔'' یہ مونگ پیلی گریم'' لے کر پیدل مارچ کریں گے' مولا بخش کا پان خریدیں گے پھر گھر کو جائیں گے۔''

وہ اطمینان سے بولا اور مونگ پھلی والے کی چھوٹی سی کوئلے بھری ہانڈی کے نیچے سے مونگ پھلیاں نکالنے لگا۔

''اور صبح تک مارے نمونیے کے اکڑے پڑے ہوں گے۔'' میں نے سینما کی سامنے کی دیوار پر نیو ایرز ارائیول گون وِد دی ونڈ کا اشتہار اور کلارک گیبل اور گریٹا گاربو کی آفت قسم کی تصویریں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! دیکھو ہمارے وال پینٹر نے گریٹا گاربو کے چہرے پر کیا زوردار قسم کا لال رنگ چڑھایا ہے۔'' عزیز احمد کو ادھر متوجہ کرتے ہوئے میری اپنی نظریں ایک نقطے پر ساکت ہو گئیں۔ اپنے سامنے چھاجوں برستی بارش کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ کر پریشان ہوتی ہوئی وہ یقیناً وہی تھی اور اس

کے ساتھ اس کی پکی' روزی' جینی قسم کی دوست۔

''شکر کرو لال ہی چڑھایا ہے۔ ہرا یا کالا چڑھا دیتا تو ہم اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟'' عزیز احمد کی لاپروا آواز آئی۔ مگر میرا دھیان ادھر نہیں تھا میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر اچانک مجھ پر پڑی تھی اور پھر اس نے جھک کر اپنی دوست سے کچھ کہا تھا جس پر وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''اچھی نہیں ہے۔ مونگ پھلی گیلی ہے' خوامخواہ آخری پونجی بھی لٹا دی۔'' عزیز احمد اپنی کہے جا رہا تھا اور میں ان دونوں کو حرکت کرتے اور اپنی جانب آتے دیکھ رہا تھا۔

''معاف کیجئے گا۔'' اس کی دوست نے قریب آ کر کہا۔

''معاف کیا۔'' عزیز احمد پر مسخری چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ٹھوکا دیا۔

''آپ وہ ہیں نا بک سیلر' یہ ادھر۔'' اس نے سامنے والی بلڈنگز کی طرف اشارہ کیا۔

''کمال ہے بھئی اب بک سیلنگ بھی اتنا بڑا کمال بن گئی کہ لوگ خصوصاً لڑکیاں پہچان کر تعارف کروانے آگے بڑھ آئیں جیسے شاعروں ادیبوں اداکاروں کے لیے آتی ہیں۔'' عزیز احمد بڑبڑایا میں نے اسے پھر ٹھوکا دیا۔

''جی ہاں!'' اب کے میں خوش دلی سے ان سے مخاطب تھا۔

''دیکھیں نا بارش ہو رہی ہے۔'' وہ میرے جواب پر خوش ہو گئی۔

''دیکھیں کیا جی۔ بارش تو سنائی بھی دے رہی ہے۔'' عزیز احمد مونگ پھلی پر ہاتھ صاف کیے جا رہا تھا۔

''معلوم نہیں تھا کہ اس طرح بارش شروع ہو جائے گی' ہم غلطی سے ہی یہ آخری شو دیکھنے چلے آئے۔'' وہ منمنائی۔

''اس کی ضد تھی بے تکی اور نامناسب۔'' اب کے وہ خود قدرے اور اونچا اور غصے سے بولی ''کس قدر آکورڈ لگ رہا ہے اتنی رات گئے' برستی بارش میں سینما ہال کے سامنے اکیلی کھڑی لڑکیاں' میں تو مروت میں ماری گئی۔''

''اسی لیے تو کہتے ہیں بی بی! کہ مروت بھی سوچ سمجھ کر برتنی چاہیے۔'' عزیز احمد کی بکواس جاری تھی۔

''پھر اب۔'' میں نے عزیز احمد کو تیسرا ٹھوکا دے کر کہا۔

''دراصل ہمیں ہاسٹل پہنچنا ہے' نہ تو کوئی سواری مل رہی ہے اور نہ ہی بارش کے رکنے کا امکان ہے۔'' اس نے جیسے کسی جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا۔

''ارے۔'' عزیز احمد پھر مجھ سے پہلے بول اٹھا ''ناحق ہی آپ نے ہم سے اتنی لمبی بات کرنے میں وقت ضائع کیا ہم تو خود جناب ہر طرح سے پیدل ہیں مع عقل کے۔''

''افوہ عزیز احمد! خدا کے لیے-'' میں نے اب کے اسے واضح طور پر ڈانٹا-

''دیکھیں' سواری تو ہمارے پاس بھی نہیں' ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں-'' مجھے پہلی بار اپنے پاس سواری نہ ہونے پر غصہ آیا-

''ویسے جایا تو یہاں سے پیدل بھی جا سکتا ہے- اگر بارش ذرا ہلکی ہو جائے تو لیکن ہم کو ذرا ڈر لگ رہا ہے کیا آپ ہمارے ہوسٹل تک ہمیں پہنچا سکتے ہیں-'' سہیلی ایک بار پھر انگریزی زدہ لہجے میں منمنائی-

''آپ کو ہم پر اعتماد کیسے ہوا؟ سوچنے کی بات ہے-'' عزیز احمد اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولا-

''بس ہے اعتماد ان پر- آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ چلیں گے ہمارے ساتھ؟'' اس نے عزیز احمد کی بحث کرنے کی عادت سے تنگ آ کر کہا-

''ان پر-'' اب کے عزیز احمد نے مجھے غور سے دیکھا- ''اوہو اچھا'' پھر جیسے وہ کچھ سمجھ گیا- ''ہاں تو پھر بااعتماد صاحب' فرمایئے کیا خیال ہے آپ کا آپ ان دونوں خواتین کو چھوڑنے جا رہے ہیں-''

''میں ہی نہیں تم بھی جا رہے ہو-'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا- ''جانا کہاں ہے-''

''کینرڈ کے ہوسٹل تک صرف-'' سہیلی نے انگریزی میں کہا-

''صرف-'' عزیز احمد ہی نہیں میں خود بھی چونک گیا تھا-

''واکنگ ڈسٹینس'' ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ''چلیں ناں پھر اب بارش ذرا رک رہی ہے-''

اگلی بات سوچنے سے پہلے ہی ان دونوں نے شور مچا دیا اور شڑاپ شڑاپ کرتے پانی میں پاؤں رکھ دیے- ہم دونوں بغیر کچھ مزید سوچے ان کے پیچھے چل دیے-

انتہائی تاریک رات تھی اور سنسان بھی' بارش کی وجہ سے کوئی ذی روح سڑک پر نظر نہیں آ رہا تھا اور ہم دونوں مارے نیکی کے شڑاپ شڑاپ کرتے ان دونوں لڑکیوں کو ہاسٹل پہنچانے کا اخلاقی فریضہ ادا کرنے جا رہے تھے- ہمارے آگے ان دونوں کی بڑبڑاہٹ خاموشی میں بڑی واضح سنائی دے رہی تھی-

''توبہ استغفار' میں نے کبھی زندگی میں ایسے وقت کا تصور بھی نہیں کیا تھا' میں تو اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو گئی' ان آوارہ قسم کے سیٹیاں بجاتے لوگوں میں کھڑے ہوئے کوئی شناسا دیکھ لیتا تو کیا سوچتا' تمہیں علم بھی ہے کہ میں اس قسم کی ایکٹیوٹیز کو سخت ناپسند کرتی ہوں-'' وہ اپنی دوست کو ڈانٹ رہی تھی-

''اچھا بابا! اب چپ بھی کرو- سارا الزام مجھے ہی دیے جا رہی ہو- خود بھی تو تمہیں پیٹر اوٹول ایز لارنس آف عریبیہ دیکھنے کا بہت شوق تھا-'' دوست نے آہستہ آواز میں کہا-

''بھاڑ میں گیا پیٹر اوٹول' افوہ میرے خدا میں اور وہ سینما ہاؤس اور اس میں کھڑے آوارہ لوگ'

اب یہ بک سیلر صاحب بھی نجانے کیا سوچتے ہوں گے ہم کس قسم کی لڑکیاں ہیں-'' اس کی توبہ تلا جاری تھی-

''سوچنا کیا ہے- بک سیلر صاحب کے دماغ میں کچھ ہو تو سوچیں-'' عزیز احمد بڑبڑایا- ''لے کے اچھے خاصے بنے بنائے امیج کا بیڑا غرق ہو گیا-'' وہ نجانے کس سے مخاطب تھا-

''اب تیز چلو- خوامخواہ اپنے ساتھ ان شریف لوگوں کو بھی مصیبت میں ڈال دیا-'' وہ کہہ رہی تھی-

''شریف لوگ-'' دوست بڑبڑائی'' شرافت کا کیا سرٹیفکیٹ لے رکھا ہے' تمہارے اخلاقی نظریات کی رو سے تو ان دونوں شریف لوگوں کو اس وقت تک اپنے اپنے گھروں میں آیت الکرسی پڑھ کر سو چکے ہونا چاہیے تھا کہ سینما ہاؤس میں انگریزی فلمیں دیکھتے ہوئے پایا جانا چاہیے تھا-''

''شٹ اپ- تمہیں کیا حق ہے اس ذرا سی تفریح پر ان کو غیر شریف کہنے کا-'' اس کی آواز غصے میں ذرا بلند ہوئی-

''پھر کسی کو کیا حق ہے اس ذرا سی تفریح پر ہم کو-'' دوست نے کہنا چاہا-

''شٹ اپ' شٹ اپ پلیز میرے بارے میں ایسا کوئی لفظ نہ بولنا-''

اس کی آواز مزید بلند ہوئی- طویل فاطمہ جناح روڈ سے اب ہم تقریباً جیل روڈ کی طرف مڑ گئے تھے- بارش رفتہ رفتہ پھر تیز ہو رہی تھی-

''اف میری ٹانگیں-'' دوست پھر منمنائی-

''چلتی رہو خاموشی سے-'' ڈپٹ کر جواب دیا گیا-

اسد بسمل ہے کس انداز کا' قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر' خون دو عالم میری گردن پر

عزیز احمد نے یکا یک با آواز بلند گنگنانا شروع کر دیا-

''عزیز یار!'' میں نے اسے منع کرنا چاہا-

''اسد بسمل ہے' ہاں اسد بسمل ہے کس انداز کا-'' وہ پروا کیے بغیر گنگناتا رہا خاموشی میں اس کی آواز اور بھی بلند ہو رہی تھی-

''دیکھا شریف لوگ!'' دوست نے سٹپٹا کر کرتے ہوئے کہا- ''تھرڈ کلاس گانے گا رہا ہے-''

''تو مشق ناز کر مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر-'' عزیز گنگنائے جا رہا تھا اور اس کے بازو پر میرے ہاتھ کی گرفت سخت ہو رہی تھی-

''کوئی تھرڈ کلاس وغیرہ نہیں- وہ غالب گنگنا رہا ہے' پروا مت کرو اور چلتی جاؤ-''

''اسد بسمل ہے-'' عزیز احمد نے پھر سے کہنا چاہا میں نے اپنے ناخن اس کے بازو میں کھبو دیے-

وہ تھکا دینے والی واک تھی- خدا خدا کر کے کینئرڈ کالج کا ہاسٹل آیا- ''رات بہت ہوچکی- ابھی بہت سی جگہوں پر بہت سے بہانے کرنے باقی ہیں ورنہ آپ سے تفصیلی بات کرتے اور یوں بھی بارش دوبارہ سے برسنے کو ہے آپ کو واپس بھی جانا ہوگا بہرحال بہت شکریہ-''

گیٹ پر پہنچ کر اس نے سرعت سے کہا اور چوکیدار کی طرف بڑھ گئی-

''چلو اب' ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟'' عزیز احمد جو میرے ناخن کھونے سے لے کر اب تک خاموش تھا' میرے سٹپٹا کر کھڑے رہنے پر بولا-

''وہ تو گئی اندر' اب تم اس فراٹے سے برستی بارش میں واپس جانے کا تصور کرو- صبح تک نمونیا چھوڑ ٹائیفائیڈ' خسرہ' ذیابطیس سب کچھ ہوجائے گا- بلند اخلاق' نیکی اور فلاں فلاں کے مارے ہوئے محترم بک سیلر صاحب-''

میں اس کی اگلی بات سنے بغیر واپسی کے لیے مڑا ''چلو-''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا ''اسی بہانے تمہارے اس انفرادیت کے احساس سے ہم بھی دوچار ہوئے- اس برستی بارش میں آخری شو دیکھنے کے لیے جانا ایک منفرد اور بولڈ اسٹیپ ہی تو ہے-''

وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ ہی وہ لڑکی تھی جس نے کچھ عرصے سے مجھے مشکل میں ڈال رکھا تھا-

''وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی اور اس کو خود بھی اپنے جانے پر غصہ تھا-'' میں نے لاشعوری طور پر اس کی صفائی پیش کی-

''اچھا!'' وہ شڑاپ شڑاپ قدم اٹھاتا ہوا اچانک ہنسا- ''وہ اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی- اصل میں بچی ہے نا ابھی' لوگ زبردستی ساتھ لے جاتے ہیں' یار میرا تو کچھ اور ہی تصور تھا' لے کے سارا تباہ کر دیا اور اوفوہ بھئی ایک تو یہ عینک-'' مجھے ڈر تھا کہ وہ اس کے بارے میں مزید گوہر افشانیاں سارا راستہ کرتا رہے گا مگر اچانک اسے اپنی عینک کی مصیبت پڑ گئی ''اس وقت سے صاف کر کر کے تھک گیا ہوں' معنک انسانوں کو اپنی عینکوں پر وائپرز لگوا کر رکھنے چاہئیں بروقت ضرورت کام آتے ہیں-''

وہ عینک کا قصہ لے کر بیٹھ گیا اور میں محض اس کا دھیان ہٹانے کے لیے اسے عینکوں سے متعلق لطیفے سنانے لگا-

اس رات دو بجے جب میں سر سے پیر تک شرابور ٹھٹھرتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو بھابھی کے علاوہ بھائی جان بھی میرے استقبال کے لیے جاگ رہے تھے بھلا ہوا اس بہانے کا جو میں پہلے ہی سے سوچ چکا تھا جان جلد چھوٹ گئی- میرے مطابق میں ایک نادار مریض کو ہاسپٹل لے جانے کا چارہ کرتا رہا تھا اس نیکی کے تصور سے ہی بھائی جان کا دل خوش ہوگیا-

میری شلوار قمیص استری کر کے مجھے فوراً پکڑائی گئی- دھلا ہوا گرم سوئیٹر بھائی جان کی گرم چادر عطا ہوئی- میرے کمرے میں واحد ٹوٹی راڈ کا ہیٹر لگا دیا گیا- گرم دودھ اور اسپرین ملی علاوہ گرم

کھانے کے-

اتنی سہولتوں سے لطف اٹھاتے ہوئے مجھے عزیز احمد کا خیال آیا- جس کا کوئی بہانا بھی کارگر ثابت نہ ہوسکا ہوگا کیونکہ ہر قسم کا بہانا اس کے گھر والوں کے لیے پرانا ہوچکا تھا- اس نے کھونٹی پر لٹکے جو کپڑے میسر آئے ہوں گے چڑھا کر ٹھنڈے بستر میں خالی پیٹ ہی جانے کی کی ہوگی- میں تو کسی وجہ سے نیکی کرنے چل پڑا تھا وہ بے چارہ تو میری مروت میں مارا گیا تھا جب ہی تو وہ راستہ بھر 'اسد بسمل ہے کس انداز کا' قاتل سے کہتا ہے' گنگناتا رہا اور اس پر مستزاد جو امیج میں نے اس لڑکی کا اس کے سامنے بنایا تھا وہ بھی بقول اس کے تباہ ہوگیا تھا یقیناً آج باقی کی رات وہ میری دوستی پر لعنت بھیجتے ہوئے گزارے گا اور کل سے مکمل قطع تعلق-

☆☆

لیکن اس کل کو شاید کبھی آنا ہی نہیں تھا جب عزیز احمد مجھ سے قطع تعلق کر لیتا' اگلے روز باوجود طبیعت سست ہونے اور نزلہ زکام کے حملے کے میں وقت پر کام پر پہنچ گیا- بل کاٹتے کاٹتے سر بھاری ہونے لگا اور اسی وقت عزیز احمد میرے پاس چلا آیا-

''طبع کی نازک مزاجیاں دیکھو اور کرنی عاشقیاں-'' اس نے مجھے ناک پر رومال رکھے دیکھ کر کہا- وہ کمال ڈھیٹ انسان تھا کہ برستی بارش اور یخ بستہ رات میں وہ لونگ مارچ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا-

''کیا بکواس ہے' کون سی عاشقی اور کہاں کی عاشقی' محض اخلاقی طور پر-'' میں نے اپنی خفت مٹانے کو کہنا چاہا-

''اخلاقی طور پر-'' وہ ہنسا ''یارا اوتھے کنے ای ہور دی سن جیہیاں نوں گھر جان دا وخت پیا ہویا سی اوتھے اخلاقی طور پر کم نہ آیا (یار ادھر کتنے ہی اور بھی تھے جنہیں گھر جانے کی مشکل پڑی ہوئی تھی ادھر تمہارا اخلاقی طور کام نہیں آیا-)'' میں خاموشی سے ناک پر رومال رکھے چھینکتا رہا-

''چھڈو مٹی پاؤ'' (چھوڑ مٹی ڈالو) خاموشی کو اسی نے توڑا ''میں بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ منفرد کچھ ہے ضرور غالباً اس کی گفتگو اور اس کی Appearence (ظاہری حالت) وہ واقعی اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی اور زبردستی چلے جانے پر گلٹی بھی فیل کر رہی تھی-'' اس نے فیصلہ دیا-

میں پھر بھی خاموش رہا-

''مان جاؤ ناں یار! کہہ جو دیا کہ تم غلط نہیں کہتے تھے-'' وہ میری خاموشی کو اپنے رات والے اسٹیٹمنٹ (بیان) پر خفا سمجھ رہا تھا-

''عزیز یار! مجھے معاف کر دے دل کے ہاتھوں مجبور میں ہوا تھا تو ایسے ہی مصیبت میں پڑ گیا- ساری رات میں تیرے لیے پریشان ہوتا رہا-'' میں نے رومال ہٹا کر سنجیدگی سے کہا-

"اوئے یار بھی کہتا ہے اور معافی بھی مانگتا ہے۔" اس نے چونک کر کہا۔

"مجتبیٰ حسین! میرے تمہارے تعلق میں معافی تلافی ناراضی صلح کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے' میں تم اور تم میں ہوں۔ جو عمل تمہارے لیے خوشی کا باعث ہو وہ میرے لیے مصیبت نہیں ہو سکتا۔ یہ بات پھر نہ کرنا۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا اور غالباً جذباتی بھی' میں خاموش تھا۔

"او چلو چلتے ہیں لنچ بریک میں پرانی انار کلی' دہلی والوں کی مشہور مچھلی کھاتے ہیں اور کشمیری چائے پیتے ہیں باداموں الائچیوں والی' سارا زکام وکام رفع ہو جاتا ہے منٹوں میں' ابھی ملے ہیں پیسے اسکرپٹ کے۔ رات والے واقعے کو منانے میں ہی اڑا دیتے ہیں کیا یاد کرو گے۔"

پھر اس نے ماحول کی سنجیدگی ختم کرنے کے لیے اچانک میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔

☆☆

اس واقعے کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد وہ میرے پاس آئی' اس روز اس کو نہ تو کتابیں دیکھنا تھیں نہ ہی خریدنا تھیں۔ دکان میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھی میری طرف آئی ساتھ میں اس کی وہی دوست بھی تھی۔

"ایکسکیوزمی' آپ فارغ ہیں؟" میری میز کے قریب آ کر اس نے آہستہ آواز میں دریافت کیا۔

"جی فارغ ہی ہوں۔" میں نے اپنے سامنے دھرا رجسٹر بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس روز کے بعد سے ہی یہاں آنے کی کوشش کر رہی تھی' مگر بیمار ہو جانے کی وجہ سے نہیں آ سکی۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "دراصل میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس روز ہم لوگ جلدی میں اندر گھس گئے' ہم بہت لیٹ ہو چکے تھے اور وارڈن کے ڈر کے علاوہ میرے ضمیر کی خلش نے بھی مجھے کچھ ڈھنگ سے کہنے کا موقع نہیں دیا' لیکن یقین کیجیے کہ میں تہہ دل سے آپ کی مشکور ہوں' آپ نے بڑی مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا' آپ جیسے لوگ بہت کم ملتے ہیں' خدا آپ کو آپ کی اس روز والی نیکی کا اجر ضرور دے گا۔"

میں نے اس کی باتوں سے زیادہ اس کی آنکھوں میں چمکتے پانی پر غور کیا۔ وہ واقعی وہی تھی میں نے سوچا تھا۔ سادہ معصوم اور صاف گو۔

"کس فارم میں؟" میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ "یہی اجر وغیرہ کس فارم میں ملے گا؟" وہ مسکرا دی۔

"جو آپ کے دل کی خواہش ہو گی' اس کی قبولیت کے فارم میں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نیکی' اجر' ثواب ہم انسان کیا سمجھ سکتے ہیں اس روز کا عمل انسانیت کا ایک تقاضا تھا اور میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا جو انسانیت کے تقاضوں سے واقف ہوتا تو آپ کو ضرور ہاسٹل پہنچا کر آتا۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی کوئی ہی ہوتا ہے جو انسانیت کے تقاضوں سے واقف ہوتا ہے اور شکر کا مقام ہے کہ ایسے کسی انسان سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ آپ کے مجھ پر دو احسان ہیں' ایک اس کتاب کا اور ایک اس رات کی مدد کا' شاید میں ان کا بدلہ چکا سکوں یا شاید نہیں۔ مگر آپ کو ہمیشہ دعا ضرور دیتی رہوں گی۔ بہرحال بہت شکریہ۔"

وہ ایڑیوں کے بل گھومی اور سرعت سے باہر نکل گئی۔ اس کی دوست نے حیرت سے اسے باہر جاتے دیکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر شانے اچکا دیے۔

"تھوڑی کریک ہے۔" اس نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر کہا اور اس کے پیچھے چلی گئی۔

اس روز اس کو آیا دیکھ کر مجھے یہ تو یقین تھا ہی کہ وہ شکریہ ادا کرنے آئی تھی مگر میرا یہ بھی خیال تھا کہ اس سے اس کے بارے میں کچھ تفصیلات کا علم ہو گا اس روز اس کے ہوسٹل جانے پر اس کے متعلق میرا ایک خیال تو غلط ہو ہی گیا تھا کہ اس کا گھر لاہور ہی میں ہے۔ مگر اس روز اس کے اس طرح گفتگو کا سلسلہ خود ہی شروع کر کے ختم کر دینے پر مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔

"یہ بھی کوئی تک ہے' بندہ بیٹھتا ہے' دو باتیں کرتا ہے' احسان مند انسان شکریے کے الفاظ تول تول کر تو ادا نہیں کرتا کہیں ایک آدھ چھٹانک کا اضافہ یا کمی کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتی۔" اس شام عزیز احمد کو سارا واقعہ سنانے کے بعد میں نے کہا۔

"Point to ponder" (قابل غور نقطہ) اس نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ یہ کہ اس روز اس کو علاوہ دیگر باتوں کے ضمیر کی خلش نے بھی کچھ کہنے کا موقع نہ دیا' یار مجتبیٰ حسین یہ ضمیر صاحب جو ہیں نا' ان کے بارے میں مجھے پکا یقین ہے کہ یہ کہیں کہیں ہی زندہ رہ گئے ہیں اور ان کا تذکرہ تو سمجھو بالکل ہی Decadent (فرسودہ) ہو چکا ہے۔"

لیکن یہ اتفاق تھا یا پھر شاید میری قسمت کہ اس روز کے بعد وہ مجھے کہیں نظر آئی۔ ایک ماہ' دو ماہ' تین ماہ گزر گئے۔ اسے کتابیں خریدنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی' یا پھر شاید وہ کسی اور جگہ سے کتابیں خرید لیتی تھی۔ مگر بازار میں گھومتے پھرتے' کسی ہوٹل میں کسی سینما ہاؤس میں کہیں بھی اس کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان دنوں میں مجھے ایسا لگتا جیسے کوئی چیز مجھ سے چھن گئی ہو' ایک سے بہاؤ پر تیرتی زندگی میں ہلچل کا ایک احساس' بند کمروں کے ماحول جیسی زندگی میں تازہ ہوا کا جو جھونکا میری سانس سے ٹکرایا تھا دفعتاً مجھ سے جدا ہو چکا تھا۔ میں...... شعوری طور پر اس کا منتظر رہنے لگا تھا۔ انتظار کے بے سود ہو جانے پر گھبرا سا گیا۔ اپنی سیٹ بصد منت کسی اور کو دے کر جلد اٹھ آتا اور پاگلوں کی طرح اس چہرے کو تلاش کرتا مال روڈ سے جیل روڈ تک کا سفر میرا روزانہ کا معمول بن گیا۔ کینئرڈ کالج کے سامنے میں گھنٹوں کھڑا رہتا' وہ جو رنگ برنگے ملبوسات اور نت نئے فیشن سے مزین لڑکیوں کا ایک اژدھام چھٹی کے وقت پر وہاں سے چہکتا نکلتا تھا میں اس میں اس

چہرے کو کھوجتا رہتا مگر اس رنگ برنگے ہجوم میں کوئی سادہ معصوم' ریا سے پاک چہرہ مجھے نظر نہیں آتا تھا- میں اس کا نام نہیں جانتا تھا' اس کا رول نمبر اس کی کلاس اس کے مضمون میں کچھ نہیں جانتا تھا- مگر گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے اکثر اس کا حلیہ بتا کر دریافت کرتا-

''اس طرح کی کوئی لڑکی یہاں رہتی ہے بابا؟''

وہ شاید مجھے عقل سے پیدل سمجھ کر ہنس دیتا تھا یا پھر شاید ہنسنا اس کی عادت تھی' مگر میں برا نہیں مانتا تھا میں جس کیفیت سے گزر رہا تھا- اس کے اظہار پر لوگوں کا حیران ہونا اور ہنسنا ایک فطری عمل تھا-

عزیز احمد مجھ پر چھا جانے والی اس کیفیت سے سخت گھبرا گیا-

''اوئے مجتبیٰ! تجھے کیا ہو گیا ہے؟'' وہ اکثر کہتا ''یار! اس قسم کی حرکتیں تو وہ کرتے ہیں جو جذباتی ہوتے ہیں- جذبات کے غلام اندھے جن پر کوئی کیفیت ایک مخصوص وقت کے لیے آتی ہے پھر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں' یار! اگر تجھے اس لڑکی سے کوئی لگاؤ ہو گیا ہے تو اس کیفیت کو اندھی جذباتیت کا رنگ تو نہ دے- ان لوگوں میں سے بن جو عمر بھر کسی ایسے احساس کی پاسداری کرتے ہیں' جو اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنے احساس کو سنبھال سکیں' خدا کے واسطے یار خود کو میری نظروں میں گرنے سے بچا لے-'' اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا-

''تم ہو ہی ہمیشہ کے لیے Exapiest (فراریت پسند)'' اس نے سر ہلایا-

''کوئی بہانا چاہیے تمہیں زندگی کے معمولات سے فرار کا' اپنے کام پر تم نہیں جاتے دل نہیں لگتا' کھانا تم یوں کھاتے ہو جیسے بیگار کاٹ رہے ہو' وجہ یہ کہ دل نہیں چاہتا- بھائی اور بھابھی کے جوتے کھاتا ہے صرف اس لیے کہ کمانا چھوڑ دیا ہے اور کھا کر خاموش رہتا ہے' وجہ یہ کہ جواب دینے کو دل نہیں چاہتا' کہیں جانے کی بات کرو' کسی تفریح کسی سے ملنے کا نام لو تو جواب وہی کہ دل نہیں چاہتا- دل ہے کہ کوئی نو ایجاد شدہ مشین جس کا کنٹرول کسی دوسرے بندے کے ہاتھ میں ہے' وہ بٹن دبائے گا تو کام کرنے لگے گا بند کر دے گا تو کام بند ہو جائے گا' ارے میاں مجتبیٰ حسین! زندگی صرف یہ ہی تو نہیں' زندگی کا خاتمہ یہاں ہی تو نہیں ہو گیا' کیا اس کے نظر آنے سے پہلے تم زندگی نہیں گزار رہے تھے جو اس کے جانے کے بعد یوں بیکاروں کی طرح بیٹھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر آنے جانے والے کا چہرہ دیکھتے رہتے ہو- بھائی میرے' اگر تمہارا جذبہ سچا ہوا تو وہ ضرور تم کو کہیں مل جائے گی' وہ خود نہیں کہتی تھی کہ تمہاری نیکی کا بدلہ تمہاری کسی خواہش کی قبولیت کی شکل میں تمہیں مل جائے گا- ہو سکتا ہے تمہاری نیکی کا اجر وہی ہو جو کبھی تمہیں ملے- سو مختصراً مجتبیٰ حسین! اٹھو کمر باندھو' زندگی کی روانی میں رواں ہو جاؤ اور انتظار کرو اگر وہ سراب نہیں تو تم کو ضرور ملے گی-''

عزیز احمد کو غالباً تحریر ہی کا نہیں تقریر کا فن بھی آتا تھا- اس کی تقریر نے واقعی مجھے دوبارہ سے زندگی کی

روانی میں رواں ہونے کا خیال دلا دیا- اور جب یہ خیال آیا تو مجھے علم ہوا کہ زندگی پھر سے اپنی پرانی روٹین پر آ چکی تھی- میرے روز روز کے ناغوں نے بک سیلنگ کے کام سے میری چھٹی کرا دی تھی اور میں پھر سے بھائی جان کا دست نگر اور بھابھی کی کڑوی کسیلی باتوں کا نشانہ بن چکا تھا-

''اب پھر میں کیا کروں؟'' میں نے گھبرا کر عزیز احمد سے پوچھا-

''کرنا کیا ہے نوکری ڈھونڈ مگر ڈھنگ سے-'' اس نے اطمینان سے جواب دیا-

''نوکری ڈھونڈوں-'' میں ہنسا ''تمہیں مل گئی ہے جو مجھے ملے گی-''

حالانکہ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ پہلے والی نوکری کے لیے منتیں بھی کرنا پڑیں تو کر لوں' بلا سے تھوڑا ملتا تھا' مگر اس کے وہاں کتابیں خریدنے کے لیے آنے کا امکان تو بہرحال رہتا تھا-

''میری اور بات ہے' میرا تو ذہن ہی نہیں اس طرح تم کر سکتے ہو کوشش کرو-'' اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا- ''کوشش جو ایک عرصہ ہوا' تم نے کرنی چھوڑ دی ہے-'' وہ صحیح کہہ رہا تھا

''اخبار دیکھو' اشتہار دیکھو' انٹرویو دو' محنت کی طرف آؤ- ابھی تمہارے پاس وقت ہے-''

میں نے اس کے کہے پر عمل کیا ان ہی دنوں لیکچرشپ کے لیے اشتہار آیا- یہ محض اتفاق تھا کہ میرے سبجیکٹ کے لیے بھی ایک آسامی تھی- عزیز احمد نے دن رات محنت کر کے مجھے انٹرویو کے لیے تیار کیا اور غالباً اس کی ہی محنت کا نتیجہ تھا کہ میں انٹرویو میں کامیاب ہو گیا اور میں اپنے ہی کالج میں انگلش کا لیکچرر لگ گیا- یہ ان دنوں بہت بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی- مجھے یاد ہے کہ بھابھی نے سارے محلے میں گڑ کی ریوڑیاں بانٹی تھیں اور عزیز احمد کو تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی- معلوم نہیں وہ یہ سب کچھ اپنے لیے کیوں نہیں کرتا معلوم نہیں وہ خود کو اپنے پر خوش ہونے کا موقع کیوں نہیں دیتا تھا- اسے اپنے لیے شاید کوئی غرض نہیں تھی- وہ جوتے چٹخاتے اعلا اور معیاری ڈرامے لکھنے ان کے مسترد ہو جانے پھر عام اسکرپٹ لکھ کر اپروو کروانے' ضرورت کے چند پیسوں اور اپنے باپ کی گالیوں کا عادی ہو چکا تھا- اس کے بقول اس منظر سے ہٹ کر اس کے لیے زندگی کا مفہوم بدلنے لگتا تھا- مگر اب میرا خیال ہے کہ وہ ایک ہی جست لگا کر چاند تک پہنچ جانے والوں میں سے تھا- اب کے عزیز احمد اور اس کی زندگی کو دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ پہلے اس شخص کی زندگی کیا تھی-

مجھے لیکچرشپ ملنے پر اس نے اپنے پلے سے مجھے لارڈز میں کھانا کھلایا' مولا بخش کا پان کھلایا اور پھر اس روز رات گئے تک لارنس گارڈن میں گھومتے ہوئے ہم نے خاموش مکالمہ کیا- وہ مجھے زندگی کے اصول سکھا رہا تھا- زندگی کو مروجہ طریقے پر گزارنے کا گر بتا رہا تھا اور میں سیکھ رہا تھا سن رہا تھا پھر اچانک ہماری گفتگو اسی موڑ پر آ گئی جس سے میں بچنا چاہتا تھا-

''ایک وعدہ کرو مجتبیٰ!'' اس نے اچانک باآواز بلند کہا- میں جانتا تھا کہ وہ کیا وعدہ لینا چاہتا ہے

اسی لیے فوراً بولا ''نہیں کرسکتا۔''

مگراس میں کوئی مشکل بھی نہیں۔''

''ہے مشکل عزیز احمد! بڑی مشکل ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''یہ روز روز نہیں ہوا کرتا کہ آپ کو کوئی شخص' کوئی چہرہ اتنا اچھا لگے کہ آپ اس کے تصور میں کھو جائیں خواہ اس کا نام پتا معلوم نہ ہو' روز روز پسند آنے والے اور پھر بھول جانے والے چہرے ہزاروں ہوتے ہیں اور یہ ایک نارمل بات ہے۔ میرا معاملہ ذرا ایب نارملٹی abnormality (غیر معمولی) والا ہے۔ میں ایک بالکل عام انسان ہوں' مگر میری مجبوری ہے کہ مجھے بہت کم مگر بہت خاص چیزیں اچھی لگتی ہیں اور ان ہی خاص چیزوں میں اس لڑکی کا چہرہ اس کا تصور بھی شامل ہے جو کسی بہت ہی خاص وقت میں مجھے نظر آیا' اور خاص اس وقت میں اس کے نظر آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ میرے تصور میں براجمان ہو جائے۔ کچھ باتیں شدنی ہوتی ہیں نا۔ ہو کر رہتی ہیں' یہ واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ میں ضرور زندگی میں زندگی کے ہنگاموں' فکروں' غموں اور خوشیوں میں مصروف رہتا ہوں۔ سماجی تعلقات' معاشی مسائل اور اپنے فرض' اپنی ذمہ داری کی بجا آوری اپنی جگہ پر مگر ان سب سے نمٹ کر جب میں رات کو سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹتا ہوں تو وہ چہرہ اور اس کا تصور' اس کی آواز اس کی کہی باتیں خود بخود میرے تصور میں اتر آتی ہیں۔ اس وقت میں اپنی چارپائی کی چوں چوں سے چھت کے ادھڑے پلستر سے' ساٹھ کے بلب کی مدھم اور زرد روشنی سے چوکیدار کے ڈنڈے کی ٹھک ٹھک ہر ایک چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہوں ان سب چیزوں سے پہلے میں الجھن اور کوفت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اب اس تصور کی آمد کے ساتھ ہی ان چیزوں سے بھی مجھے سرور اور خوشی کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ خدا کی قسم! عزیز احمد یہ تصور اتنا ہی جان دار اور خوش کن ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں عام انسان ہوں اور یہ جذبہ' یہ کیفیت میرے ظرف سے بڑی ہے۔ مگر یہ یقیناً میرے لیے uncontrolable ہے (ناقابل برداشت) it simply cant help / (میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔)''

میں نے کہتے کہتے رک کر لیمپ پوسٹ کی روشنی میں اسے دیکھا۔ وہ غور سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون اور سنجیدگی تھی۔

''مجتبیٰ! یہ بالکل یک طرفہ کیفیت ہے۔ لیکن پھر بھی میں تم کو الزام نہیں دے سکتا' ایسا کبھی کبھار ہو جایا کرتا ہے۔ مگر یاد رکھنا کہ یہ ایک کھیل ہے جس کو ہم محبت یا عشق وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں اور کھیل بھی ایسا جس کو روگ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔''

وہ کہہ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ درست کہہ رہا تھا مگر واقعی کچھ احساس ہمارے اختیار میں نہیں ہوتے۔ وہ بس ہو جاتے ہیں میرا احساس بھی ایسا ہی تھا' یہی وجہ تھی کہ پچھلے کئی ماہ سے مسلسل

سرگرداں رہنے کے اور اس کو تلاش کرنے میں ناکامی کے باوجود میرے احساس کی شدت ختم ہوئی تھی نہ ہی کم ہوئی تھی۔

☆☆

اور پھر غالباً اس احساس کی شدت ہی تھی کہ مہینوں پر مہینے گزر جانے کے بعد وہ مجھے ایک بار پھر نظر آ گئی۔ اس روز برٹش کونسل کی طرف سے شیکسپیئر کا کوئی ڈرامہ غالباً as you like it دکھایا جا رہا تھا۔ انگلینڈ سے آئے ہوئے کسی ڈرامیٹک سوسائٹی کے فنکار اس کو اسٹیج کر رہے تھے' مجھے وہاں اپنے چند اسٹوڈنٹس کے ساتھ جانا تھا۔ میں ایسی جگہوں پر عزیز احمد کے بغیر جانے کا عادی نہیں تھا' مگر پروفیسر سراج کا آرڈر تھا' مجھے جانا ہی پڑا اور اس روز غالباً پہلی بار میں اس بات کا قائل ہوا کہ پروفیسر سراج کی کہی بات کا احترام کتنی افادیت کا حامل ہو سکتا ہے۔

جب میں اپنے اسٹوڈنٹس کے سات برٹش کونسل پہنچا' میری نظر جس چہرے پر سب سے پہلے پڑی' وہ وہی چہرہ تھا جس کو میں بقول اپنے سے برسوں سے تلاش کر رہا تھا۔ وہ بھی اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ کے درمیان کھڑی تھی اور ظاہر ہے کہ سب سے منفرد اور نمایاں نظر آ رہی تھی (کم از کم مجھے) پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ دو ایک بار اس کی نظر مجھ پر پڑی مگر میں اس نظر میں شناسائی کی چمک نہ پا سکا' میں ذرا اور قریب ہوا' اب کے اس کی نظر پڑنے پر مسکرا بھی دیا۔ اس نے اچانک نظر جھکا لی اور پھر اپنی دوستوں کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اندر خالص شیکسپیئرین تھیٹر کا سا ماحول بنانے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ میرے اسٹوڈنٹس اپنے اپنے کسی شناسا کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ مجھے اپنی اس شناسا کے عین پیچھے جگہ مل گئی۔ ڈراما شروع ہو چکا تھا۔ مدھم موسیقی کے ساتھ شیکسپیئرین ڈرامہ اپنے مخصوص طرز پر جاری تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے کسی وجہ سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو میں لاشعوری طور پر کہہ بیٹھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو غالباً یاد نہیں آیا۔ میں مجتبیٰ حسین ہوں' آپ نے کئی بار مجھ سے کتابیں خریدی تھیں اور ایک بار برستی بارش میں۔''

''او ہاں!'' اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی سوچ رہی تھی کہ آپ دیکھے دیکھے سے کیوں لگ رہے ہیں' ارے! کیا حال ہے آپ کا' اب تو آپ وہاں نہیں ہوتے۔ میں کئی بار گئی پچھلے دنوں آپ تو غالباً وہاں نہیں تھے۔''

''مجھے دراصل جاب مل گئی' لیکچرر شپ گورنمنٹ کالج میں' وہ کام تو عبوری عرصہ گزارنے کے لیے شروع کیا تھا۔'' میں ہلکی آواز میں بولا۔

''اوہ آئی سی' آئی سی۔'' اس نے سر ہلایا ''یہ تو بہت اچھا ہوا' مگر بھئی وہاں تو آپ کی کمی بہت

محسوس ہو گی۔ آپ کو کتابوں کی خاصی پہچان تھی اور کتاب کے نایاب ہونے پر آپ اپنے پاس سے بھی دے دیا کرتے تھے۔''

ایسا لگتا تھا جیسے اسے ڈرامے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اسی لیے اس نے مجھ سے گفتگو کو غنیمت جانا تھا۔ اس کی دیگر ساتھی غرق تھیں ڈرامے میں۔

''چلیں آزما کر دیکھ لیں۔ کیا پتا' نیا آنے والا بھی ایسا ہی ہو ویسے جب تک میں وہاں رہا' آپ کافی عرصہ نہیں آئیں۔'' میں دل کی خلش زبان پر لے آیا۔

''ہاں وہ دراصل ہم لوگ سیکنڈ ایر کے ایگزام کے بعد فارغ تھے نا' اب رزلٹ کے بعد آئے ہیں تھرڈ ایر میں آتے ہی یہ ڈرامہ پلے پڑ گیا' مجھے شیکسپیئر نا قابل ہضم لگتا ہے۔''

under the green wrod tree who loves to lie with me And trun his marry Throat Unto the Sweet bird`s note come hither,come hither come

ایک فنکار لہک لہک کر گا رہا تھا۔ میں اس کی بات کے تناظر میں ہنس دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔

''شی شی چپ کرو' پلیز کیپ کوائیٹ تھینک یو۔'' آگے پیچھے سے آوازیں آنے لگیں' ہم دونوں نے یکدم خاموش ہو کر سر جھکا لیے۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد ہم دونوں اکٹھے باہر نکلے۔

''اچھا حسین صاحب! اللہ حافظ' اب ہمیں ہوسٹل واپس جانا ہے۔'' اس نے مڑ کر نہایت شائستگی سے کہا۔ وہ گرما کی ایک نسبتاً خنک شام تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے اس زمانے کے فیشن کے مطابق تنگ پائنچوں اور کھلے گھیر کی سفید شلوار پر آسمانی قمیص پہن رکھی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے آسمانی ململ کا چنا ہوا ڈوپٹہ کھول کر سر پر جماتے ہوئے اردگرد لپیٹا۔ اس کی لمبی چٹیا ہمیشہ کی طرح پیچھے جھول رہی تھی۔ ڈوپٹے کے ہالے میں اس کا معصوم چہرہ مزید معصوم اور سادہ لگنے لگا۔ وہ یقیناً اپنی ساتھی لڑکیوں سے مختلف تھی اور غالباً بہت پرکشش بھی۔ کم از کم مجھے تو یونہی محسوس ہوا تھا۔

''خواہ مخواہ اتنا عرصہ جوتیاں چٹخا کر زندگی برباد کرتے رہے' یہ تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ وہ امتحان دینے کے بعد گھر بھی جا سکتی ہے' انتہائی عقل سے پیدل شخص ہو تم بھی۔'' عزیز احمد نے اس شام میری بات سن کر کہا۔

''تمہارے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ میں خود بھی عقل سے عاری ہوں۔'' اس کا انداز فخریہ سا تھا۔ ''چلو ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ تم جو گندے جوہڑ کے ٹھہرے پانی کی طرح بک سیلنگ سے چمٹ کر بیٹھ گئے تھے وہاں سے اسی بہانے ہلے تو۔'' وہ مسکرایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میری یہ کیفیت حماقت نہیں' بلکہ ایک طرح سے خوش قسمتی کی علامت ہے' یہ نہ ہوتی تو میں اب بھی کتابوں کی لسٹیں بنا اور بل کاٹ رہا ہوتا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں' اب تو میں بھی واقعی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ کوئی ایسا چہرہ نظر آ جاتے جو مجھے بھی ریڈیو اسٹیشن کے نت نئے اسٹوڈیو کے چکروں اور پروڈیوسرز کی منتوں کے ناپسندیدہ فعل سے نکال کر کہیں ایسی جگہ لے جائے جہاں میں اپنی مرضی سے کام کر سکوں۔'' اس نے غالباً پہلی بار کی کہی بات با آواز بلند کہی تھی۔

''چہرہ نہیں معجزہ کہو۔'' میں نے تصحیح کی۔

''معجزہ کیا بلکہ شفیق الرحمان کے شیطان کا تعویذ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔'' وہ ہنس دیا۔ اس روز ہم خوش تھے' بہت خوش۔ میری خوش ہونے کی تو ایک وجہ تھی مگر عزیز احمد بلاوجہ خوش تھا شاید میری خوشی میں خوش تھا۔

اس روز اس نے اپنا معروف ترین ڈرامہ ''بازگشت'' لکھنا شروع کیا۔ اس کا یہ ڈرامہ بعد میں ریڈیو کی تاریخ کا ایک اہم ڈرامہ بنا اور اسی کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی' وہ شہرت جو اسے بی بی سی لے آئی۔ معلوم نہیں اس چہرے کا نظر آنا برکت کا باعث تھا یا نہیں مگر مجھے نجانے کیوں ایسا یقین ہوتا جا رہا تھا۔

اگلی بار میں نے اس کو اپنے کالج ہی کے ڈیبیٹس ویک میں دیکھا۔ وہ کنیئرڈ کالج کی طرف سے اردو اور انگریزی مباحثے میں شرکت کر رہی تھی۔ اس کو بظاہر دیکھنے پر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا زیادہ اور اتنا اچھا بھی بول سکتی ہے اور اس بار اس کے نظر آنے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر خود میری طرف آئی تھی۔ میرے اسٹوڈنٹس مجھے۔ السلام علیکم سر کہتے گزر رہے تھے اس نے بھی قریب آ کر مجھے۔

''السلام علیکم سر'' ہی کہا۔

''آپ کیسے ہیں؟ اس روز آپ نے بتایا تھا کہ آپ یہاں ہوتے ہیں تو میرا خیال تھا کہ آج آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔''

اس روز وہ اعتماد کے ساتھ با آواز بلند گفتگو کر رہی تھی اور اس سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ اس کا خیال تھا میں اسے وہاں ملوں گا' اس نے میرے بارے میں سوچا تو اس کو خیال ہوا کہ میں وہاں اسے ملوں گا' میرا دل خوش ہو گیا۔

''کیا پوزیشن ہے اندر' مقابلہ تو خاصا سخت ہوگا۔'' اس نے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بھی تو تیاری کی ہوگی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جی تیاری تو کی ہے' مگر مقابلہ بہت سخت ہے۔'' اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"آپ کو بظاہر دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ آپ ڈیبیٹر بھی ہو سکتی ہیں-" میں نے محض بات کرنے کی لیے یہ بات کی-

"جی- میں خود بھی اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ میں ایک ڈیبیٹر بھی ہو سکتی ہوں یہ تو ہماری ٹیچر-" اس نے پیچھے گردن کرتے ہوئے اپنے کالج کی لڑکیوں اور ٹیچرز کو دیکھتے ہوئے کہا' کا اندازہ تھا' سو میں آج یہاں ہوں- پہلا پہلا تجربہ ہے- اس لیے بڑا خوف آ رہا ہے- آپ پلیز کبھی کبھار کلیپ کر دیجیے گا-" اس نے ملتجیانہ سے انداز میں کہا اور پیچھے مڑ گئی-

مجھے ہنسی آ گئی- وہ یقیناً اچھی ڈیبیٹر نہیں تھی جب ہی تو اس قدر گھبرا رہی تھی- یہ میرا اندازہ تھا- مگر ہال کے اندر اس کی تقریر سننے کے بعد میرا کیا' ہال میں موجود بہت سے لوگوں کے اندازے غلط ہو گئے-

"عائشہ نیازی فرام کنیئرڈ کالج اگیسنٹ دی ٹاپک-"

اس کا نام اناؤنس ہوا- عائشہ نیازی یہ اس کے نام سے میرا پہلا تعارف تھا-

(بڑھاپے کی آمد پر حس مزاح ختم ہو جاتی ہے-)

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس سال انگلش ڈیبیٹ کا موضوع یہ تھا اور عائشہ نیازی فرام دی کینئرڈ کالج ایک کے بعد ایک نکتہ اٹھاتے ہوئے موضوع کی دھجیاں اڑا رہی تھی- ہال میں اس کے بولنے کے دوران ایسا سناٹا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دی جا سکتی تھی-

"زندگی کے ہر پہلو کی دلکشی مقصد کے ساتھ منسلک ہے' مقاصد زندگی کا اہم ترین جزو ہے' بچے کا مقصد' نوجوان کا مقصد' اور بوڑھے شخص کا مقصد' ان تینوں ادوار کے مقاصد کی نوعیت میں فرق ضرور ہو سکتا ہے مگر اس بنیادی لفظ مقصد کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا- جینے کا حوصلہ مقصد ہی پیدا کرتا ہے' زندگی میں روانی اور خوشی کا احساس بھی مقصد ہی پیدا کرتا ہے- اس کے حصول کی تگ ودو زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے تو زندگی سے دلکشی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا- عمر کو خود پر طاری کر کے کوشش قسم کی حس ختم ہو جاتی ہے- مقصد کا فقدان بڑا ظالم ہوتا ہے- چہروں کو خالی اور ہنسی کو کھوکھلا کر دیتا ہے- بڑھتی عمر کے آگے ہتھیار ڈال دینے والے ہی نہیں بلکہ عمر کی کسی بھی حصے میں مقصد کے حصول میں ناکامی کا منہ دیکھنے والے بھی مزاح سے عاری ہو جاتے ہیں- اس کے برعکس وہ لوگ بھی ہیں جو آخری سانس تک زندگی کی گہما گہمی میں اپنی موجودگی کو محسوس کرتے اور کرواتے ہیں اور ایسے ہی لوگ معاشرے کے لیے اچھے مزاح نگار' مزاحیہ فنکار' اور سب سے بڑھ کر مزاحیہ انسان کہلانے کے قابل ہیں' ان کے دل کی امنگ اور مقصد کی لگن کبھی ختم نہیں ہوتی اور اسی نکتے کے بنا پر میں آج کی قرارداد کو مسترد کرتی ہوں-"

اس کی تقریر کا یہ آخری حصہ بہت عرصے تک میری ذہن میں محفوظ رہا اور آج پھر سے یاد آ گیا- وہ اپنی بات ختم کر کے تالیوں کی زبردست گونج میں رخصت ہو رہی تھی- سفید شلوار پر ہلکی گلابی

قمیص اور جالی کے گلابی ڈوپٹے سے سر ڈھانپے وہ ہمیشہ کی طرح معصوم لگ رہی تھی- تالیوں کی آواز نے یقیناً اس کو خوش کر دیا تھا- اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا- نیچے آتے پر اس کی مخصوص دوست نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا- اس روز ٹرافی کنیئرڈ کالج جیت گیا تھا ویسے یہ ان کی روایت سی بھی بن چکی تھی- مگر اس روز میں نے بہت سے لوگوں کو خصوصاً اس کی تقریر اور اس کے بولنے کے انداز کی بے حد تعریف کرتے ہوئے سنا-

"اے لاٹ آف تھنگز ور ناٹ سو ان کامن' بٹ شی ہر سیلف واز اے لٹل ڈفرنٹ-" یہ پروفیسر سراج کا کمنٹ تھا جو ناقابل تردید تھا-

(اس کا انداز اور اس کا الفاظ کے استعمال کا طریقہ مختلف تھا- الفاظ مختلف نہیں تھے)

انہوں نے کہا-

کالج سے باہر نکل کر میں نے اس کو پچھلی سائیڈ سے انارکلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا- میں بلا ارادہ اس کے پیچھے چل دیا- اس کے ساتھ اس کی وہی دوست تھی-

"ارے آپ؟" وہ مجھے دیکھ کر ہنسی-

"جی میں آپ کو مبارکباد دینے آیا تھا' مگر ٹرافی جیت کر تو آپ کو کالج جانا چاہیے تھا تا نہ کہ ادھر-" میں نے بھی مسکرا کر کہا-

"ہمیں بازار میں ایک کام تھا' ہم نے مس سے بہت مشکل سے اجازت لی ہے' کچھ ہی دیر کے بعد ہمیں کالج پہنچنا ہے-" اس نے دوپٹہ سر پر جماتے ہوئے کہا-

"کچھ دیر بعد کیا' اب آئے ہیں تو پھر جب جی چاہا چلے جائیں گے-" دوست منمنائی-

"ہرگز نہیں' ہم نے مس سے وعدہ کیا ہے اور ہم کو ہر صورت جلدی واپس پہنچنا ہے-" اس نے سختی سے کہا- "شکریہ سر' آپ کی مبارکباد کا میں نے اپنی تقریر کے دوران آپ کو کلیپنگ (تالیاں) کرتے دیکھا- آپ نے میری درخواست مان کر مجھ پر ایک تیسرا احسان کیا ہے-" اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھیں اٹھا کر کہا اور پھر اپنی گھنی لمبی پلکیں جھکا کر آگے کو چل دی- سیاہ لمبے بالوں کی چٹیا حسب معمول پیچھے جھول رہی تھی- اس کے چلنے میں بھی عجیب سا وقار تھا- وہ ناخالص اشیاء کے دور میں ایک خالص چیز محسوس ہوتی تھی- میرے اردگرد چیاؤں پیاؤں کرتی گزرتی لڑکیوں سے منفرد اور بلند-

اس شام دن کی روداد میں نے عزیز احمد کو پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے سنائی-

"ایک عجیب بات یہ ہے عزیز احمد کہ کسی نے اس پر آوازہ کسنے کے سے انداز میں اس کی تعریف نہیں کی جبکہ کالج کے ماحول کے برعکس بہت سے ایسے لوگ بھی وہاں موجود تھے لیکن وہاں بہت احترام کے ساتھ اس کی تعریف کی جا رہی تھی-"

''گویا وہ سینٹ (ولی) قسم کی کوئی چیز ہے۔'' عزیز احمد اپنے کبھی کبھار عود کر آنے والے مسخرے پن سے بولا ''مگر مجتبیٰ! کیا تم نے واقعی اس کی تقریر اتنے غور سے سنی تھی کہ اتنی زیادہ یاد رہ گئی۔ بمعہ درست انگریزی کے۔'' اس نے سگریٹ کی راکھ پرچ میں گراتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے جب ہی تو یاد رہ گئی۔'' میں نے کہا میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر اسی دوران عزیز احمد کے اپنے خاص ادبی حلقے کے کچھ لوگ اندر داخل ہو کر ہماری میز کی سمت آ گئے اور پھر ان سے ادبی موضوعات پر گفتگو ہونے لگی مجھے بہت دن بعد اس گفتگو میں شامل ہونے کا موقع ملا تھا اس لیے میں بھی ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ دیکھیں جی' قاسمی صاحب نے تازہ تازہ فرمایا ہے۔'' ان میں سے ایک نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر کھولتے ہوئے کہا۔

''بہت حسین تھی۔''

مجھے خدا کی قسم' وہ لڑکی بہت حسین تھی!
وہ اپنے باطن کے حسن سے اس قدر منور تھی
اتنی روشن تھی
اور پھر اتنی باخبر تھی کہ اپنے ذہن وضمیر کے اس جمال کو
اپنے سیدھے سادے سے' بھولے بھالے سے قدسیوں کے سے
خال وخد میں چھپائے رکھتی تھی
لیکن اس کی جمیل سوچوں سے جب شعاعیں سی پھوٹتی تھیں۔
تو اس کی آنکھوں میں تارے سے جھلملانے لگتے تھے
اور سارے نقوش یوں جگمگانے لگتے تھے
جیسے سورج کے نور باطن سے
کائنات حیات زرپوش ہو رہی ہو!

ہم سب انتہائی توجہ سے قاسمی کی تازہ نظم سن رہے تھے۔ میں نے ان الفاظ کو اپنے احساس کا ایک سچا عکس محسوس کیا۔ نظم سنانے والے نے صفحہ پلٹا اور ایک لمحہ ٹھہر کر پھر گویا ہوا۔

خدا جو تخلیق حسن کی انتہا پہ قادر ہے
وہ' جو اس انتہا پہ قادر ہے
وہ جو باطن کا عکس ظاہر پہ ڈالتا ہے تو معجزوں کی انتہا ہوتی ہے
حسن کا رازل بھی ہے
حسن کا رابد بھی ہے
حسن اس کی جملہ صفات کا ایک ایسا عنواں ہے
جس کے ایک ایک حرف سے وہ حسین
وہ بے حساب حد تک حسین
وہ حسن جذبہ وآرزو کا ایک شاہکار لڑکی
ثبوت حق بن کر جھانکتی تھی!

میری نظریں اچانک عزیز احمد کی نظروں سے ٹکرائیں
وہ حسن جذبہ وآرزو کا ایک شاہکار لڑکی ثبوت حق بن کر جھانکتی تھی
میں نے دل میں دہرایا

''سینٹ قسم کی چیز کچھ نہیں عزیز احمد! ثبوت حق' ثبوت حق۔'' میں نے عزیز احمد سے اپنی مخصوص فریکوئنسی قائم کرتے ہوئے کہا۔

''چلو تم کہتے ہو تو یہ بھی مان لیتے ہیں۔'' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''میرے خیال سے اس کے لیے تمہارے ذہن میں بڑے بڑے الفاظ ہی آتے ہیں۔''

شاید یہ قلبی وارداتیں ہوتی ہی کچھ اس طرح کی ہیں کہ جو دل کو اچھا لگنے لگے' اس کے لیے ذہن میں بڑے بڑے الفاظ ہی آئیں' میں یہ اسرار سمجھ نہیں سکا۔ مگر اس دن کے بعد سے عزیز احمد اس کا ذکر آنے پر اس کا نام لینے یا کسی اور نام سے بلانے کے بجائے ''مجتبیٰ یار! وہ تمہاری ''ثبوت حق'' کہہ کر بلاتا اور مجھے خود بھی ان دنوں ایسا لگتا جیسے احمد ندیم قاسمی نے یہ نظم اس لڑکی عائشہ نیازی ہی کو دیکھ کر لکھی تھی۔

اس کے بعد بہت دن تک وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ اب کوئی ایسی خاص جگہ تو تھی نہیں جہاں اس کے مل جانے کے سو فیصدی امکانات موجود ہوتے' ہاں' اس سال میں نے سارے گرلز اور بوائز کالجز میں ہونے والی انٹر کالجیٹ ڈیبیٹس کی رپورٹس ضرور کھنگالی تھیں شاید کہیں اور بھی اس نے اپنی آواز وگفتار کے جوہر کھلائے ہوں۔ مگر وہ شاید ایک مرتبہ ہی میں خود کو منوا کر ایک طرف ہو جانے والوں میں سے تھی۔ میری اپنی پوزیشن اب مختلف تھی۔ میں اپنے کندھوں پر ایک نئی ذمہ داری محسوس کرتا تھا۔ علم بانٹنے کی ذمہ داری' اب میں ایک استاد تھا' طالب علم نہیں' طالب علمی کے زمانے میں ہر کام جائز لگتا ہے۔ بے فکری اور عیاشی کا زمانہ جہاں کوئی بھی کام نتائج و عواقب کی پرواہ کیے بغیر محض جذبات میں آ کر اندھا دھند سرانجام دیا جا سکتا ہے' نہ ہی اب میں ایک فکر معاش میں جکڑا بے کار انسان تھا' جو سارا سارا دن بل کاٹنے اور کتابوں کو ترتیب دینے میں گزار کر رزق کے نام پر چند سو روپے جیب میں ڈال کر مطمئن ہو جاتا تھا اس دور میں میں کسی کی نظروں میں نہیں تھا' اسی لیے ایک چہرہ نظر آنے' پھر اسے نظر میں بٹھا لینے اور اس کے جنون میں

مقید ہو جانے کی عیاشی کا متحمل ہو سکتا تھا- اس کی تلاش میں سرگرداں ہونا اور کالج کے گیٹ تک پہنچ جانا بھی کچھ اتنا گراں نہیں گزرتا تھا-

مگر یہ زمانہ اور تھا' اب میں سکھانے والا تھا' راستہ دکھانے والا تھا' نظام بیان کرنے والا اور مستقبل بنانے والا تھا- میری اپنی نظر میں شروع سے ہی استاد کا مقام بہت بلند تھا اور اب جبکہ میں خود اس پوزیشن پر تھا تو اسی بلندی تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ میری تقلید کرنے والے مجھ سے بہتر انسان بن سکیں- ایسے میں کوئی مجنونانہ حرکت' کوئی غیر ارادی لغزش اگر پکڑی جاتی یا کسی اسٹوڈنٹ کی نظر میں آ جاتی تو میں شاید خود اپنی نظروں سے گر جاتا- اسی لیے میں نے محتاط رہنا شروع کر دیا-

لیکن یہ ذمہ داریاں اور احساس میرا دل اور میری سوچ تو نہیں بدل سکتی تھیں- ان کے دائرے سے باہر تنہائی میں اور عزیز احمد کے ساتھ میں وہی مجتبیٰ تھا- جو عائشہ نیازی کا عاشق تھا' جو دل کی اس صورت حال پر قابو نہ پا سکا تھا بلکہ شاید میں دل کی اس صورت حال پر قابو پانا ہی نہیں چاہتا تھا- وہ احساسات جو لمحہ بھر کے لیے دل کو خوشی کی ایک لطیف کیفیت عطا کر جائیں بڑے ہی اچھے لگتے ہیں- ان احساسات کی گرد جھاڑنے پر دل کبھی مائل ہی نہیں ہوتا- میں بھی اپنے ان ہی روز و شب میں گم زندگی گزارتا چلا جا رہا تھا-

میرا زیادہ تر وقت لیکچر بنانے' لیکچر دینے' طالب علموں کے ساتھ سوال و جواب کرنے' امتحانی پرچے بنانے' رزلٹ اناؤنس کرنے' سنڈیکیٹ کی میٹنگز اٹینڈ کرنے اور ایسے ہی امور میں گزرتا تھا- فرصت کے وہ لمحے جو عزیز احمد کی ہمراہی میں گزرتے بڑے ہی قیمتی معلوم ہوتے تھے- ہم دونوں فرصت کے ان لمحوں میں اپنی پسندیدہ جگہوں پر گھومتے پھرتے- باآواز بلند' کبھی کبھار خاموش مکالمے کرتے ہم لارنس میں گھومتے اوپن ایئر کے ڈرامے دیکھتے' شیزان سے چائے پیتے' پرانی انارکلی سے کھانا کھاتے گورنر ہاؤس سے شملہ پہاڑی پھر ریڈیو اسٹیشن تک پیدل مارچ کرتے-

ان دنوں لاہور ریڈیو سے عزیز احمد کا قسط وار ڈرامہ ''دھوپ اور سایہ'' چل رہا تھا اور بے حد مقبول بھی ہو رہا تھا- ایک روز ڈرامے کی ریکارڈنگ پر وہ مجھے بھی ساتھ لے گیا- وہ گرمیوں کی ایک سہانی شام تھی' آسمان پر ہلکے بادل تھے اور فضا میں بارش کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی- عزیز احمد کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن کے اندر جاتے ہوئے میں نے ''عائشہ نیازی'' کو کچھ اور لڑکیوں کے ساتھ اسٹوڈیو نمبر دو کی طرف جاتے دیکھا- میرے دل نے ایک دھڑکن مس کر دی اور میں لاشعوری طور پر اسٹوڈیو نمبر دو کی طرف چل دیا-

''ادھر نہیں یار ادھر-'' عزیز احمد نے بازو سے پکڑ کر میرا رخ دوسری طرف موڑا-

''ادھر نہیں یار! ادھر ہی-'' میں نے ایک ایسے شخص کی طرح کہا جسے اپنی منزل کا یقین ہو-

''کیوں وہاں کیا ہے؟'' وہ میری عقل پر شک کیے بغیر بولا-

''وہاں وہ ہے-'' میں نے مختصر جواب دیا-

''یہ بھی یا محض التباس ہے-'' وہ بغیر کوئی متعلقہ سوال کیے جان گیا تھا-

''یہ میں نے خود دیکھا ہے اسے اندر جاتے ہوئے-'' میں نے یقین کامل کے ساتھ کہا-

''پھر اب-'' وہ گہرا سانس لے کر بولا- ''کیا کرنا ہے' ادھر اندر جا کر؟ اسے احمقوں کی طرح ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرنا ہے' اس کے بارے میں لوگوں سے پوچھنا ہے-''

''کیا یوں کرنا چاہیے؟'' مجھے اس کی یہ بات عجیب سی لگی-

''تم کہو میرے یار! تو تمہاری خاطر کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا دیں-'' وہ اپنے مخصوص مسخرے پن پر اتر آیا-

''نہ مذاق کی بات نہیں ہے عزیز احمد!'' میں نے ناراضگی سے کہا-

''منہ کو اتنا مت لٹکاؤ گر جائے گا-'' اس نے پچکارتے ہوئے کہا- ''میں ادھر سے ہو کر آتا ہوں-'' اپنے اسٹوڈیو کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا- ''تم ادھر کھڑے ہو کر انتظار کرو- شاید تمہاری قسمت میں اس سے ملاقات کی کوئی صورت ہو-''

اور میں واقعی وہاں کھڑا رہا تقریباً ایک گھنٹہ اور دس منٹ میں نے کہا نا کہ اس سے متعلق ایک ایک بات میرے ذہن کی سلیٹ پر صاف صاف نقش ہے- عزیز احمد اپنے کام سے فارغ ہو کر باہر بھی آ گیا اور میں بے مراد کھڑا تھا-

''اصل میں یہ ہو جاتا ہے-'' وہ حسبِ معمول بغیر سوال جواب کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تقریر کرنے لگا- ''جب کوئی چہرہ نظر میں سما جائے تو پھر ہر چہرے پر اسی کا گمان ہونے لگتا ہے- اسی کو الوژن یعنی التباس کہتے ہیں-''

''نہیں ہے یار! الوژن نہیں ہے-'' میں نے سر ہلا کر کہا اور واقعی الوژن نہیں تھا- اسی لمحے وہ اسٹوڈیو نمبر دو سے برآمد ہوئی- ہنستی مسکراتی ہشاش بشاش- ایک گھنٹہ پندرہ منٹ تک انتظار کرتے کرتے میں اچانک بے نیاز نظر آنے کی کوشش میں سگریٹ سلگانے لگا اور واضح طور پر میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے- اب ایک سمجھ دار اور ذہین شخص سے مزید کس حماقت کی توقع کی جا سکتی ہے' ایسا شخص جو ایک ذمہ دار استاد ہو اور کالج کے لڑکے پڑھاتا ہو' مگر مجھے خود اپنا آپ کبھی بھی اتنا بڑا ابڑا' معتبر اور سمجھ دار نہیں لگا تھا- اس لیے خود میرے اپنے نزدیک اپنے آپ سے ایسی ہر حماقت کی توقع کی جا سکتی تھی نہ صرف توقع کی جا سکتی تھی بلکہ اسے جائز بھی سمجھا جا سکتا تھا-

سگریٹ سلگاتے سلگاتے جب میں نے اسے قریب آتے دیکھا تو کچھ ایسے اس پر نظر ڈالی

جیسے اچانک سامنا ہو گیا ہو۔
''ارے آپ!'' باادب نظر آتے ہوئے میں نے سگریٹ سلگانے کی کوشش ترک کر کے لائٹر بجھا دیا اور سگریٹ ہاتھ میں دبا لیا۔
''سر! آپ۔'' اس کا یوں سر کہنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر مین پہچان لیے جانے کی خوشی میں اسے ہضم کر گیا۔
''کیا حال ہے آپ کا؟ آپ یہاں کیسے آئے سر؟'' وہ قریب کھڑی ہو کر گفتگو کرنے لگی۔
''یہ عزیز احمد ہیں۔'' میں نے قریب کھڑے عزیز احمد کی طرف اشارہ کیا جو مجھ سے بھی زیادہ بے نیاز نظر آنے کی کوشش میں کھڑا عینک کے شیشے رومال سے چمکائے جا رہا تھا۔ ''یہ میرے دوست ہیں ان کا ایک ڈرامہ آج کل چل رہا ہے۔''
''دھوپ اور سایہ۔'' میری بات کو اس نے درمیان میں کاٹ کر خود مکمل کیا۔ ''کیا آپ واقعی عزیز احمد ہیں؟'' پھر اس نے اپنا رخ عزیز احمد کی طرف موڑ لیا۔ ''یقین کیجئے' مجھے آپ سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا یہ ڈرامہ کس قدر مقبول ہو رہا ہے۔ ہم لوگ ہاسٹل میں ہر پیر کی شب ساڑھے دس بجے تک اپنے اپنے سارے کام نپٹا کر ریڈیو کے گرد یوں بیٹھتی ہیں جیسے اس کے اندر سے کسی ماورائی مخلوق کی برآمدگی کی توقع ہو اور جب ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے تو کمرے میں انتہائی خاموشی ہوتی ہے پن ڈراپ سائیلنس میرا خیال نہیں کہ آج کل ریڈیو کا کوئی اور پروگرام اتنی توجہ اور انہماک سے سنا جاتا ہو' فرمائشی پروگرام بھی نہیں۔'' اس زمانے میں ٹیلی ویژن جسے آج کل عرف عام میں ایڈیٹ باکس کہا جاتا ہے' بہت خاص چیز تھی اور بہت سے لوگوں کی دسترس سے باہر تھی۔
اب بات عزیز احمد کے ڈرامے کی ہو رہی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے ڈرامے کی کہانی آرٹسٹوں کی پرفارمنس' پروڈیوسر کی مہارت وغیرہ وغیرہ پر گفتگو کیے جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے بارے میں خصوصاً اپنے فن کے حوالے سے گفتگو عزیز احمد کو کبھی بھی پسند نہیں رہی تھی اور وہ بھی صنف مخالف کی کسی مخاطب کے ساتھ' ایسے موقعوں پر وہ بے حد خجل سا نظر آنے لگتا تھا یوں جیسے اپنے کیے پر شرمندہ ہو۔
اس وقت بھی وہ سر جھکا کر اپنے ہاتھ کے ناخنوں پر ٹکٹکی جمائے شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔ مگر مجھے عائشہ نیازی سے اپنے فن اور ڈرامے کی کہانی کی تعریفیں سنتا عزیز احمد حاضرین کے اس چھوٹے سے حلقے کا ایک منی ہیرو (Mini Hero) محسوس ہو رہا تھا۔ جس نے سب کی بہ شمول عائشہ نیازی کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں گفتگو میں کیسے کود کر خود کو موجود ثابت کروں۔ حسد کی ایک ذرا سی جلن مجھے اپنے دل میں محسوس ہوئی۔ کتنے دن کے بعد

گفتگو کا' ملاقات کا یہ ایک اچھوتا موقع میسر آیا تھا جو عزیز احمد کے ڈرامے کی نذر ہو رہا تھا۔
''خوامخواہ میں نے اس سے عزیز احمد کا تعارف کروایا۔'' میں دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔
''آپ تو یونہی میری تعریفیں کیے جا رہی ہیں۔'' پھر اچانک شرمندہ شرمندہ سے عزیز احمد نے لب کشائی کی ''جو کچھ میں لکھ رہا ہوں' اس میں میرے ذہن کی قوت سے زیادہ مجتبیٰ حسین کی رفاقت کا کمال ہے۔ اکثر جملے اکثر ڈائیلاگ تو وہ ہوتے ہیں جو یہ عام گفتگو میں کہتا ہے' میں تو بس ان کو الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ کاغذ پر درج کر دیتا ہوں' کہانی' کردار اکثر اسی کی مدد سے ہی تخلیق ہوتے ہیں۔''
عزیز احمد کو عادت تھی میری خفگی' جلن اور غصے پر فراخدلی کی لات چلانے کی' سواب.... بھی وہ چلا رہا تھا۔ عائشہ نیازی کے ساتھ ساتھ میں خود بھی اس کی اس بات پر چونک گیا تھا۔ اس نے اپنے سر کا بوجھ اتار کر مجھے بیک گراؤنڈ سے نکالتے ہوئے سینٹر آف دی اسٹیج پر لا کھڑا کیا اور خود ایک بار پھر سے عینک کے شیشے رومال کی مدد سے چمکانے لگا۔
''آپ مدد کرتے ہیں سر!'' عائشہ نیازی نے ٹریک بدلا ''آپ کو بھی اسکرپٹ رائٹنگ آتی ہے' آپ بھی انٹرسٹڈ ہیں اس کام میں سر! کیا آپ نے ہی اوریجنل آئیڈیا دیا تھا عزیز احمد صاحب کو سر!''
اب وہ وہی سوالات مجھ سے کرنے لگی جو پہلے عزیز احمد سے کر رہی تھی۔ اس کے سوالات کے جواب تو خیر میں کیا دیتا' مگر اس کی بار بار کی وہ سر' سر مجھ پر خوامخواہ ہی ایک بزرگانہ کیفیت طاری کرنے لگی۔
''افوہ بھئی' اب چلو نا عائشہ! تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو ایک بات کے۔'' اس کی ایک دوست نے اس کی فراٹے بھرتی زبان کو روکتے ہوئے کہا۔
''اب چلتے ہیں' مس انتظار کر رہی ہوں گی باہر۔''
''او ہاں اچھا!'' پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ''اصل میں سر! ہم لوگ ایک کوئز پروگرام میں شرکت کے لیے آئے تھے کالج کی طرف سے یہاں آپ سے ملاقات ہو گئی۔ اچھا مزا آیا۔ آپ سے مل کر عزیز احمد صاحب بڑی خوشی ہوئی۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے' میں نے آپ کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔ آپ ہی ایک بار ان سر کے ساتھ ہمیں کالج تک چھوڑنے گئے تھے ناں برستی بارش میں۔''
وہ دوبارہ سے عزیز احمد سے مخاطب ہو کر بولی مجھے اس کے لہجے میں ایک تبدیلی محسوس ہوئی۔ پہلے کی طرح اس کے لہجے میں برستی بارش میں اس رات کے اس پیدل مارچ پر شرمندگی کا احساس نہیں جھلک رہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تنگ پائنچوں کی سفید شلوار' اونچی سبز قمیص اور سفید جالی کے دوپٹے میں ملبوس وہ اس روز بھی باقیوں سے منفرد لگ رہی تھی۔ پہلے کی طرح دوپٹہ اس

کے سر پر نہیں گلے میں تھا' گو پھیلا ہوا تھا- مگر اس کے چہرے کا تاثر اب بھی وہی تھا معصوم سنجیدہ اور متین اس کی آنکھوں میں تجسس' شوق اور ذہانت کی چمک تھی اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ دیکھنے والوں کو اچھی لگ رہی تھی یا نہیں- پھر وہ ہمیں خدا حافظ کہتی ہوئی مڑ گئی- دراز بالوں کی موٹی چٹیا اس کے پیچھے جھول رہی تھی' یہ چٹیا اسے مزید منفرد بنا رہی تھی-

''آگے پیچھے میرے کان کھاتا رہتا ہے' وہ سامنے آتی ہے تو گنگ ہو جاتا ہے-'' اس کے جانے کے بعد عزیز احمد نے عینک چمکانے کا مشغلہ ترک کر کے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا- میں نے خفت سے سر کھجانا شروع کر دیا-

''تمہاری جگہ میں ہوتا ناں تو صاف اس سے کہیں ملنے کا وقت مانگ لیتا-'' ریڈیو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے کہا-

''اور سب کے سامنے جوتے کھاتا-'' میں نے فوری جواب دیا-

''بلا سے- مگر یہ تشنگی تو نہ رہتی کہ اپنی بات کہہ نہ سکا-''

''چھوڑ و یار! وہ اور طرح کی لڑکی ہے اور دوسری بات یہ کہ تم نے دیکھا نہیں وہ کتنے احترام سے میرے ساتھ مخاطب ہوتی ہے وہ مجھے استاد سمجھ کر بات کرتی ہے یار-'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا-

''بس پھر بچو! عزت ہی کرائے جا' استاد ہی بنا رہ' تیرے ہاتھ کچھ آنے والا نہیں' ارے بانگڑو' جو لوگ عشق میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو عزت و احترام وغیرہ سے بالاتر ہو کر بڑے بہادرانہ قدم اٹھانے پڑتے ہیں' تیری طرح نہیں- وہ آئی تو گنگ' وہ سر سر کرتی رہی آپ جی جی کرتے رہے' وہ چلی گئی تو یاد آیا کہ نہ پتا پوچھا نہ نام اور پھر شہر بھر میں اس کو دیوانہ وار ڈھونڈتے پھرے' الوژن کا شکار ہونے لگے- اس عاشقی میں تو بھائی صاحب عزت سادات بھی ہاتھ سے جاتے دیکھی ہے دنیا نے-'' عزیز احمد کے اپنے فلسفے تھے-

ویسے تو وہ عشق و عاشقی قسم کے کاموں کو حماقت اور غیر عملی کام قرار دیتا تھا اور آزاد پھرتے رہنا چاہتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ اس میں مبتلا ہو بھی جاتا ہے تو اپنے کہے کے مطابق اس میں اتنی ہمت ضرور تھی کہ دنیا کے سامنے ملنے کا وقت اور جگہ طے کرنے بیٹھ سکتا تھا اور نتیجتاً جوتے کھا کر بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ دل کی بات تو پوری کر لی نا- مگر میری بات اور تھی میں اس کے فلسفے کے برعکس عشق میں تو مبتلا ہو گیا تھا- مگر میری نظر میں عزت و وقار اپنے سے بڑھ کر خود اس کی بہت اہمیت کے حامل تھے- پھر مجھے رسم و روایات دنیا کا خیال بھی ستاتا تھا- اسی لیے وہ مجھے بزدل اور احمق کہا کرتا تھا- مگر اس روز کی گفتگو کے بعد میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جب بھی عائشہ نیازی سے یونہی اتفاقاً ہی سہی مڈ بھیڑ ہوئی تو بات کو سر سر اور جی جی سے آگے ضرور بڑھاؤں گا-

مگر عجیب اتفاق تھا کہ اس کے بہت دن بعد تک مجھے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں مل سکا- میرے کالج میں کوئی فنکشن ہوتا تو میں منتظر ہوتا کہ شاید وہ کبھی کسی سلسلے میں ادھر آئے اور میرے اس قسم کے انتظار پر عزیز احمد جی بھر کر ہنستا-

''کالج کے لڑکوں کی تو بات سمجھ میں آتی ہے یار! کہ ان کی تو عمر ہوتی ہے لڑکیوں کا انتظار کرنے کی مگر تیرے معاملے میں بات ذرا ٹیڑھی ہو گئی ہے- نجانے اس نسل کا کیا بنے گا جس میں لڑکے پڑھانے والے استاد بھی کالج کی حدود کے اندر لڑکیوں کے منتظر رہنے لگے ہیں-'' وہ کہا کرتا اور میں اس کی بکواس کو ایک کان سے سننے کے بعد منہ سے ہنس کر دوسرے کان سے نکال دیتا-

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد میں نے عائشہ نیازی کو کہاں دیکھا تھا- اس کو اس کے بعد دیکھنا مجھے یوں بھی اس لیے اچھی طرح یاد ہے کہ اس بار میں نے اسے اس شہر میں آخری بار دیکھا تھا- یہ ان دنوں کی بات تھی جب عزیز ا[illegible]مہ ریڈیو پر دھوم دھام سے چل رہا تھا اور مقبولیت کی آخری حدیں چھو رہا تھا- اس ڈرامے پر اخباروں میں باقاعدگی سے ریویو لکھے جاتے تھے اور ریڈیو کے ڈاک پروگراموں کا زیادہ تر حصہ اس کے بارے میں خطوط کا جواب دینے میں نکل جاتا تھا- ادھر عزیز احمد کا یہ ڈرامہ چل رہا تھا- ادھر عزیز احمد کی مارکیٹ پیدا ہو جانے کے بعد بڑھنے لگی تھی اور وہ پراسراری سرگرمیوں میں مصروف رہنے لگا تھا-

وہ میری اور اس کی بہت دنوں بعد ملاقات کی بات تھی- جب اس نے مجھے اوپن ایئر تھیٹر میں ہونے والے کلاسیکل ڈانس نائٹ' کے دو پاس دکھائے بظاہر دیکھنے میں وہ تھکا ہوا اور قدرے مضمحل نظر آ رہا تھا- مگر اس فنکشن پر جانے پر مصر بھی تھا-

''یار! ایک بار اکٹھے اس قسم کی کوئی چیز دیکھ لیں' پھر شاید یہ فرصتیں ملیں نہ ملیں-'' اس نے قدرے اداس لہجے میں کہا تھا-

''میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا عزیز احمد کہ تم کرتے کیا پھر رہے ہو اور یہ تمہاری گفتگو کو کیا ہو گیا ہے- ایک بار اکٹھے دیکھ لیں' پھر ایسا شاید ہو کہ نہ ہو اس بات کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے جھنجھلا کر سختی سے دریافت کیا تھا- ہم دونوں لارنس گارڈن میں گھوم رہے تھے-

''بس یار! میں ذرا کہیں جا رہا ہوں-'' اس نے سرگوشی سے انداز میں کہا-

''کہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا-

''بس یونہی کہیں کام سے-'' اس نے لاپروائی سے شانے جھٹکتے ہوئے کہا اور اس کے اس انداز سے میں سمجھ گیا تھا کہ اب اس سے مزید کچھ پوچھنے کا فی الحال کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس کا یہ انداز بتاتا تھا کہ وہ مزید کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں تھا-

میں نے فنکشن کے پروگرام کو پڑھا مہاراج کتھک ود ٹیلنٹڈ پیوپلز آف ہز-

مہاراج کے پنسل اسکیچ کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کی شبیہ سے مزین کارڈ پر سنہرے حروف میں درج یہ الفاظ بھی مجھے اب تک یاد ہیں مجھے کلاسیکل ڈانس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کیونکہ میں رقص کے اتار چڑھاؤ اور رموز واوقاف سے قطعی واقف نہیں تھا- مگر یہ عزیز احمد کی خواہش تھی جسے میں کسی طور مسترد نہیں کرسکتا تھا-

میں اور عزیز احمد تیسری رو میں بیٹھے تھے اور مہاراج اپنے شاگردوں کے ساتھ رقص کی زبان میں کوئی قدیم تمثیل پیش کر رہے تھے- مجھے اشاروں کنایوں اور گھوم جا' بیٹھ جا کی یہ زبان بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور میں قدرے بیزار بیٹھا تھا' جبکہ میرے برعکس عزیز احمد ایک ایک قدم پر بے ساختہ داد دے رہا تھا- اس کا یہ موڈ قطعی انٹروورٹ (Introvwet) قسم کا تھا جس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاسکتی تھی- میں نے خود کو تنہا محسوس کرتے ہوئے یونہی ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اور یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک میری نظر سرخ چہرے کے ساتھ جوش وخروش سے تالیاں بجاتی ہوئی عائشہ نیازی پر پڑی- میرا دوران خون تیز ہونے لگا ''عائشہ نیازی'' میری جستجو اور خواری کا ماحاصل تھی اور وہاں موجود تھی وہ بائیں طرف والی چوتھی قطار میں بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ بیٹھے لوگوں میں کچھ وہ بھی تھے جو مہاراج کی پیش کردہ پچھلی تمثیل میں شامل تھے- میرا ارادہ بندھنے لگا- میں کسی کی بھی پروانہ کروں اور اسے بازو سے پکڑ کر اس پنڈال سے باہر لے جا کر اپنا مدعا بیان کروں- میں اسی ارادے کی طاقت سے اٹھنے کو تھا کہ اسی دم وہ اٹھی اور کپڑے درست کرتی ہوئی اسٹیج کے پیچھے اندھیرے میں کہیں گم ہوگئی- میں تیزی سے اٹھا اور اس سمت چلا جہاں وہ گئی تھی- مگر اندھیرے کے اس پار نہ ہی چاندنی کی لو میں وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی-

''یہاں سے ابھی جو لوگ اسٹیج کے پیچھے گئے ہیں وہ کہاں ہیں؟'' میں نے وہاں کھڑے ایک شخص سے پوچھا-

''کچھ لوگ تو اوپر چلے گئے ہیں اور کچھ پیچھے کے ریستوران میں- آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں-'' اس نے جواب دیا-

''ابھی جو خاتون- جو لوگ وہاں پنڈال سے اٹھ کر ادھر اسٹیج کے پیچھے گئے ہیں-''

''وہ لوگ تو مہاراج کے شاگرد ہیں- غالباً وہ ان کے لیے بنی خصوصی چھولداریوں میں موجود ہوں گے-''

'نہیں' میں مہاراج سے متعلق لوگوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا-'' میں نے مایوسی سے سوچا اور اوپر پہاڑی تک پھر ریستوران کا ایک ایک کونا چھان آیا- اس کو کہیں نہ ملنا تھا نہ ملی میں بجھے دل کے ساتھ مایوس قدم اٹھاتا پنڈال میں واپس آیا اور عزیز احمد کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا- اب اس رنگ و بو' روشنیوں اور خوشیوں' تالیوں کی محفل میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا- سب

رنگ پھیکے تھے' سب روشنیاں بجھ چکی تھیں- ایک سکوت اور اندھیرا تھا- غالباً یہ ملنے اور نہ ملنے والی کیفیت تھی جس نے میرے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا-

''چلو چلیں یار! کہاں گم ہو؟'' بہت دیر بعد مجھے عزیز احمد کی آواز سنائی دی-

''مجتبیٰ حسین! کیا ہوگیا ہے یار! چلو فنکشن کب کا ختم ہو چکا ہے-'' اس نے مجھے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے ہوش میں لانے کی کوشش کی-

میں اسی طرح بت بنا کھڑا ہوا اور کسی روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگا-

''وجد کی ایک کیفیت یہ بھی ہوتی ہے' میں نے سنا ہے-'' باہر آ کر ریس کورس روڈ پر بے مقصد گھومتے ہوئے عزیز احمد نے اپنا فلسفہ جھاڑا- ''انسان مبہوت یونہی ہوا کرتا ہے- اس کو وجد کہتے ہیں رقص کا ایک خاص انداز ایک زیر ایک بم انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے- سُر اور تال کا یہ سنگم اس پر یوں عمل کرتا ہے کہ دل ساکت ہوتا محسوس ہوتا ہے پھر وہ واہ واہ اور آہ آہ کی آوازوں سے ماورا ہو جاتا ہے- یہ ہی تمہارے ساتھ ہوا-''

وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا- میں اس کو ٹوک سکتا تھا- کوئی اور وقت ہوتا تو میں- بس کر و یار اپنے یہ قیافے کہہ کر اس کی لن ترانیاں روک سکتا تھا- مگر اس وقت میرا بولنے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا- اس لیے میں اس کی کہی سنتا گیا-

''مجتبیٰ حسین! مگر ایک بات یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے تمہیں رقص سے کوئی خاص دلچسپی نہیں بلکہ عام بھی نہیں-'' پھر جیسے عزیز احمد اپنی لن ترانیوں پر خود ہی چونک گیا اور اسے گویا کچھ یاد آیا- ''پھر یہ وجد' یہ مبہوت ہو جانا وغیرہ وغیرہ کیا ہے' کیوں ہے اور کیسے ہے؟'' میں اس پر بھی کچھ نہیں بولا اور چلتا گیا-

''مجتبیٰ! کہیں وہاں اس محفل میں وہ تو موجود نہیں تھی-'' میں نے کہا تھا نا کہ عزیز احمد میرا ہم زاد ہے- وہ میرے دل کی کہی سن سکتا تھا-

''پھر یار! تم نے اسے پکڑا کیوں نہیں؟ اس سے کچھ کہا کیوں نہیں؟'' وہ مضطرب لہجے میں بولا ''یار! تو نے یہ بہت بڑی زیادتی کی ہے-'' وہ میرے جواب کو سنے بغیر بول رہا تھا کیونکہ وہ میرے جذبے کی شدت کی انتہا سے واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ میری اس وقت کی کیفیت سے میرا نکلنا بہت ضروری تھا- وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے لا حاصل نہیں حاصل ضروری تھا- پھر میں نے خود پر گزرنے والی چند لمحوں کی داستان اسے حرف حرف سنا دی-

''تم مجھ سے کہتے یار! ہم مل کر اسے ڈھونڈتے-'' خلاف معمول بلکہ خلاف طبع عزیز احمد بھی جذبات کی زد میں آیا ہوا تھا ''وہاں مہاراج کے کیمپ میں تم نے وہاں جا کر دیکھنا تو تھا- شاید وہ وہاں ہوتی-''

''ناممکن ہے عزیز احمد! وہ اس کے موجود ہونے کی جگہ نہیں تھی مہاراج کے شاگردوں سے اس کا کیا تعلق؟''

''ممکن ہے کہ وہ کسی سے ملنے ہی وہاں گئی ہو' اتنی سی دیر میں وہ کوئی چھلاوا تو نہیں تھی جو یوں غائب ہو جاتی۔'' اس نے کہا تھا۔

مگر گزرتے وقت میں مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے وہ عائشہ نیازی نہیں کوئی چھلاوا ہی تھی جو اس کے بعد ایسے غائب ہوئی کہ خود مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ حقیقت نہیں محض التباس تھی۔ میں نے اپنے اندر سے اٹھتے جوار بھاٹے کے آگے سرنگوں ہوتے ہوئے نہ اپنی عمر کا لحاظ کیا نہ ہی اپنے منصب کا اور اس کو ہر اس ممکنہ جگہ پر تلاش کیا جہاں اس کے ہونے کا گمان بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے کالج میں ہاسٹل میں' شناسا لوگوں کے ذریعے سے اس کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ جیسے یا تو تھی ہی نہیں یا پھر اس کو زمین نے نگل لیا تھا اور آسمان کھا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جس کے بعد سے اب تک میری زندگی زندگی نہیں رہی زندگی گزرتی تو رہی مگر جوش' تجسس' بے چینی' خوشی' غم' ولولہ' ارمان' مایوسی ہر رنگ جیسے اڑ گیا۔

ان ہی دنوں میں عزیز احمد کو جہاں ''ذرا'' جانا تھا وہ وہاں پہنچ گیا اور اب تک وہیں ہے۔ میں نے گزشتہ بیس سال گورنمنٹ کالج میں لڑکوں کو پڑھایا ہے اور یہ پچھلے دو برس کی مسلسل تگ و دو کا نتیجہ ہے کہ میں لندن میں پاکستان ہاؤس کے شعبہ انفارمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے موجود ہوں۔ گزشتہ بیس سال مالی لحاظ سے آسودگی کے دن تھے۔

ہم سانده سے اٹھ کر گلبرگ آ گئے۔ بھائی جان اور بھابی کی فیملی کو میں مکمل طور پر مالی معاونت دیتا رہا۔ عزیز احمد کے چلے جانے کے بعد پورے لاہور شہر میں ایک تنہا شخص ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے اردگرد دوست تھے احباب تھے' جن میں وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ مگر یہ میرا اندر جانتا تھا کہ میں کس قدر تنہا تھا۔ عزیز احمد کہتا ہے کہ وہ اس ہنگامہ خیز شہر میں آ کر بھی اتنے سال ایک انجانی سی تنہائی اسی وجہ سے محسوس کرتا رہا کہ میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے بقول وہ لاہور سے یہاں اسی لیے آیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ وہاں لاہور میں اس کے ہنر کو اس کے انداز فکر کو نہ اس طرح سمجھا جائے گا اور نہ ہی اس طرح پروان چڑھنے دیا جائے گا جیسا کہ اس کے یہاں آنے کے بعد ہوا۔

''وہاں میں زیادہ سے زیادہ کیا تیر مار لیتا۔'' وہ میرے یہاں چلے آنے پر اصرار کرتے ہوئے اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھا کرتا تھا۔ ''ایک دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار کامیاب ڈراموں کا اسکرپٹ رائٹر پھر' حکومتوں کے آنے جانے کا شکار' سرخ فیتے کا نشانہ اور اب ایک غریب' مفلوک الحال' غالباً فالج زدہ کسی زمانے کا ریڈیو ڈرامہ رائٹر جو اب کہیں سے کسی امداد

کی امید لگائے بیٹھا ہوتا' یار! یہاں آنے کا فیصلہ ایسا تھا جسے کرنے میں غالباً دو صدیاں لگ جاتیں جب ہی میں نے یہ فیصلہ ایک لمحے میں کر لیا اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا' تم جو میرے ہم زاد تھے میرا سایہ تھے تم تک سے ذکر صرف اس لیے نہیں کیا کہ تم منہ سے کچھ نہ بھی کہتے تمہاری نظر کی صرف ایک جنبش میرے قدم روک لینے کے لیے کافی ہوتی۔ میں جانتا ہوں تم تنہا رہ گئے ہو' میں جانتا ہوں کہ ایک عرصہ تک تم تنہا ہو گے۔ خصوصاً ایک سعی لاحاصل کے بعد تھک جانے کی سی اس کیفیت میں اسی لیے میں تم کو دو مشورے دے رہا ہوں' بھابی جہاں کہیں بھی ایک صالح مگر قطعی انجانی لڑکی سے تمہاری شادی کرنا چاہیں بغیر ہچکچاہٹ کے کر لینا اور جس کوشش میں میں لگا ہوا ہوں اگر اس میں میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو اسی طرح بصورت دیگر کسی اور طریقے سے یہاں آ جاؤ۔ ہم مل کر زندگی کا کوئی انتظام کر لیں گے۔''

میں نے ایک عرصہ عزیز احمد کی اور اس نے میری بات ماننے میں گزارا تھا۔ مگر میں اس خط میں لکھی عزیز احمد کی دونوں باتیں ہی نہ مان سکا یہ ایک حقیقت تھی کہ میری سماجی حیثیت اور ترقی سے متاثر اور بے انتہا خوش بھابی نے ایک سے ایک اچھی لڑکی میرے لیے تلاش کی۔ مجھے اچھی اور خوش آئند زندگی کے خواب دکھائے۔ وہ لوگ میری تنہا اور ناآسودہ زندگی پر دکھی بھی تھے۔ مگر میں ان سمیت کسی کی بھی یہ بات نہ مان سکا۔

زندگی نے سراب مسلسل کی جس کیفیت کے پیچھے مجھے بھگایا تھا۔ میں اس کیفیت سے باہر نکل ہی نہیں سکا۔ میں اس زندہ و موجود التباس کے (جس کو عزیز احمد کے سامنے کبھی ثبوت حق کا نام دے بیٹھا تھا) تعاقب میں رہنا چاہتا تھا۔ گزرتے وقت نے مجھے سایوں کے تعاقب میں ڈال دیا تھا۔ میں اس کیفیت میں مبتلا رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس سے باہر نکل کر شاید میں زندہ نہ رہ پاتا۔ آپ یقین کریں گے کہ ان بیس سالوں میں میری نظریں اور میرے کان ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے' ایک ساعت کے لیے بھی نہیں تھکے۔

ہزاروں کا مجمع ہوتا یا چند ایک بکھرے بکھرائے لوگ میں ایک دو منٹوں میں سب چہروں پر تفصیلی نظر ڈال لیتا۔ کوئی چہرہ بھی میری نظر سے محفوظ نہیں رہتا۔ کوئی میرے عقب میں بات کرتا یا میرے آگے چلتا پھرتا بولتا۔ میری ساعت ہر نسوانی آواز کو جا پہنچتی' کیونکہ وہ اس آواز کی منتظر تھی جس کو وہ ہزاروں آوازوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

یہ سب میری اتنے سال کی ریاضت اور منتظر رہنے کی کیفیت نے مجھے بخشا تھا۔ اور میرے اندر بڑھتی اس اندرونی صلاحیت کے بارے میں کسی دوسرے فرد کو خبر تک نہ تھی۔ مگر میری یہ اندرونی صلاحیت اتنے سال میرے کسی کام نہ آئی کیونکہ وہ سراب مسلسل سراب ہی رہا۔

میں سایوں کے تعاقب میں وہ مانوس سایہ ڈھونڈتا ہی رہا' شہر شہر' قریہ قریہ میری انتظار کی

کیفیت انتظار میں ہی مبتلا رہی۔ کیونکہ عائشہ نیازی کا وجود میرے لیے عمر بھر کی آزمائش' کوئی سزا بن کر رہ گیا تھا اور اب تو عمر کا وہ حصہ آ چکا تھا' جب میرے دل پر مایوسی کی کیفیت چھا جانی چاہیے تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی آج اچانک بی بی سی کی بیرونی نشریات کے دفتر اور پھر کینٹین میں میری نظروں اور میرے کانوں کی تھکاوٹ کا خاتمہ ہوا۔ مگر کہاں اور کس رنگ میں۔

عائشہ نیازی ایک ثبوت حق' ایک سراب مسلسل اور آشا چاٹگام والا' اجنبی شہر' اجنبی نام' اجنبی سراپا۔

☆☆

داستان حیات

ایک خط' اعترافات کی کہانی

محترم مجتبیٰ صاحب

کل صبح دس بجے سے لے کر اب تک' اس وقت آج دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔ میں نے خود کو ایک ایسی کھڑکی کے قریب کھڑا محسوس کیا ہے' جس میں سے جھانکیں تو بہت ساری تصویریں' بہت سارے منظر دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ میں کل اس وقت سے اس کھڑکی سے جھانکنے میں مصروف ہوں۔ جب سے آپ نے اپنی اور میری ملاقات میں مجھے اپنی زندگی کے اس دور کا نظارہ کرایا ہے' جب آپ کی مجھ سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اب اتنے برس کے بعد بھی آپ نے کہیں اتفاق سے مجھے دیکھ لیا اور کل والی ملاقات آپ کی اس بھاگ دوڑ اور جدوجہد کا نتیجہ تھی جو بقول آپ کے آپ گزشتہ دو ماہ سے کر رہے تھے۔ یقین جانیے مجتبیٰ حسین صاحب! جب پاکستان ہائی کمیشن کے پریس اتاشی کی جانب سے ملاقات کا دعوت نامہ مجھے موصول ہوا تھا اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ملاقات کا مقصد کیا ہوگا۔ بلکہ میرے ذہن میں فوری طور پر کچھ اور ہی بات آئی تھی۔ پاکستان میں کسی حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے کئی ایسے لوگ ہائی اتھارٹیز میں آ گئے ہوں گے جن کو آرٹ اور کلچر کی دنیا کے اس چند روزہ گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے ستارے کے بارے میں علم ہونے پر اس کے فن سے استفادہ حاصل کرنے کا خیال آیا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ جی ہاں! میرا برسوں سے ڈوبا دل فوری طور پر اسی خوش فہمی کا شکار ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ منتظر دل اسی لو سے منور ہوتا ہے جس کا اسے انتظار ہوتا ہے۔

یہ ملاقات کیسے کیسے انکشاف اور طوفانوں پر مبنی ہوگی اس کا تو میں کہیں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ واپسی پر میں رنگ رنگ مناظر اور تصویریں دکھانے والے اس دریچے کی جانب بے اختیار بڑھی ہوں اور اس کے پار اس کائنات کا نظارہ کرنے میں مصروف ہوں جو میرے گزشتہ کل کی کائنات ہے۔ اس کائنات کے اچھے اور خوب صورت رنگ مدھم پڑ چکے ہیں اور

اب کہیں بہت دور نظر آتے ہیں' بیشتر جگہوں پر تاریکی ہے رات کی سی سیاہ تاریکی اور اس تاریکی میں دنیا مجھے خوفناک بھتنوں سے آباد نظر آ رہی ہے۔

یقین جانیے مجتبیٰ حسین صاحب! کل سے اب تک میں نے تخیل کے اس دریچے میں سے ایسے ایسے خوفناک نظارے کیے ہیں کہ میری جان ہلکان ہوئی جا رہی ہے اور میرے قلب سیاہ پر جو جو وارداتیں گزر رہی ہیں ان کے احوال سے صرف میں واقف ہوں۔ مجھ میں کچھ کہنے' کچھ لکھنے کی سکت باقی نہیں رہی مگر آپ سے گفتگو کے لیے' آپ نے اپنی کہانی کے اختتام پر جو سوال مجھ سے کیا تھا اس کا جواب دینے کی خاطر میں نے سوچا کہ میں قلم اور لکھے ہوئے الفاظ کی مدد لوں کیونکہ دوبدو گفتگو کرنے کی سکت نہ مجھ میں ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی بہت سارے لمحوں میں خود پر نازاں رہی کہ ایک شخص ایسا اس دنیا میں موجود ہے' جس کی جستجو' جس کی تلاش کا ماحاصل میں ہوں' وہ پوری کائنات میں' کائنات کے ہر منظر میں مجھے تلاش کرتا پھرا' یہ کیسی قابل رشک صورت حال ہے۔ مگر ان چیدہ چیدہ لمحوں کے فوراً ہی بعد ایک ایسا آئینہ میرے سامنے آ جاتا ہے جس میں میری شخصیت کا ایک ایک عکس' ایک ایک خدوخال صاف صاف اور نمایاں نظر آتا ہے اور میں جو آپ کی باتیں سن کر خود کو بے حد اہم اور خوش قسمت سمجھنے لگی تھی۔ پل کی پل میں مجھے مجبور کیا کہ میں جو برسوں سے اس آئینے کے سامنے کھڑی نہیں ہوئی۔ اس کے قریب جاؤں اور اپنا عکس اس میں دیکھوں اس آئینے کے ساتھ جڑے درازوں میں میں نے جو پوشیدہ ڈھانچے سنبھال رکھے ہیں۔ ان کو نکالوں' جھاڑوں' پونچھوں اور ان کا نظارہ کروں۔

''مجھے یقین ہے مجتبیٰ حسین صاحب! کہ اگر آپ اس آئینے میں ابھرتا میرا سیاہ اور خوفناک عکس اور درازوں میں چھپے میرے ماضی کے پوشیدہ ڈھانچے دیکھ لیں تو ایک عمر کے سنبھالے جذبات واحساسات اپنے ہی قدموں تلے روندتے ہوئے چیخیں مارتے باہر بھاگ جائیں کسی ایسی جگہ جہاں دوبارہ آپ کو کبھی میری شکل نظر نہ آئے۔ مگر میں یہ چاہتی ہوں مجتبیٰ حسین صاحب کہ اس سے پہلے کہ میرے ضمیر کی اس کھڑکی پر جو برسوں کے بعد کھلی ہے جذبات اور منافقت کی چٹخنی چڑھ جائے' میری ذات کے ہر پہلو کا ہر رنگ آپ کی نظروں کے سامنے آ جائے۔ کیونکہ اس سے قبل دنیا میں مجھے کوئی اور شخص ایسا نہیں ملا جس کے روبرو اعترافات کیے جا سکیں' کواڑوں کے پیچھے چھپے ہوئے ماضی پر سے پردے اٹھائے جا سکیں۔ اس لیے میں نے یہ قلم تھاما ہے اور آپ سے مخاطب ہوں۔ خود کو ضمیر کی جس عدالت میں میں موجود پاتی ہوں۔ آئیے اس میں سنائی جانے والی داستان اور ہونے والے اعترافات کی کارروائی آپ کو بھی سناؤں۔

کائنات ایک بہت بڑے اسکرین پر ٹیکنی کلر فلم کی صورت میری نظروں کے سامنے ہے۔ میری ساری کی ساری داستان حیات نجانے کیسے سلولائیڈ کے نیگیٹوز میں تبدیل ہو کر تنگ اور لمبے فیتوں

کی شکل میں میرے قدموں میں الجھی پڑی ہے! سلولائیڈ کے ان ٹکڑوں کو جب میں نے ترتیب دینے کی کوشش کی تو میری نظروں کے سامنے دور کہیں راستے میں ہی چھوڑے ہوئے ایک شخص کی شکل ابھری ہے۔

سفید شلوار قمیص، خشخشی داڑھی، موٹی موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی ایک راضی بہ رضا قناعت پسند انسان کی شکل، یہ شخص دھوپ چھاؤں کے سے مزاج کا حامل، زندگی سے اچھی توقعات وابستہ رکھنے والا انسان تھا، آہ! یہ شخص میرا باپ سکندر احمد نیازی تھا۔ دور کہیں بہت دور ابا کی یہ شبیہہ برسوں بعد میرے پردہ تصور پر ابھری ہے، کیونکہ عرصہ ہوا میں نے مانوس شکلوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ نامانوس شکلوں کے درمیان گھری ہوئی شخصیت اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ ہاں تو! میں پردہ تصور پر ابھرنے اور ڈوبنے والے چہروں کا ذکر کر رہی تھی۔ ابا ہی کے ساتھ ساتھ اور اتنی ہی دور مجھے ایک اور چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔ کاٹن کی سادی شلوار قمیص، گرمیوں میں سوتی اور سردیوں میں اونی چادر اوڑھے ایک سنجیدہ، کم گو، مکمل گھریلو عورت، دائیں ہاتھ میں ٹھوس سونے کے دو کڑے، کانوں میں بلوں والی بالیاں، محنت، مشقت سے محبت کرنے والا، اپنی مختصر سی دنیا میں خوش اور پرسکون رہنے والا چہرہ، اماں کا چہرہ خورشید بیگم کا چہرہ نجانے یہ چہرے کہاں معدوم ہوئے۔ نجانے تخیل کے دریچے میں سے جھانکنے پر یہ اتنے دور اور مدھم کیوں نظر آ رہے ہیں۔

میں مزید آگے جا کر جھانکتی ہوں، میرے تخیل کے کینوس پر ملتان کے نواحی چک کے ایک خوشحال زمیندار سکندر احمد نیازی کے گھر کا نقشہ ابھرتا ہے۔ کچی مٹی سے لپا پتا اونچا صاف ستھرا گھر، ہمارا گھر جو چک کے خوبصورت اور بڑے گھروں میں شمار ہوتا تھا اور وہاں کے لوگ ابا کا احترام خصوصی طور پر اس لیے بھی کیا کرتے تھے کہ ابا نے وہاں ایک بڑی خوبصورت مسجد اپنی جیب سے بنوائی تھی۔ ابا خوش الحان تھے اس لیے لوگوں کے اصرار پر پانچ ٹائم اذان دینے کا فرض بھی ادا کیا کرتے تھے۔ ابا کو مذہب سے خاص لگاؤ تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ہمارے گھر میں حدیث اور فقہ کی اور اسلام کے بارے میں دیگر کتابوں کی بھرمار تھی۔ ابا اپنے پیمانے کے ایک اچھے عالم دین تھے۔ مگر مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ ایک کٹر مولوی ہرگز نہیں تھے۔

ہمارے ہاں ہر سال بڑے ختم پر ابا کے مرشد صاحب بہاولپور سے خصوصی طور پر تشریف لایا کرتے تھے اور وہ دن چک کی مختصر سی زندگی میں یادگار ترین دن ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ابا چاچا انور کے ساتھ مل کر اپنی گزارے لائق زمین کاشت کیا کرتے تھے اور گھر کا گودام سال بھر چاول اور گندم کے بھڑولوں سے بھرا رہتا تھا۔

ابا کٹر نہیں تھے، اس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی اور پاکستان کی خالص تیسرے درجے کی مذہبی سوچ کے برعکس ان کو اس بات پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ نہ تو انہوں

نے بیٹی پیدا ہونے پر نہ ہی اس کے بعد مزید کوئی اولاد نہ ہونے پر کبھی کوئی طعنہ دیا تھا اور نہ ہی کبھی گھر میں یا باہر کہیں دوسری شادی کا تذکرہ کیا تھا۔

یہ ہماری بیٹی ہے، اللہ کے گھر سے آئی ہے
رحمت خدا کی ہے، سنت آقا پوری کروائی ہے

ہمارے گھر میں نجانے کب سے موجود رحمت خالہ مجھے کھلاتے ہوئے لہک لہک کر گاتیں تو ابا زیر لب مسکراتے اور سر ہلاتے ہوئے بے شک، بے شک کہے جاتے۔ اب میں سوچوں تو جانوں کہ پاکستان میں اور وہ بھی جنوبی پنجاب کے ایک پس ماندہ ترین چک کے ایک نیم مذہبی گھرانے میں پیدا ہو کر بھی ایک تقریباً تقریباً آزاد، مگن خوش حال اور خوش باش زندگی گزار لینا بھی تو ایک بڑی خوش بختی ہے۔ مگر ایسی ایسی خوش بختیوں پر نظر جب جا کر پڑتی ہے وہاں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

اماں محنتی اور گھریلو عورت تھیں۔ صبح سویرے اٹھ کر فجر کی نماز اور قرآن کی تلاوت ان کا معمول تھا۔ جب میں بہت چھوٹی تھی اس وقت سوتے میں میری آنکھ پہلی بار صبح اماں کے نلکا چلانے اور پانی چھلکانے کی آواز سے کھلتی تھی، دوسری بار میری آنکھ اماں کے دودھ لانے کی آواز پر کھلا کرتی تھی۔

گر، گر، گر مدھانی کی پیٹیاں چلتیں اور چاٹی میں دودھ چھلکتا، اس آواز کو سنے مدتیں گزر گئیں مگر آج سوچنے پر یاد آیا ہے کہ کیا یہ آواز اچھے سے اچھے میوزک پر بھاری نہیں تھی۔ ہاں تو اس کی قدرتی موسیقیت کا مقابلہ آج کے دور کے ہائی فائی میوزیکل ایکوپمنٹس کر سکتے ہیں؟

ناشتا بنانے اور بانٹنے سے فارغ ہو کر اماں چرخا لے کر بیٹھ جاتیں اور سوت کاتتے ہوئے اپنی گونج دار آواز میں

تیری ذات پاک ہے اے خدا
تیری شان جل جلالہ
تیرا نام عادل کبریا
تیری شان جل جلالہ
جسے چاہا جیسا بنادیا
تیری شان جل جلالہ

گنگناتیں، اماں کی ذات کا تصور کروں تو یہ مناجات اس طرح ایسوسی ایٹ ہوتی ہیں جیسے ان کی ذات کا حصہ ہوں۔ جتنا عرصہ میں نے ان کے ساتھ گزارا کسی بڑی سے بڑی بات پر بھی اپنی ماں کو پریشان، بے سکون ہوتے نہیں دیکھا۔

''خورشید بیگم! تم اس لیے کسی بات پر پریشان نہیں ہوتیں کہ تمہیں پتا ہے ہر پریشانی اور دکھ کو میں نے دیکھنا ہے' تم تک پہنچتے پہنچتے اس کی شدت ختم ہو چکی ہوگی' مگر کبھی سوچو کہ کوئی دکھ اگر صرف تمہاری ذات کا دکھ ہوا تو کیا کرو گی؟'' کبھی کبھی ابا کی کسی بڑے نقصان پر اماں کا سکون اور سکوت دیکھ کر چڑی ہوئی آواز ابھرتی۔

''ایسا کوئی دکھ مجھے لگے ہی کیوں' میں اس سے پہلے مر کیوں نہ جاؤں۔'' اماں ہنس کر جواب دیتیں۔

آج سوچا ہے تو جانا ہے کہ میری ذات کا دکھ جو اماں کی اپنی ذات کا دکھ تھا جب ملا ہوگا تو اماں نے کیا کیا ہوگا۔ اس خالص ذاتی دکھ میں جب کہ ابا خود اس میں مبتلا ہوں گے' اماں کے کیا کام آئے ہوں گے بھلا

ہاں' میرے گھر کی زندگی بے حد بے فکری اور خوش باش تھی' آنکھیں بند کرنے پر یاد آتا ہے کہ ہوش سنبھالنے پر سارا دن صحن میں کھڑے بیری کے درخت پر گزر جاتا تھا اور اس بیری کے درخت پر سیزن آنے پر منوں بیر لگتے تھے یوں کہ پتے بھی چھپ جاتے تھے اسی درخت کے سائے میں اماں اپنی روٹین کے کام کیے جاتیں' اردگرد کی خواتین کا میٹنگ روم بھی یہ ہی بیری کے درخت کا سایہ تھا۔

''عیشاں او عیشاں! اب اتر آ نیچے' نہیں تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔'' اماں جنہوں نے خود ہی بڑے چاؤ سے میرا نام رکھا تھا اسے بگاڑ کر اتنا عرصہ مجھے نیچے بلاتی رہیں۔ مگر مجھے بلندی سے یقیناً جب ہی سے پیار تھا تب ہی تو اماں کی پکار پر میں کبھی نیچے نہیں اتری تھی' کیونکہ مجھے پتا تھا کہ یہ محض پکار تھی جو اماں کی روٹین کی عادت تھی ورنہ وہ اپنے دھندوں میں اتنی مصروف ہوتی تھیں کہ میرے نیچے آنے اور ان کو مختلف چیزوں کے لیے تنگ کرنے کا خیال ان کو کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا ہوگا۔

ہاں! تو میں ذکر کر رہی تھی بیری کے درخت کا۔ اس درخت سے مجھے یوں بھی پیار تھا کہ اس کے اوپر بیٹھے بیٹھے میں چک کے چہار طرف کا نظارہ کر سکتی تھی۔ چک کو آتی سڑک پر چلتی پھرتی گاڑیاں' بسیں' ویگنیں' پھر آگے سولنگ پر آتے جاتے لوگ' گلیوں محلوں میں پھرتے لوگ' کھیتوں پر کام کرتے کاشتکار' چک کی سرگرمیاں' واقعات' سیاست ہر طرح کی ایکٹوٹی کا نظارہ یہاں سے کیا جا سکتا تھا۔

''عیشاں! تو نے تو اس درخت پر بیٹھے بیٹھے ہی زندگی بتا دینی ہے۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ اس کو کٹوا ہی دوں۔'' اماں کہتیں ''رب سوہنے کی قسم اگر اس کی چھاں اتنی گھنی اور پھل اتنا بھاری نہ ہوتا تو ضرور کٹوا دیتی۔''

میں نے ساری زندگی بلندی کے شوق میں بتا دی۔ نجانے کب تک اماں آوازیں دیتی رہی

ہوں گی۔

میں ان کی بات ان سنی کر کے ہاتھ میں پکڑی گٹر کی بھیلی چوستی پھر سے بندروں کی طرح اوپر چڑھ جاتی۔ درخت کے اوپر میں نے اپنی ضرورت کی ہر چیز سجا رکھی تھی۔ کپڑے کی گڑیا' اکا دکا کھلونے' چھوٹی سی مٹی کی ہنڈیا' چمچ' سوئی' دھاگا اور کپڑے کی کترنیں' میری واحد سہیلی ہاجرہ بھی میرے ساتھ درخت پر چڑھ آتی اور ہم سارا دن علاقائی حالات و واقعات پر نظر رکھے رکھے وہاں بیٹھے کھیلتے رہتے۔ خالہ رحمت ہمیں کھانے پینے کی اشیاء وہیں بہم پہنچا دیتیں۔ یہ روٹین یوں ہی چلتی جاتی اگر ہمارے گھر میں شاہ صاحب رہنے کے لیے نہ آ جاتے۔ حمید شاہ صاحب ابا کے بچپن کے دوست تھے۔ قصبے کے اسکول سے انہوں نے ابا کے ساتھ میٹرک کیا تھا۔ پھر ابا نے تو آگے نہ پڑھا' مگر حمید شاہ صاحب نے آگے بہت ساری ڈگریاں لیں۔ وہ کئی برسوں سے کراچی میں رہ رہے تھے۔ اب ان کو اپنے چک کی یاد آئی تھی اور کیونکہ اب ان کا آبائی گھر ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے ابا نے خط میں ان کو اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔ حمید شاہ صاحب کا ہمارے گھر میں آنا اور رہنا میری زندگی میں آنے والے انقلابات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ان کو مہمانوں والے بیرونی کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اماں ان سے پردہ کرتی تھیں اور وہ بھی اندر نہیں آیا کرتے تھے۔ مگر ان کے آنے سے کمال یہ ہوا کہ میں جس نے اتنے سال بیری کے درخت پر بیٹھے بیٹھے گزار دیے تھے' نیچے اتر آئی۔

میں بچی ہونے کی وجہ سے ان کے پاس باہر جا سکتی تھی اور ان سے ایک دو بار ملاقات ہونے کے بعد ہی میرے معمول میں فرق آ گیا میں بیری کے درخت سے نیچے اتر آئی اور میرا زیادہ وقت شاہ صاحب کے کمرے کی اس دنیا میں گزرنے لگا جو کم از کم میرے جیسی محدود ترین دنیا میں رہنے والی لڑکی کے لیے ایک عالم عجائب تھا۔ شاہ صاحب زبردست قسم کے ادب دوست انسان تھے۔ ان کے سامان میں ڈھیروں کتابیں تھیں۔ انہیں شاعری سے خاص شغف تھا۔ وہ مجھے شاعری کی کتابیں کھول کر مختلف شعر سناتے جو میری سمجھ میں قطعی نہیں آیا کرتے تھے۔ پھر وہ مجھے ان شعروں کو کہانی کی شکل میں ڈھال کر سنایا کرتے یوں کہ میری فوراً سمجھ میں آ جاتا۔ اس زمانے میں پورے چک میں صرف ہمارے اور چچا انور کے گھر میں بڑا ریڈیو سیٹ ہوا کرتا تھا اور وہ بھی صرف خبریں اور دیہاتی پروگرام سننے کے لیے لگایا جاتا تا گانے اور ڈرامے سننے کا تو نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ شاہ صاحب اپنے ساتھ چھوٹا سا ایک ٹیپ ریکارڈر بھی لائے تھے۔ جو سیل سے چلتا تھا۔ شاہ صاحب کے کمرے میں مجھے یاد ہے پہلی مرتبہ میں نے نور جہاں کا مشہور گانا

صدا ہوں اپنے پیار کی

سنا تھا اور میری نظروں کے سامنے ایک نیا جہاں کھلا تھا۔ آواز کا جہان اس سے پہلے ان

تصویروں کی دنیا سے جو شاہ صاحب کی کتابوں میں' میں نے دیکھی تھی میرا تعارف صرف چند مرتبہ ہوا تھا۔ جب گلی گلی تصویروں والا ڈبہ لے کر پھرنے والا ہمارے چک میں آتا تھا۔ وہ ڈنڈے پر چڑھا مختلف تصویروں کا رول گھماتا اور چھوٹے شیشے سے نگاہیں چمٹائے بچوں کو نت نئی دنیا کی سیر کراتا تھا۔

مکہ مدینہ کی سیر کرو
بغداد کی گلیاں دیکھو
کربلا کا میدان آیا
مینار پاکستان دیکھو
زیبا' محمد علی' وحید مراد دیکھو
بارہ من کی دھوبن دیکھو
طوطا توپ چلاتا دیکھو

اور ہم سارے چک کے بچے کئی کئی مرتبہ پیسے دے کر یہ تماشے دیکھتے اور اس کے چلے جانے کے بعد کئی کئی دن اس کے سحر کے اثر میں رہتے۔

اب میں چک کے باقی سارے بچوں کے مقابلے میں اونچی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ایسی تصویروں والی کتابیں ہمارے گھر آ گئی تھیں۔

شاہ صاحب ابا کے ساتھ باہر جاتے تو میں ہونٹوں پر انگلی چپکائے شی شی کرتی بچوں کی ایک قطار لے کر بیٹھک کے بیرونی دروازے سے اندر آتی اور ان کو ہزار ہزار احسان جتانے کے بعد اترا اترا کر تصویروں والی کتابیں دکھاتی۔ اس وقت مجھے یاد آ رہا ہے' میں خود کو بے حد اہم اور خاص تصور کیا کرتی تھی۔ شاہ صاحب کے قیام کے دوران ہی میں نے جو نئی دنیا دریافت کی تھی۔ اسی کا اثر تھا جب شاہ صاحب نے ایک روز ناشتے کے دوران ابا سے اچانک کہا۔

''یار سکندر! تم اپنی بٹو کو اسکول کیوں نہیں بھیجتے۔''

''اسکول؟'' ابا نے حیرت سے کہا تھا۔

''ہاں تو اور کیا! ساتھ والے چک میں یہاں کی لڑکیاں پڑھنے نہیں جاتی کیا۔''

''جاتی ہیں' مگر عائشہ اور اسکول۔'' ابا کے لیے یہ یقیناً اچنبھے کی بات تھی۔

''یہ کون سا زمانہ ہے سکندر! اس بات پر حیرت کے اظہار کا' تمہیں بٹیا کو میرے کہنے سے پہلے ہی اسکول بھجوا دینا چاہیے تھا۔'' اب کے شاہ صاحب نے ذرا خفگی سے کہا۔ ابا خاموش رہے۔

''تم خود پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی ہو' پھر تمہاری بیٹی اتنی ذہین اور ٹیلنٹڈ ہے تمہیں تو خود اس بات کو سمجھنا چاہیے۔''

''ہاں یہ تو ہے مگر میرے خاندان کی روایت۔'' ابا نے سوچتے ہوئے کہا۔

''خاندان کی روایت کو چھوڑو اور یہ سوچو کہ کیا تمہارا دل اس بات کو نہیں مانتا۔ عائشہ ابھی تک تمہاری اکلوتی اولاد ہے اس کو یوں جاہل رہنے دو گے تم کو اس جگہ پر جو مقام حاصل ہے تمہیں تو مثال بننا چاہیے تا کہ دوسرے لوگ انسپائر ہو سکیں' تمہیں تو اس معاملے میں راہنما بننا چاہیے۔''

اب شاہ صاحب نے اس گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑا۔

''میں اکثر سوچتا ہوں' مگر کچھ ہمت نہیں پڑتی' کبھی خیال آتا ہے کہ جو کچھ خود پڑھا ہے وہ گھر ہی پر اسے بھی پڑھا دوں۔'' ابا نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہرگز نہیں سکندر! بچہ اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر جتنی تیزی سے سیکھتا ہے' اتنا تنہا نہیں سیکھ سکتا یہ میرا مشورہ ہے یاد رکھنا۔ اس بچی کو پڑھنے کی طرف لگاؤ' یہ بے حد ذہین اور متجسس بچی ہے۔ اس کے تجسس کو کسی مثبت کام کی جانب استعمال کرو۔ ورنہ یہ خود بھی ضائع ہو جائے گی اور مجھے ڈر ہے کہ کچھ اور بھی ضائع نہ کر دے۔''

مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد ہے مجتبیٰ حسین صاحب! اس لیے کہ یہ گفتگو میرے آگے بڑھنے کا نقطہ آغاز تھی۔

ابا نے اس کے بعد شاہ صاحب سے نہ تو کوئی بحث کی اور نہ ہی ہاں یا نہ کہا بس اگلی صبح مجھے قصبے کے گرلز اسکول میں داخل کروا آئے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اماں نے ابا کے اس اقدام پر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ یہ ان کے دل کی وہ خواہش تھی جو وہ خود سے ابا سے کہہ نہیں سکتی تھیں۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ اکثر شاہ صاحب کو دعائیں دینے لگی تھیں۔ ہاں! چچا انور نے جو ددھیال میں میرے اکلوتے رشتہ دار ابا کے فرسٹ کزن تھے۔ اس بات کو کچھ اتنا پسند نہیں کیا تھا۔

اس کے بعد کی کہانی بڑی روایتی سی ہے۔ قصبے کا اسکول' چند ایک لڑکیاں' جن کا آئی کیو لیول خاصا ماٹھا تھا اسی قسم کی استانیاں اور پھر میں' گھر کا تقریباً پڑھا لکھا ماحول' شاہ صاحب کی معاونت' ذہن دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ ہر کلاس میں اس پیمانے پر فرسٹ کلاس رزلٹ' میرے ذوق وشوق اور استانیوں کے کمنٹس سن کر ابا کا شوق بھی بڑھا اور انہوں نے مجھے ملتان سے نت نئی کہانیوں والی اور معلوماتی قسم کی کتابیں لا کر دینا شروع کر دیں میں کتابوں کی دنیا میں مگن ہو گئی۔ کیونکہ اس پسماندہ چک کی کوئی دوسری دنیا مجھے اب اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی تھی۔

سال دو سال گزرنے کے بعد میرے اندر کی جستجو کو جلا ملنے لگی اس دوران کبھی کم کبھی زیادہ وقت کے لیے شاہ صاحب ہمارے گھر آتے رہے اور ان کی آمد میری جستجو' میرے علم اور میری اپنے اطراف میں اہمیت بڑھا دیتی تھی۔ وہ کراچی سے میرے لیے رنگارنگ کتابیں' ڈکشنریاں اور نقشے لاتے' یہ کتابیں تاریخ' جغرافیہ' سائنس' معلومات عامہ اور گھڑی ہوئی کہانیوں سے بھری

ہوتیں۔

''انگریزی پڑھنے اور بولنے کی کوشش کیا کرو بیٹی' یہاں یہ چیز تمہیں اتنی آسانی سے نہیں ملے گی' تمہارے اسکول کی استانیاں خود بھی اس زبان میں مہارت نہیں رکھتیں' تمہیں کیا سکھائیں گی' حالانکہ یہ زبان آگے جا کر قدم قدم پر تمہاری مدد کرسکتی ہے۔''

شاہ صاحب کہتے تھے اور جتنے دن وہ ہمارے ہاں رہتے مجھے انگریزی پڑھاتے اور میں الٹی سیدھی گٹ مٹ کرتے خود کو ملکہ ایلزبتھ سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ ان کتابوں' انگریزی زبان کی گٹ مٹ اور سب سے بڑھ کر شاہ صاحب کے لائے ہوئے کھلونوں' رنگ برنگی ٹافیوں اور سجے سجائے چاکلیٹس کے ڈبوں نے میری ساتھیوں اور چک کے لوگوں میں مجھے ایک خاص اور منفرد مقام عطا کر دیا تھا۔

ابا کے سوشل اسٹیٹس کی وجہ سے پہلے بھی یہ خصوصیت کچھ کم نہ تھی مگر اب جو صورت حال پیدا ہو رہی تھی وہ ایسی ہی تھی جیسے ایک گھر میں اس بچے کی ہوتی ہے جو باقی بچوں کی نسبت زیادہ لائق نکل آتا ہے۔ میں لائق تھی' ذہین تھی لوگوں کے بقول شکل صورت قد کاٹھ اچھا نکال رہی تھی' تعریف' تعریف' ہر طرف تعریف نے میرا دماغ ساتویں نہیں تو پانچویں آسمان تک ضرور پہنچا دیا تھا۔ میں ابا سے اور شاہ صاحب سے اپنی کامیابیوں کے انعام کے طور پر برملا اپنی ضرورت اور خواہش کی چیزوں کی فرمائش کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھار اگر شاہ صاحب اخبار اور فیملی پرچے لے آتے تو اس میں چھپی دھندلی دھندلی تصویروں کو دیکھ کر نئے فیشن کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے کپڑے بنانے بلکہ رحمت خالہ کو بتا بتا کر بنوانے لگی تھی۔ ''ایسی بالیاں' ایسے جوتے۔'' میں بلیک اینڈ وائٹ تصویروں والے اشتہاروں کی ماڈل لڑکیوں پر انگلی رکھتے ہوئے شاہ صاحب سے کہتی اور یہ ایک ایسی صورت حال تھی جو اماں کو کسی طور پر پسند نہیں آتی تھی۔

''دل مارنا سیکھو بیٹی! بیٹیوں کے لیے یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ وہ دل مارنا سیکھیں۔'' میری سیدھی سادی ماں دبے لفظوں میں مجھے ایک بڑے پتے کی بات بتاتی۔ مگر اس وقت میں عمر کے اس حصے میں تھی جہاں میری زندگی میں توقعات اور خواہشات کی دنیا میں انقلاب نیا نیا آیا تھا' میں نے دل مارنا سیکھنا تو کجا کبھی دھیان سے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی اور دل کی ہی سنتی رہی تھی جو نئے نئے چاؤ کرنے لگا تھا مگر پھر مجھے یاد آتا ہے کہ یہ صورت حال دو' تین سال ہی رہی غالباً چھٹی سے آٹھویں جماعت تک ہی۔ کیونکہ اس کے بعد شاہ صاحب کی آمد نے مجھے اچھے اردو فکشن اور اچھی مگر مختصر انگریزی کہانیوں کی دنیا میں مگن کر دیا تھا۔ کوئی بھی بندہ تصور کرسکتا ہے۔ جنوبی پنجاب کا ایک پسماندہ گاؤں اور وہاں کی کمسن لڑکی اعلیٰ قسم کی اردو نثر اور شاعری اس عمر میں پڑھ رہی ہے جس عمر میں اس کے ساتھ کی لڑکیاں معمول کی دو چار کتابیں مارے باندھے پڑھ کر زیادہ سے

زیادہ مڈل اسکول پاس کر لینے کی خواہش کرتی ہیں۔ وہ ورڈز ورتھ' کیٹس اور شیلے کی نظمیں اور شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اب جس دنیا میں' میں رہتی تھی' وہاں پر میرے اردگرد موجود کسی دوسرے فرد کا گزر ممکن نہیں تھا اسی صورت حال نے مجھے ایک نامحسوس قسم کی غیر مرئی تنہائی میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں جو پڑھتی تھی' محسوس کرتی تھی۔ وہاں پر موجود کسی دوسرے بندے سے اسے ڈسکس نہیں کرسکتی تھی' نہ ہی کسی کو سمجھا سکتی تھی۔ کیونکہ میرے علاوہ وہاں پر اور کسی کو ان باتوں میں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ یوں میں نے اپنے اردگرد کچھ ایسے تخیلاتی کردار تشکیل دیے جو مختلف علوم کے ماہر ہوسکتے تھے۔ میں تصور ہی تصور میں ان کرداروں سے وہ سب باتیں ڈسکس کرتی جو کتابوں میں پڑھتی تھی' اس کا ایک نقصان یہ ہوا اس تخیلاتی دنیا سے باہر آ کر دنیا مجھے اجنبی محسوس ہوتی' میں نے اپنے ماحول میں ایٹ ہوم محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ واقعہ یہ بھی ہوا کہ اپنے ماحول میں جو انفرادیت اور اہمیت کا احساس مجھے ملنے لگا اس نے مجھے ایک خاص قسم کے گھمنڈ اور فخر میں مبتلا کر دیا۔ میں نے خود کو منفرد اور بلند سمجھنا شروع کر دیا تھا نتیجتاً باقی لوگوں کی شخصیتیں مجھے چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم لگنے لگیں۔ آج سوچا ہے تو دل میں خیال گزر رہا ہے کہ شاید تباہی کا آغاز اسی احساس سے ہوا تھا' ہاں! یہ حقیقت ہی تو ہے کہ جب ہم انسانوں کو اپنے ظرف سے زیادہ ملنے لگے تو ہم اس کو ہضم نہیں کر پاتے اور جب ہم ہضم نہیں کر پاتے تو تباہ ہو جاتے ہیں' میں بھی وہاں سے چلی اور یہاں پہنچ گئی جہاں سے آگے کوئی گڑھا کوئی کھائی باقی نہیں رہی۔

ایک انقلاب ابا کی سوچ میں بھی آیا تھا اور یہ وہ انقلاب تھا جس نے ان سے اپنی علاقائی' روایتی اور خاندانی تعصبات سے بغاوت کرائی تھی۔ بیٹی کی پیدائش پر مسرت کا اظہار کر کے انہوں نے اپنی روش سے ہٹ جانے کا ہلکا سا مظاہرہ تو بہت پہلے کر ہی دیا تھا۔ پھر خالہ رحمت کے بقول یہ ہماری بیٹی ہے' اللہ کے گھر سے آئی ہے۔

رحمت خدا کی ہے وغیرہ وغیرہ پر بے شک' بے شک کی گردان بھی اس روایت کے خلاف تھی جو اس علاقے میں صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ میری تعلیم کا آغاز بھی اسی قسم کی بغاوت تھی۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے پڑھنے میں یوں غرق دیکھ کر اور میرے یوں پوزیشن پر پوزیشن لانے پر ابا میرا سایہ ہی بن گئے۔ آٹھویں کا امتحان نمایاں نمبروں کے ساتھ پاس کرنے اور وظیفہ لینے پر ابا نے گھر میں مجھے ایک علیحدہ کمرہ بنوا کر دیا میں نے اس کا نقشہ شاہ صاحب کے لائے ہوئے رسالوں میں موجود تصویرون سے دیکھ دیکھ کر خود بنایا تھا۔ اس کمرے کی الماری' میز' کرسی' اس میں بچھائی گئی دری سب رسالوں کی تصویروں کی نقل میں جو مجھ سے کاغذ پر تراشا جاسکا اس کے مطابق بنوائی گئی۔

اب یاد کرتی ہوں تو انگلیاں چبا لینے کو جی چاہتا ہے' یہ انگلیاں اس شخص کی شفقت' لفظوں میں

لکھ رہی ہیں جو میرے بعد ایک لمحہ بھی سر اٹھا کر نہ جی سکا ہوگا- میری زندگی اس کی خواہشات اور توقعات کا قبرستان بن گئی اور وہ خود نجانے کہاں کس خاک میں دبا بے چین ہوگا-

''شی' شی' چپ کرو' بی بی پڑھ رہی ہے-''

''بی بی سو رہی ہے-''

اماں جو میری خواہشات اور فرمائشوں والے فیز میں تعلیم کے متعلق اپنی Reservations رکھنے لگی تھیں میرے یوں پڑھنے اور پڑھتے ہی رہنے پر دوبارہ پر مسرت اور مطمئن زندگی گزارنے لگی تھیں اور میرے کمرے سے باہر کسی کو بولتے سن کر یوں چپ کراتیں جیسے کسی سے کوئی گناہ ہو گیا- وہ شاہ صاحب سے ابا کے ذریعے میرے لیے فرمائش کر کر کے کپڑے' سویٹر اور جوتے منگواتیں اور مجھے وہ سب پہنے دیکھ کر خوش ہوتیں-

''اللہ رکھے تیرہواں سال لگا ہے' بی بی کو کچھ چولہا چوکا ہی سکھا لو بے بے جان!'' خالہ رحمت اماں سے کہتیں-

''چولہا ہانڈی-'' اماں برا مان کر ناگواری سے کہتیں ''چولہا چوکا تو ساری لڑکیاں ہی کرتی ہیں- رحمتے میری بیٹی تو پڑھ رہی ہے-'' انہوں نے مجھے کبھی واقعی چولہے ہانڈی کے قریب نہیں جانے دیا تھا-

اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ سب کچھ جو میں نے کیا اس کے بعد اماں نے اپنے اس فارمولا آف اوورکیئر کے بارے میں کیا سوچا ہوگا-

ان نازنخروں میں جھولتی' تخیلاتی دنیا کے تخلیق شدہ کرداروں سے مکالمے کرتی پڑھتی پڑھاتی میں میٹرک میں پہنچ گئی- یہ سال بہت قیمتی اور اہم تھا- اس سال میں میرے متعلق ہونے والی ہر بات کو بہت پھونک پھونک کر کیا جانے لگا مبادا میرا مزاج کسی بات پر بگڑ جائے اور میرا ہونے والا امتحان متاثر ہو جائے- اس سال مجھے یاد ہے کہ اماں مجھے دودھ اور بادام سے پالتی رہیں' سیب اور گاجر کے مربے کھلاتی رہیں- مکھن اور دیسی گھی سے بنی غذائیں' تازہ پھل (دنیا کی تمام نعمتیں دنیائے اول کے اس جدید ملک میں مجھے میسر ہیں مگر پھر بھی وہ سب چیزیں جو خواب ہو چکیں کبھی مل نہ پائیں گی) بھلا اماں سے کوئی پوچھتا کہ اگر میں میٹرک کے امتحان میں ملتان بورڈ میں ٹاپ کر جاتی تو کیا فرق پڑ جاتا تھا کیونکہ ان کی پلاننگ آف لائف میں اس سے آگے میری تعلیم کا کوئی نظریہ نہیں تھا-

میرے ان چاؤ چونچلوں کے ساتھ ساتھ وہ گڈ اولڈ مدر نیچر کے تحت ٹرنک' پیٹیاں اور صندوق میرے جہیز کی چیزوں سے بھرتی جا رہی تھیں' کشیدہ کاری سے مزین بیڈ کورز' ملتان کے کھیس اور دریاں خاص ڈوروں والے لحاف' چارپائیوں کے رنگین پائیوں کی کئی جوڑیاں' نت نئے ڈیزائنوں

کے ازار بند اور پراندے- یہ سب خزانہ کہاں اور کیسے خاک ہوا ہوگا- میں نہیں جانتی مگر اس خزانے کے ساتھ جو آرزوئیں' اعتماد' مان اور ارمان خاک ہوئے ہوں گے ان کا حساب میں کیسے دے پاؤں گی' سوچتی ہوں تو فل وولٹ کرنٹ جسم میں دوڑتا محسوس کرتی ہوں-

میٹرک والے سال میں میری آؤ بھگت جو ہوتی رہی' وہ بجائے خود ایک قابل ذکر واقعہ ہے- مگر ایک اور اہم واقعہ اس سال کا ذہن میں جو آ رہا ہے وہ یہ تھا کہ کیونکہ میں اپنے ماحول کی اہم ترین لڑکی گردانی جاتی تھی اس لیے عموماً وہاں ہونے والی تقریبات میں شرکت نہیں کیا کرتی تھی- شادی بیاہ تو درکنار میں عید بقر عید پر بھی خصوصی جوڑا پہن کر کتابیں لے کر بیٹھ جاتی تھی- اس کی ایک وجہ تو وہ تھی جو بظاہر نظر آتی تھی' مگر ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ہجوم میں خود کو بے جگہ محسوس کرتی تھی-

شاہ صاحب کے طفیل میں اس عمر میں ہی اتنا کچھ پڑھ چکی تھی کہ مجھے عام روٹین کی باتیں کچھ اتنا زیادہ اٹریکٹ نہیں کرتی تھیں- ہر اہم بات اور واقعہ میرے لیے معمول کی بات ہوتی تھی- محفلوں میں جا کر میں خود کو ایک تنہا روح محسوس کرتی تھی- یہ ٹین ایج کی جذباتیت کی انتہا تھی- اب میری ذہنی عدم موجودگی کے عموماً اور تقریبات میں خصوصاً عدم شرکت کے تمام لوگ ہی عادی ہو چکے تھے-

مگر وہ چچا انور کے بڑے بیٹے امتیاز کی شادی تھی- جس میں میں اسی طرح ذرا کی ذرا شریک ہوئی تھی- چچا انور ابا کے فرسٹ کزن تھے- ابا اپنے والدین کے تین بیٹیوں اور دو بیٹوں میں سے بچ جانے والی واحد اولاد تھے- ننھیال میں بھی یہ ہی حال تھا- ایک ماموں اوکاڑہ میں رہتے تھے جو جب میں ساتویں جماعت میں تھی عارضہ تپ دق میں وفات پا گئے- ان کے بعد ممانی اپنی اکلوتی بیٹی سمیت میکے سدھار ا- یوں ننھیال کا کام تمام ہوا-

اب ایسے قحط الرشتہ داراں میں چچا انور جیسا باوفا فرسٹ کزن ابا کو کہاں ملنے والا تھا- مگر میرے دل کا کیا کیا جاتا جس کی ترجیحات میں چچا انور کہیں بہت نچلے نمبر پر آتے تھے-

امتیاز کی شادی میں میری مہمانوں کی طرح شرکت سے میری زندگی کی کہانی میں ایک اور قابل ذکر کردار کی انٹری ہوئی- یہ چچا انور کا دوسرے نمبر کا بیٹا اعجاز تھا- اعجاز قصبے کے بوائز اسکول سے آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تھا اور اس وقت ابا اور چچا کے ساتھ زمین کی دیکھ بھال ہی کیا کرتا تھا- اس سے پہلے کیونکہ مجھے معلوم تھا میرے پڑھنے پر چچا انور کے اعتراض کا پس پردہ محرک اعجاز ہی تھا اس لیے میری ترجیحات کی فہرست میں اعجاز بھی ایک ناپسندیدہ کردار تھا-

اعجاز نے امتیاز کی شادی میں میری اس طرح شرکت پر خاصا فساد کھڑا کیا تھا- اس کی گفتگو جو میری عدم موجودگی اور اماں کے روبرو ہوئی تھی یقیناً گستاخی اور بدتمیزی کا مرقع ہوگی کیونکہ وہ عام

زندگی میں بھی جب بات کرتا تو ایسا ہی لگتا جیسے کوئی بدتمیز شخص بول رہا ہو- جو کچھ بھی اس نے کہا اماں اس کی باتیں سن کر دل برداشتہ ہو کر گھر چلی آئیں اماں اور ابا کی ایک خفیہ قسم کی میٹنگ ہوئی اور میں نے دیکھا کہ ابا کچھ پژمردہ اور پریشان نظر آئے- وہ کون سی وجہ تھی جس نے ابا کو یوں پریشان کیا یہ جاننے کی میں نے کوشش نہیں کی کیونکہ کوئی بات اگر خود سے میرے کان میں پڑ جاتی تو میں سن لیتی کسی بات کی کھوج میں جانے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی- اب یہ بات لکھ رہی ہوں تو خیال گزر رہا ہے کہ اگر اس وقت' وقت پر صورت حال جان لینے کی کوشش کر لیتی تو حالات سے نبٹنے کی کوئی لانگ ٹرم ترکیب لڑا لینے کا وقت مل جاتا' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پچھتاوے اور غور و فکر اسی وقت دماغ میں سماتے ہیں جب ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی-

ہاں! البتہ یہ ضرور تھا کہ مجھے اس بات کا غصہ بہت دیر تک رہا تھا- میٹرک کے امتحان کے دوران اور اس کے بعد بھی میں نے چچا انور چچی رشیدہ اور خصوصاً اعجاز سے ضرورت کے علاوہ کبھی بات نہیں کی تھی-

''اسی لیے تو پرانے لوگ لڑکی کی تعلیم کے خلاف ہوا کرتے تھے' لڑکیوں کا دماغ خراب ہوتے کون سا دیر لگتی ہے-''

چچی رشیدہ میرے اس رویے پر نخوت سے کہتیں اور ان باتوں کو سن کر میرا دل اس ماحول سے اڑ کر کہیں اور چلے جانے کو چاہتا- میرے ساتھ کی لڑکیاں کشیدہ کاری کرتے ہوئے' پانی لاتے ہوئے' لکڑیاں چنتے ہوئے' مٹی کے چولہوں میں لکڑیاں اور اپلے جما کر آگ جلاتے ہوئے' ہنڈیاں بھونتے ہوئے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرنے اور نوخیز جذباتی سوچوں کو ڈسکس کرتے ہوئے دن گزار رہی تھیں- جبکہ میں کورس کی کتابوں کے علاوہ کرشن چندر' اے حمید' بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا ادب پڑھتی تھی- شاہ صاحب نے جتنی توجہ مجھے انگلش پڑھانے پر دی تھی اس کا ہی نتیجہ یہ تھا کہ میں انگلش کلاسکس کے بے شمار اختصاریے پڑھ چکی تھی- اپنا کورس میں اتنی مرتبہ پڑھ چکی تھی کہ مجھے حرف بحرف رٹا ہوا تھا- اسی لیے میں دن گن گن کر گزارتی کہ کب امتحان ہوگا-

خدا خدا کر کے امتحان کے دن آئے اور امتحان بخوبی گزر بھی گیا- میں اپنے رزلٹ کے بارے میں قطعی فکر مند نہیں تھی- میں نے اپنے ساتھ کی لڑکی سے کہہ کر اس کے بھائی کا ایف اے کا کورس بھی منگوا لیا تھا اور امتحان کے بعد کے فرصت کے لمبے لمبے دن میں نے وہ کتابیں پڑھنے میں گزار دیں-

پھر میٹرک کا رزلٹ آیا اور میں نے ملتان بورڈ میں دوسری پوزیشن لی- اخبار کے نمائندے جب اسکول میں میرا انٹرویو لینے آئے تو اسکول کی یہ حالت دیکھ کر کہ وہاں کسی ایسے مہمان کو

بٹھانے کا بھی مناسب انتظام نہیں تھا- حیران رہ گئے- یہ بھی ایک عجوبے کی بات تھی کہ ایسے ادارے کی طالب علم لڑکی اتنے نمبر لے گئی میرے انگلش میں نمبر دیکھ کر خود میری ٹیچرز بھی حیران تھیں- میں دل ہی دل میں خوش تھی مگر مجھے اپنے دل کے اندر کی بات کہنے کا اس وقت کوئی کمال حاصل نہیں تھا- ہمارے گھر میں اس موقع پر خوشی کا ایک محدود سا سماں تھا یہ بھی اتفاق تھا کہ میں جس جگہ سے متعلق تھی' وہاں اس واقعے کی اہمیت کا دوسرے لوگوں کو کوئی خاص احساس نہیں تھا- یہ سال 1972ء کا واقعہ ہے- اب تو خیر وہاں بھی انقلابات زمانہ نے بہت سی تبدیلیاں ضرور پیدا کی ہوں گی- کیونکہ یہاں بیٹھے اکثر سننے میں آیا ہے کہ ''ایوریج پاکستانی لڑکی کا شعور بھی اب خاصا بلند ہو چکا ہے-''

خیر اس رزلٹ پر گرد و نواح میں جو ہوا سو ہوا مگر میری زندگی کے کینوس پر تفکر کا ایک رنگ گہرا ہونے لگا- آگے کیا ہوگا کا تفکر' شاہ صاحب نے مجھے تعلیمی اداروں کے حوالے سے لاہور کے اتنے سبز باغ دکھائے تھے کہ اپنے اردگرد کے اچھے اچھے اسکول و کالج میں میری نظر میں کبھی سما نہ سکے تھے-

''اور کالجز کا کالج کینئرڈ کالج ہے-'' ایک بار انہوں نے مجھے کینئرڈ کالج کی عمارت کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا تھا- ''اتنی محنت کرو کہ یہاں تمہارا داخلہ ہو سکے-''

یہ شاہ صاحب کی ہی باتوں کے طفیل تھا کہ جنوبی پنجاب کے اس پسماندہ گاؤں کی باسی ہونے اور کبھی وہاں سے نکل نہ سکنے کے باوجود میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی پاکستان ہی نہیں آدھی دنیا کی سیر کر رکھی تھی- کچھ کمال اس چھوٹے ریڈیو سیٹ کا بھی تھا' جو آٹھویں جماعت پاس کرنے پر انہوں نے ابا کی اجازت سے مجھے لے کر دیا تھا- اس پر مجھے چند ڈاکومینٹری پروگرام' کبھی کبھی غزلیں سننے اور ایک آدھ بار مشاعرہ اور ڈرامہ سننے کی اجازت تھی- خدا گواہ ہے کہ میں نے اجازت کی ان حدود سے باہر نکلنے کی اس وقت کبھی کوئی کوشش نہیں کی تھی- اس بات میں ابا سے ڈر کی وجہ شامل نہیں بلکہ وجہ وہ کمٹ منٹ تھی جو میں نے پہلی بار ریڈیو سنتے ہوئے ان سے کی تھی کہ میں کبھی کبھار اسے سنا کروں گی-

کینئرڈ کالج میں داخلے کی خواہش تو ایک طرف مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں آگے پڑھنے کے بارے میں کیا سننے والی ہوں- رزلٹ کی ساری خوشی اور انعام و اکرام کے سارے سلسلے میں اس بات کا کبھی ذکر نہیں کیا گیا تھا-

میں لاشعوری طور پر شاہ صاحب کی آمد کی منتظر تھی' مگر ان کو دسمبر میں آنا تھا' میری کامیابی پر ان کا مبارکباد کا تار ہم وصول کر چکے تھے- ان ہی دنوں میں' میں نے محسوس کیا کہ گھر میں چچا انور کی فیملی کی آمد و رفت بڑھنے لگی تھی اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اماں اپنے معمولات کے دوران اپنی

بڑی بڑی غلافی آنکھیں اٹھا کر کبھی کبھار مجھے تفکر کی نظر سے دیکھنے لگی تھیں- ان کے چہرے اور ہونٹوں کے سکوت سے مجھے کچھ وحشت سی ہونے لگی تھی-

''آگ جلانا' دودھ سنبھالنا ہی سیکھ لو'' ایک دن اچانک انہوں نے مجھ سے کہا اور میں جو ٹیل آف ٹو سٹیز کا اردو ترجمہ پڑھنے میں مشغول تھی ایک دم چونک گئی-

''کیوں؟'' یہ سوال بے جا تھا مگر میں نے پھر بھی کیا-

''یونہی لوگ باتیں بناتے ہوں گے کہ لڑکی کو کوئی کام کرنا نہیں آتا-''

''کون لوگ؟'' مجھے اس طرح کے گھریلو گوسپس سے سخت چڑ تھی-

''کوئی بھی کل رشیدہ کہہ رہی تھی-'' ان کی بات ادھوری سن کر میں وہاں سے اٹھ آئی-

''ایک تو یہ چچا انور اور ان کی فیملی کا علاج ہونا چاہیے-'' دسمبر میں جب شاہ صاحب آئے تو میں نے یہ ساری باتیں بمعہ امتیاز کی شادی والے واقعہ کے ان کے گوش گزار کیں- نجانے کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ کسی بات کے چھڑنے پر میں اس ساری فیملی کو کھری کھری سناؤں-

''ہر جگہ علم' زبان اور لفظ بگھارنے کی کوشش مت کیا کرو' جو کام اور جو بات بڑوں کے کرنے کی ہے وہ چھوٹے منہ سے ادا ہو جائے تو صدیوں پر محیط ناتے ٹوٹ جاتے ہیں' جہاں فہم و فراست مصلحت اور خاموشی سے کام چلایا جا سکتا ہو وہاں بے صبری' الفاظ اور جذباتیت دکھانے کی کوشش احمقانہ ہوتی ہے-'' مجھے یاد ہے اس سال دسمبر میں شاہ صاحب کی آمد پر جب میں نے یہ واقعہ ان کے گوش گزار کیا تو انہوں نے مجھے یہ جواب دیا جو مجھ کم فہم کی سمجھ میں کسی طور پر نہ آیا مگر میں نے مزید کوئی سوال نہ کیا- کیونکہ اب میرا ذہن اس سال دسمبر میں ہونے والے سالانہ ختم میں الجھا ہوا تھا جس میں شریک ہونے کے لیے شاہ صاحب اس بار خاص طور پر آئے تھے-

یہ میٹرک کے رزلٹ کا کمال تھا کہ میرا دماغ کچھ اتنے ٹھکانے پر نہیں تھا' یہ اور بات تھی کہ میرے دل کے اندر کے فخر' مسرت' دکھ' خفگی کا اظہار کبھی میرے روزمرہ کے معمول میں نہیں ہوتا تھا- ذاتی طور پر میں ایک (دروں بین) Introvert لڑکی تھی- میں شاہ صاحب کی آمد کی منتظر اس وقت سے تھی جب سے میرا رزلٹ آیا تھا- میں اپنی اس کامیابی پر خوش اور ان کی احسان مند تھی- شاہ صاحب نے میری کامیابی پر مجھے اللہ کے نام سے مزین لاکٹ اور سونے کی چین دی تھی-

اس سے پہلے ابا مجھے سونے کی چار چوڑیاں اس کامیابی پر بنوا کر دے چکے تھے- اماں نے پورے گاؤں میں دیسی گھی کی جلیبیاں بانٹی تھیں- غالباً اسی خوشی میں اس سال ابا نے سالانہ ختم زیادہ دھوم دھام سے منایا تھا- صبح نیند سے بوجھل آنکھیں لیے جب میں چھت سے نیچے اتری- تو مہمان خانے میں سے اونچی اونچی آتی آوازیں کان میں پڑیں' اپنا نام سن کر میں چونک گئی اور کان

لگا کر سننے کی عمر بھر میں پہلی کوشش کی- میری سمجھ میں کوئی بات تو نہیں آئی مگر مجھے یہ ضرور پتا چلا کہ اندر ابا اور شاہ صاحب کے علاوہ چچا انور اور بھائی امتیاز بھی موجود تھے-

اسی شام کو ابا اور شاہ صاحب انگیٹھی سینکتے ہوئے جب تصوف اور روحانیت کی باتیں کر رہے تھے میں ان کے لیے چائے لے کر گئی- میں ان کی باتوں کو سن کر نتائج اخذ کر رہی تھی جب شاہ صاحب نے میرے آئندہ مستقبل کا ذکر چھیڑ دیا-

''میرا خیال ہے کہ عائشہ نے اب کافی تعلیم حاصل کر لی-'' میں نے دیکھا کہ ابا کا انداز شکستہ' ہارا ہوا اور لہجہ بجھا ہوا تھا-

''عائشہ کو ہم لاہور بھیجیں گے کالج میں پڑھنے کے لیے' شاہ صاحب نے رعب دار آواز میں کہا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا- یہ بات تو میں نے خود بھی کبھی نہیں سوچی تھی-

''یہ بات ناممکن ہے؟'' ابا نے سر جھکا کر کہا-

''سب کچھ ممکن ہوتا ہے سکندر! جہاں اتنی ہمت کی وہاں تھوڑی اور دکھاؤ' بات تو ایک قدم بڑھانے کی ہے-'' شاہ صاحب نے کہا- ''اتنی ذہین اور ٹیلنٹڈ لڑکی گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا کوئی دانشمندی تو نہیں-''

''نجانے کہاں کہاں' کون کون سے جوہر خاک میں رل رہے ہیں'' ابا کی یہ بات ٹھک سے میرے دل کو لگی یہ ایک تاریخی جملہ تھا-

''ان جوہروں کو شناسا آنکھ نہیں ملی' ان کو کوئی پہچان نہیں سکا' ہم قدر شناس لوگ ہیں سکندر! ہمیں اس جوہر کی قدر کرنی چاہیے' اس کی تراش خراش اس کو قیمتی اور انمول بنا دے گی-'' شاہ صاحب نے کہا تھا- آہ یہ جملہ لکھا ہے تو پیٹ میں میری آنتیں الجھے ہوئے اون کا گچھا بن کر گرہ گرہ ہو گئی ہیں' شاہ صاحب بے چاروں کو کیا علم تھا کہ اس جوہر کی تراش خراش کیا طوفان اٹھانے والی ہے-

''مگر یہاں جو طوفان اٹھے گا وہ-'' ابا نے سوالیہ نظروں سے شاہ صاحب کو دیکھا-

''پروا مت کرو- جب کسی معمول کی زندگی میں کوئی نئی بات رونما ہوتی ہے تو طوفان تو اٹھتے ہی ہیں وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ ایک سا ہو جاتا ہے'' شاہ صاحب نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا-

پھر اس راستے میں کیا کیا کانٹے نہیں بکھرے چچا انور کا واویلا' اعجاز اور امتیاز کی غصے بھری سرخ نظریں چاچی رشیدہ کی باتیں اور سب سے بڑھ کر اماں کی مخالفت اماں نے بے حد شدومد سے اس بات کی مخالفت کی تھی- ان کے خیال میں یہ روایات سے بغاوت تھی- ہمارے علاقے کا تو کوئی لڑکا بھی لاہور پڑھنے نہیں گیا تھا کجا میں- انہوں نے خوب ہی شور مچایا- ابا کچھ خاموش سے تھے' درحقیقت وہ شاہ صاحب کے لیکچرز کا مقابلہ نہیں کر پائے تھے میری سمجھ میں آج تک نہیں

آیا کہ مجھے اس طرح روایات، مجبوریوں اور مصلحتوں سے بغاوت کروا کر پڑھانے میں شاہ صاحب کا کون سا مفاد تھا یا ان کو کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

حیث وبیض کی یہ ایک طویل جنگ تھی جس کا دورانیہ پندرہ بیس دن پر محیط تھا ابا کا خیال یہاں آ کر رک گیا کہ مجھے ملتان گرلز کالج میں داخل کروا دیا جائے۔ مگر شاہ صاحب کا خیال اس سے آگے پرواز کرتا تھا۔

''اسے لاہور داخل کرانا ہے میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میری کوئی بیٹی ہوتی تو اس کو کینئرڈ کالج میں داخل کرواتا۔ میں اس کالج کی عمارت کو دیکھتا ہوں تو یہ خواہش بڑھ جاتی ہے۔ خدا نے مجھے بیٹی دی نہیں بھائیوں بہنوں کی اولادوں میں کوئی لڑکی اس قابل نہیں نکلی سکندر! میری نظر نے جو اس بچی کو چھ سال کی عمر میں بھانپا تھا تو اس کی عمر کے ساتھ ساتھ میری یہ خواہش بھی بڑھتی اور پھلتی پھولتی گئی ہے۔ میں نے اتنے سال عائشہ پر یونہی محنت نہیں کی' اس کا ذوق وشوق اور لگن اسی قابل ہے کہ اسے ایک اچھا بہت اچھا ادارہ ملے' یہ اپنے لیے جو بھی سیدان انتخاب کرے گی' اس میں نام کمائے گی'' شاہ صاحب نے پریقین لہجے میں کہا تھا۔

''جب یہ اتنا پڑھ لکھ جائے گی۔ اتنی قابل ہو جائے گی تو اس کو بیاہو گے کس سے۔ پہلے تھوڑی الجھنیں ہیں۔'' اماں نے ایک نیا خدشہ ظاہر کیا اور پھر خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

''ہوں' ہوں۔'' ابا سوچتے ہوئے کہتے رہے۔

'تو پھر یوں ہے کہ تمہیں شاہ صاحب کے کہنے پر لاہور میں داخل کروا دیتے ہیں۔'' اسی شام ابا نے فیصلہ کن لہجے میں براہ راست مجھے مخاطب کر کے کہا ''گو اس بات سے بہت سی الجھنیں کھڑی ہوں گی۔ یوں بھی بیٹی کو اتنے دور دراز بھیج دینا دانشمندی نہیں مگر میں یہ جانتا ہوں کہ کچھ دنوں سے یہ خواہش خود تمہارے دل میں بھی ابھری ہے کہ ایسا ہو جائے۔ میں نے عرصہ پہلے خود سے اپنے اللہ کے حضور یہ عہد کیا تھا کہ تمہاری ہر جائز خواہش کو پورا کروں گا۔ اس وقت سے مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی خود سے بدعہدی کا مرتکب ہوا ہوں' تمہاری یہ خواہش ناجائز نہیں مگر قدرے نامناسب ضرور ہے۔ ہمارے علاقائی حالات روایتوں سے ہٹ کر نہیں چل سکتے۔ شاہ صاحب کے بقول پہلا قدم کہہ دینے کو آسان بات ہے مگر کرنے کو بہت مشکل خدا نے میری ذات کو اپنے علاقے کے حوالے سے بڑی ذمہ داری عطا کی ہے۔ یہ بھی اس کا احسان ہے کہ لوگ میری بات کو سنتے اور مانتے ہیں۔ مجھ سے کوئی قدم غلط اٹھ گیا تو کچھ ذہن بھٹکیں گے باقی شکوک کا شکار ہو جائیں گے پھر انور ہے جو کیسا بھی سہی میرا دست و بازو ہے۔ وہ ہر اس کام میں میرا شریک ہے جو میں کرتا ہوں۔ اس کی مخالفت اور ناپسندیدگی میرے لیے بہرحال ایک اہم وجہ ہے کہ میں یہ قدم اٹھاتے ہوئے' ہچکچاؤں پھر تمہاری ماں ہے جو روشن خیال اور راضی بہ رضا عورت ہے اس بات

کے لیے اس نے بھی پس و پیش کی ہے جو اس کے اعتراضات اور خدشے ہیں وہ بھی کچھ اتنے بے جا نہیں ہیں۔ میں نے ہر بات کا پورا پورا جائزہ لیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ ہر چیز پر ایک چیز بھاری ہے۔ وہ عہد جو میں نے اپنے اللہ کے حضور تمہارے سلسلے میں کیا تھا۔ ہر بات کی حقیقت جان لینے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا دل یہ بات شدت سے چاہنے لگا ہے کہ تم لاہور جا کر پڑھو اور میں بھی ملتان کی نسبت یہ بہتر خیال کرتا ہوں کہ تم وہاں چلی جاؤ ملتان یہاں سے دور نہیں' مخالف' اور حاسد وہاں آتے جاتے رہیں گے۔ ہر بات پر نظر رکھیں گے اور جو بات کہیں نہیں ہو گی وہ بھی بنائیں گے۔'' مجھے علم تھا کہ وہ اتنی لمبی بات کہتے کہتے تھک جائیں گے اور وہ واقعی تھک سے گئے تھے۔

''مجھے معلوم ہے بٹیا! میں تم پر مکمل اعتماد کر سکتا ہوں' تم نے کبھی کوئی ایسی بات یا کام نہیں کیا جس پر مجھے کبھی شرمندگی ہو۔ تم اپنی عمر کی لڑکیوں سے زیادہ باشعور اور سمجھ دار ہو۔ زندگی کے تمام نہیں اور ہاں سے پوری طرح واقف ہو' میں تمہاری خواہش کے احترام کی خاطر ہر محاذ پر کھڑے ہونے پر راضی ہوں' لیکن ایک وعدہ آج تمہیں بھی خدا کا حضور خود سے کرنا ہو گا۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھا۔

''اور وہ یہ کہ جس نئی جگہ اور ماحول میں تم جاؤ گی' وہاں کے رنگ میں رنگنے کے بجائے اپنے خاندانی وقار اور روایات کا احترام ہر حال میں ملحوظ خاطر رکھو گی۔ فخر اس بات میں نہیں ہے کہ اپنے چولے اتار کر نت نئے چولے پہن کر اس زعم میں مبتلا ہو جایا جائے کہ دیکھو ہم نے خود کو بدل لیا' فتح اس بات میں ہے کہ دیکھو دنیا پر کیا کیا رنگ آئے اور گئے ہم وہی کے وہی رہے۔ جس کو انفرادیت کا نام دیا جاتا ہے وہ یہی ہے۔ تم یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ تمہارے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ہے' تم کو اپنے باپ کا' اپنے خاندان کا' علاقے میں اپنی حیثیت کا وقار ہر حال میں بلند رکھنا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب وہاں سے تم واپس لوٹو تو تمہارے ذہن میں تو علم کے وہ سارے خزانے ہوں جو میں خود چاہنے کے باوجود حاصل نہ کر پایا' مگر تمہارا دل تمہاری سوچ' تمہارا باطن اور ظاہر ایسا ہی ہو جیسے ہم لوگ ہیں اور بیٹا ایک آخری بات یہ ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھ کر تم مجھ پر ہی نہیں خود اپنے آپ پر بھی احسان کرو گی کیونکہ جب کوئی چیز اپنے بنیادی رنگ سے جدا ہوتی ہے تو پھر کوئی دوسرا رنگ اس پر اپنے اصل کے ساتھ نہیں چڑھتا۔ وہ چیز پھر پھیکی اور مصنوعی ہی نظر آتی ہے۔''

میں نے آج یاد کیا ہے تو بار بار خیال آیا ہے کہ اس وقت جب ابا یہ سب باتیں کر رہے تھے میں نے ان کو کچھ بہت زیادہ دلچسپی اور توجہ سے نہیں سنا تھا۔ میرے ذہن میں اس ساری گفتگو کے دوران ان کا پہلا جملہ ہی گھومتا رہا۔

''تو پھر یوں ہے کہ تمہیں شاہ صاحب کے کہنے پر لاہور میں داخل کروا دیتے ہیں-''

نصیحتیں اور گزارشات اس عمر میں کس کو اچھی لگتی ہوں گی خصوصاً مجھے جو اپنے تئیں ایک جہان نو میں زندگی بسر کرنے جا رہی تھی جہاں جا کر مجھے ان فرسودہ اور دقیانوسی نظریات سے نجات ملنے والی تھی- حیرت انگیز طور پر آج جب یہ داستان حیات لکھنے بیٹھی ہوں تو وہ ساری کی ساری گفتگو اپنے سیاق وسباق سمیت ذہن میں محفوظ یادوں کے قبرستان سے نکل کر چھم سے دماغ میں آ گئی ہے اور یہ بات بھی یاد آئی کہ اس وقت یہ گفتگو سنتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور بات یاد بن کر اتری اور وہ یہ کہ یہ باتیں سن کر مجھے مراۃ لعروس کا وہ خط یاد آتا رہا جو اصغری خانم کی شادی پر اس کے باپ نے اسے لکھا تھا اور میرے کم عقل ذہن نے یہ بات بھی سوچی تھی کہ کیا ان نصیحتوں کا کوئی مقصد اور نتیجہ بھی ہو سکتا ہے' وہ دور تھا جب باپ بیٹیوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس لیے کرتے تھے کہ عوام کا شعور اتنا پختہ اور بیدار نہیں تھا- ہمارا دور مختلف ہے' ہم ذہین اور باشعور لوگ ہیں ہمیں خود بھی معلوم ہے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا ہے میں اور اصغری خانم .... میں دل ہی دل میں ہنستی رہی تھی اور دور کہیں خلاؤں میں میرا آنے والا مستقبل مجھ پر ہنس رہا تھا-

''کیا اس قسم کی روایتی باتیں کرنا اور نصیحتوں سے چمٹے رہنا ایک قسم کی مریضانہ نفسیات نہیں-'' مجھے یاد آیا' میں نے ابا کو اپنی طرف سے احتیاط' احساس ذمہ داری وغیرہ وغیرہ کا یقین دلاتے ہوئے یہ بھی سوچا تھا-

غرض یہ کہ اس طویل حفاظتی' حجت ودلائل' وعظ ونصیحت کی جنگ کے بعد میں ایک ایسی دنیا کی طرف روانہ کی گئی جو قطعاً نئی اور اجنبی تھی- آپ کو یہ طویل داستان حروف بحرف سنانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ میرے بیک گراؤنڈ کی سائیکی اور سوچ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تا کہ میرے ساتھ آپ بھی وہ فیصلہ کرنے میں شریک ہو جائیں جو میری بعد کی زندگی کے حالات دہرائے جانے کے بعد کیا جانا چاہیے-

☆☆

آج دو دن کے بعد دوبارہ سے رائٹنگ ٹیبل فائل کور کے اندر دبے اس کاغذ اور قلم کی طرف توجہ کرنے کی ہمت خود میں پیدا کی ہے جس پر میں آپ کے اس مختصر سے سوال-

''یہ میں ہوں اور یہ میری کہانی ہے عائشہ نیازی! کیا اس سب کو سننے کے بعد اب آپ میری زندگی میں آنا پسند کریں گی؟''

کا جواب لکھنا چاہ رہی ہوں- یہ خط کیا ہے' ایک ایسی داستان حیات ہے جس کو سنائے بغیر آپ کے سوال کا جواب دیا نہیں جا سکتا- دو دن قبل قلم جہاں رکا تھا' اس کے رکنے کے بعد میں نے بہت سی باتیں سوچنے اور تڑپنے میں یہ دو دن گزار دیے- دراصل اتنے سالوں میں مجھے اپنی ہولناک

تنہائیوں' ذات کی تاریکیوں' اندرونی آوازوں اور سنسناتے سناٹوں کی عادت سی ہو چکی ہے' اس عادت میں انتشار کا پتھر آپ نے جب سے پھینکا ہے- میری ذات کے سمندر میں ایک نامانوس سا تلاطم تب سے برپا ہے- نئے سے نئے بھنورا بھرتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں-

آپ کے سوال نے مجھے برسوں بعد ایک شاہراہ خود آگاہی سے گزارا ہے- جبکہ اس سے پہلے میں دانستہ طور پر خود کو اتنے برس شاہراہ خواب گری سے گزارتی رہی ہوں- لیکن اس خط کے اولین صفحے لکھنے کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون بھی اپنے اندر محسوس کیا ہے- میں نے اتنا عرصہ اپنی ذات کے متعلق دروغ گھڑتے اور دروغ سناتے گزارا ہے-

میں نے اپنے کل اور آج کے بارے میں اتنی کہانیاں بنائی اور سنائی ہیں کہ مجھے خود بھی بھول سا گیا تھا کہ کل میں دراصل کیا تھی اور آج میں کیا ہوں- آپ کو یہ سب اتنے عرصے کے بعد سنایا ہے تو دل کے اندر لگی آگ جیسے کچھ ٹھنڈی پڑی ہے- اپنی ذات پر پڑی غلط بیانیوں کی گرد جھاڑ کر جب میں نے سچ کو اندر سے نکالا تو ساتھ ساتھ مجھے یہ یاد کر کے مسرت بھی ہوئی کہ میرا کل کیسا صاف معصوم اور پاکیزہ تھا اور یہ بھی کہ اس کل کی یاد اس گرد کے اندر ویسے ہی شفاف اور ستھری ہے- اب میں دوبارہ سے اس شاہراہ خود آگہی پر چلنا شروع کرتی ہوں- اس سے پہلے میرے ساتھ ساتھ آپ بھی اس پس منظر اور اس کی سائیکالوجی سے واقف ہو چکے ہیں جس سے میں متعلق تھی- اب آگے چلتے ہیں-

میں کینیئرڈ کالج میں بھجوا دی گئی- وہ میرا لاہور جانا بھی ایک یادگار واقعہ تھا- یوں تو خیر اب پاکستان میں لوگ وہاں سے پڑھنے کے لیے لنڈن اور امریکہ جانے والوں کو بھی رخصت نہ کرتے ہوں گے جیسے مجھے گھر سے لاہور رخصت کیا گیا- میرا ٹرنک' میرا سوٹ کیس' میرا بستر بند میرے بیک گراؤنڈ کا نقشہ پکار پکار کر کھینچ رہے تھے- کورے کھیس اور شوخ وچنچل رنگوں کے پرنٹ کے لحاف' دیسی گھی اور سوجی کی پنجیری کے ڈبے' گھر میں پسے خالص سرمے سے بھری سرمہ دانی' گھر کے بنے خالص سلیم کے ازار بند اور پراندے جن کی گرہیں اور ڈیزائن خالہ رحمت کی فنکارانہ صلاحیتوں کے غماز تھے' مختلف ٹانگوں کی کشیدہ کاری اور شیشے کے کام سے مزین بستر کی چادریں' گلابی اور اورنج رنگ کے تولیے غرض تاحد نگاہ میرا اور میرے ماحول کا کلچر بکھرا پڑا تھا-

اور اس وقت تک میری ذہن میں ایک بار بھی نہیں آیا تھا کہ یہ میرا سامان مضحکہ خیز ہے یا قابل فخر' میرے دماغ سے لاہور جانے اور کینیرڈ کالج میں پڑھنے کی بات نکلتی تو کوئی دوسری سماتی اماں اور خالہ رحمت کا فرط غم سے برا حال تھا' اماں کی نصیحتیں حیرت انگیز طور پر ابا سے بالکل مختلف تھیں-

''کھانا طریقے سے کھانا' بالوں میں تیل ڈالنا نہ بھولنا' صبح وشام کنگھی کرنا' چٹیا میں بارہ نہیں تیرہ بل ڈالنا- پوری روشنی میں پڑھنا' لیٹ کر یا ٹیک لگا کر نہیں بیٹھ کر پڑھنا-''

غالباً ان کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا گھر سے چلنے سے پہلے بیٹی کو وہ نصیحتیں کرنا ضروری ہیں جیسی اماں نے کی تھیں' کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان کی بیٹی روایات وغیرہ وغیرہ کی پاس داری کرے گی اور نئے رنگ میں رنگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا- یہ بات لکھی ہے تو خیال گزر رہا ہے کہ اماں کے اس اطمینان کے پیچھے میری پندرہ سالہ زندگی کا شاندار ریکارڈ تھا' تاکا جھانکی' کن سوئیاں لیتے پھرنا' خواب اور خیالات سے محفوظ کتابوں کی دنیا میں مگن زندگی-

''یہ میری بیٹی تو اللہ لوگ ہے' اسے ایسی باتوں سے کوئی مطلب نہیں-''

وہ اکثر کہا کرتی تھیں- یہاں یہ بتاتی چلوں کہ دیہات کی ناخواندہ زندگی میں اس وقت بھی لڑکیاں اپنی عمر سے پہلے ہی وہ شعور حاصل کر لیتی ہیں جو پڑھنے لکھنے کی زندگی میں مصروف لڑکیوں کو بہت بعد میں آتا ہے- اماں اسی حوالے سے غالباً یہ بات کہا کرتی تھیں-

میں بہرحال اس وقت ان تمام باتوں سے اور ابا' اماں کی نصیحتوں سے بے نیاز تھی اس لیے کہ مجھے اپنی ذات پر ابا اور اماں دونوں سے بڑھ کر اعتماد تھا اور میں اپنے تئیں اس زعم میں مبتلا تھی کہ کوئی نیا رنگ' کوئی نیا جھونکا میرا بال بھی بیکا اس لیے نہیں کر سکتا کہ میرا اصل وجود میرے چلتے پھرتے جسم کے بہت اندر کہیں مقفل اور محفوظ تھا- میں نے بتایا نا کہ میں آخری درجے تک ntrovert (دروں بین) شخصیت رکھتی تھی اور کچھ گھریلو پوزیشن' خاندانی پس منظر اور ذاتی حیثیت میں ایک قطعی منفرد شخصیت نے مجھے بہت حد تک ''ایگوسینٹرک'' قسم کی شخصیت عطا کر رکھی تھی- جو میں تھی اس کو بیان کرنے کے لیے بددماغ اور خود پسند جیسے الفاظ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں- جتنے اونچے اور بڑے آپ اس شہر کے اسکائی سکریپرز دیکھتے ہیں' اتنا بڑا میرا ایگو تھا اور اس کم عمری میں بھی مجھے یہ معلوم تھا کہ ایسی شخصیتوں پر نقب مشکل ہی سے لگا کرتی ہے- سو میں مطمئن و مسرور اپنی نئی دنیا کی طرف روانہ ہوئی-

اب جو میں نے ملتان سے لاہور کا سفر پہلی بار بذریعہ ٹرین کیا تو پہلے پہل تو میری آنکھیں وہیں پر کھلی کی کھلی رہ گئیں- ''ہیں یوں بھی اور ایسے بھی'' میں دل ہی دل میں بلیوں اچھلتے دل کے ساتھ سوال کرتی رہی- مگر میرے ساتھ سفر کرتے ابا اور شاہ صاحب کو میرے اندر کے حالات کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا ہو گا کیونکہ بظاہر میں یوں لاپروا تھی جیسے یہ سفر میرا معمول ہو اور کوئی نئی اور انہونی میں نے نہ دیکھی ہو- ابا اور شاہ صاحب البتہ خود مجھے نئے نئے مناظر اور نت نئی چیزوں سے بہلاتے رہے-

لاہور کا ریلوے اسٹیشن اتنا بڑا اور جدید لگا کہ میری سوچ اور آنکھیں...... پھٹی کی پھٹی رہ گئیں- وہاں پر چلتی پھرتی ٹریفک' اگرچہ اس دور میں گاڑی جیسی سہولت کم لوگوں کو میسر تھی' مگر لاہور کی آبادی کے تناسب سے سڑکوں پر چلتی پھرتی گاڑیوں کی تعداد مجھ جیسی دیہاتن کو بہت زیادہ معلوم

ہوتی- پھر مجھے شاہ صاحب نے ٹیکسی میں سوار کرایا- یہ میری پہلی کار رائیڈ تھی اور مجھے یہ جھولا جھولنے میں بڑا مزا آ رہا تھا- مختلف سڑکوں سے گزرتے ہم جیل روڈ پر پہنچے-

''یہ لاہور کالج ہے-'' شاہ صاحب نے ایک شاندار عمارت کی طرف اشارا کرتے ہوئے بتایا اور میری ایک نظر دیکھتے دیکھتے ٹیکسی آگے بڑھ گئی- پھر ایک ایسی ہی عمارت کے سامنے ٹیکسی جا رکی-

یہ عمارت میرا ''ڈریم لینڈ'' کینیئرڈ کالج جس کے تصوراتی ہیولے میں میں نے پچھلے کئی دن چلتے پھرتے گزار دیے تھے- شاہ صاحب سامان اتروانے اور کرایہ دینے میں مصروف ہوئے اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میری نظر لمحہ بھر کو ابا پر پڑی- لاہور اسٹیشن سے یہاں تک کے سفر میں وہ مسلسل تسبیح پڑھتے رہے تھے اور اب میں نے دیکھا تھا کہ ان کے چہرے پر تفکر اور تذبذب کے آثار نمایاں تھے-

مجھے اس سارے عرصے میں پہلی بار اپنے باپ پر ترس اور پیار آیا وہ اپنے دل کے سارے خدشے اور اس اقدام کے ردعمل میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے امکانات پر تحمل' متانت اور رواداری کی چادر اوڑھے میکانکی انداز میں اس سلسلے کے تمام کام سرانجام دے رہے تھے- نجانے کیوں اس ایک لمحہ میں میرا دل ابا کے گلے لگ کر چیخیں مار مار کر رونے کو چاہنے لگا- مگر اگلے ہی لمحہ میں میرے خوابوں کی سرزمین کا دروازہ میرے آنے والے مستقبل کو اپنے اندر کی دنیا میں سمیٹے ہمیں خوش آمدید کہنے کو وا ہو چکا تھا- اندر اونچے درخت اور گھاس کے قطعات کے چھوٹے چھوٹے باغیچے ہمارے منتظر تھے- میں ان تمام مناظر سے آنکھوں کو سیراب کرتی سامان کے قریب کھڑی ہوئی اور ابا اور شاہ صاحب دفتر میں چلے گئے-

اب ایک جہان نو مجھے اپنا آپ دکھانا شروع ہوا- طالبات' وہ آپ کے شہر لاہور کی ساری کریم ادھر ادھر بکھری پڑی تھی- دیسی شکلیں' ویسے سراپے جیسے میں نے شاہ صاحب کے لائے ہوئے رسالوں میں دیکھے تھے- انگریزی زدہ لہجے اور اونچے قہقہوں کی آوازیں ہر سو آ رہی تھیں- ایسے میں چھوٹے چھوٹے پھولوں کے پرنٹ والی بڑی سی کالی چادر کی بکل لپیٹے اس مضحکہ خیز سامان کے قریب کھڑی میں- کیا نادر روزگار عجوبہ نظر آ رہی ہوں گی' اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں- ایک کلاس سے دوسری کلاس تک فاصلہ طے کرتی ہوئی سنجیدہ چہروں والی ساڑھیوں میں ملبوس ٹیچرز میں سے بھی ایک دو نے رک کر ایک آدھ بار مجھے غور سے دیکھا تھا اور میرا وجود پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا-

کوئی پل جاتا تھا کہ میرا اعتماد' میری آن بان' میرے غرور اور بددماغی کی عمارت دھڑام سے کہیں نیچے جا گرتی-

پھر ''او ہوئے آہا! کیا بات ہے بھئی؟'' قسم کی آوازیں ہلکی ہلکی سیٹیوں کے ساتھ ابھرنے لگیں اور

مجھے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔

''چلو بیٹی!'' ایسے میں شاہ صاحب کی ٹھنڈی چھاؤں جیسی آواز نے مجھے سہارا دیا اور میں ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ہاسٹل کے چپراسی نے میرا سامان اپنی سائیکل پر جمایا اور عازم ہاسٹل ہوا۔ اس سے آگے ابا اور شاہ صاحب جا نہیں سکتے تھے۔

میں نے ابا اور شاہ صاحب کو خدا حافظ کہا اور ' طے بھر کے لیے میری آنکھیں بھیگ گئیں اور پھر میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہاسٹل کے دروازے تک پہنچی۔ مجھے یاد ہے کہ اس سے پہلے کہ میرے اعتماد' آن بان اور انا کی عمارت گر جاتی' اس مختصر سے فاصلے میں میں نے خود کو' اپنے اعتماد اور انا کو چیخ چیخ کر آوازیں دیں اور جگایا اور جب میں ہاسٹل وارڈن کے سامنے کھڑی اپنے ڈیوز کی سلپ اور ہاسٹل فارم پکڑا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں اعتماد اور گردن میں تناؤ آچکا تھا۔

جو کمرہ مجھے ملا' اس میں میرے علاوہ تین لڑکیاں اور تھیں۔ کالج' لاہور اور ماحول ان کے لیے بھی نیا تھا مگر یقیناً وہ اتنی ہراساں نہیں تھیں جتنی میں تھی۔ یوں بھی ان تینوں کو وہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور وہ معمولات سے قدرے مانوس ہو چکی تھیں۔

میرے سامان اور حلیے کو دیکھ کر ان تینوں نے بھی ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ بعد میں آنے والے سالوں میں' میں نے جانا اور خود پر اکثر ہنسی کہ واقعی میرا ارائیول کیا مضحکہ خیز نظر آتا ہو گا جب ہی میں ہفتوں نہیں مہینوں فرسٹ ایئر فولنگ کا نشانہ بنتی رہی تھی۔

شروع کے دن اور پھر آنے والے دنوں ہی میں میں نے رفتہ رفتہ یہ بھی جانا کہ میرا پس منظر' میرا سرائیکی لب ولہجہ اور میرا رہن سہن وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹمنٹ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس سارے عرصے میں میرے دل پر جو گزرتی رہی وہ ایک حقیقت تھی مگر میں نے خود کو کمپوز کر کے رہنا شروع کیا۔ یقین جانیے کہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ مجھے خود پر یا اپنے پس منظر پر کوئی شرمندگی تھی۔ لیکن میں نے شعوری کوشش کر کے خود کو یہ سمجھایا تھا کہ لوگوں کو خود پر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔

چنانچہ میں نے اپنے لحاف پر سفید چادروں کا کور بنا کر چڑھایا۔ یہ میری زندگی کی پہلی سلائی تھی' خالہ رحمت ٹھیک کہتی تھیں لڑکیوں کو ضرورت کے وقت کا کام ضرور سکھانا چاہیے۔'' مجھے یاد ہے کہ میرے ہاتھ کی پوریں سوئی کے چھیدوں سے زخم زخم ہو گئی تھیں مگر میں نے یہ کام بالآخر کر ہی لیا۔ ٹرنک پر کپڑا ڈال کر چارپائی کے نیچے گھسایا اور پنجیری اور دیسی گھی میس کی مائی کو سونپ آئی۔

میں نے یہ سب کام ایک دو دن میں نہیں کیے بلکہ اس میں بہت سارے دن لگے' آخر واقف صورت حالات ہوتے اتنے دن تو لگنے ہی تھے۔ ایک اور بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ سب میں نے دل کی خوشی سے نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس لیے کیا تھا کہ مجھے یہ نئے لوگ اور نیا ماحول اتنے

خوشی آئے تھے کہ مجھے خود پر کوئی شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی۔ بلکہ میرے ذہن میں صرف یہ ایک تصور جاگزیں تھا کہ ان سب کو یہ بتاؤں کہ ان چیزوں سے ہٹ کر میں کیا ہوں۔ اپنی Competency (صلاحیت) ثابت کرنے کا جنون مجھ پر دوسری رات سے ہی سوار ہو چکا تھا اور میرے اس جنون کا ہی نتیجہ تھا کہ دو تین مہینوں کے اندر اندر میرے اردگرد لوگ میری ذات سے منسوب ان تمام بظاہر مضحکہ خیز باتوں کو بھلا کر میری قابلیت' علم اور جنرل نالج کے ذخیرے پر مجھ سے متاثر بلکہ کئی ایک تو مرعوب نظر آنے لگے تھے۔ ان میں بورڈرز' ڈے اسکالرز اور کئی ٹیچرز شامل تھیں۔ میں نے شعوری کوشش کے ذریعے اپنے سرائیکی لب ولہجے پر قابو پا کر رواں اردو میں گفتگو کی کوشش کی۔ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ کو مناسب تبدیلی دی۔ مگر آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ روایات کی پاس داری' بلند اخلاق اور رواداری وہ خصائل جو میری گھٹی میں پڑے تھے انہیں عرصہ دراز تک میں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

غالباً ان تمام باتوں نے ہی مجھے اپنے اردگرد کی لڑکیوں میں وہ انفرادیت بخشی جس پر آپ کی نظر پڑی' کالج اور ہاسٹل میں جا کر مجھے محسوس ہوا کہ اگرچہ داخلے کے موضوع پر ابا کی نصیحتیں میں نے غور سے نہیں سنیں مگر وہ اپنے مکمل سیاق وسباق کے ساتھ میرے لاشعور میں جاگزیں تھیں اور اس وقت تک مجھے اپنے عہد کا پاس کرنا آتا تھا' پھر میرے ذہن میں شاہ صاحب کی وہ باتیں بھی تھیں جو انہوں نے گھر سے چلنے سے ایک دن پہلے میرے ساتھ کی تھیں ان کا کہنا تھا کہ میرے کندھوں پر اب ان کی گواہی اور عزت کا بوجھ بھی ہو گا جس کو مجھے نباہنا تھا۔

''مجھے کامل یقین ہے کہ تم جیسی ذمہ دار' بردبار اور علم دوست بچی کو ہر بات کا احساس ہے' مجھے سکندر سے اور سکندر کو اپنے آپ اور اپنے سے منسوب لوگوں سے شرمندہ کبھی نہ ہونے دو گی' اس کا مجھے اپنے زندہ اور موجود ہونے سے بڑھ کر یقین ہے۔''

ابا اور شاہ صاحب میرے ایسے محسن تھے جن کی بات سے بدعہدی کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی سو میں نے اپنے نئے ماحول میں بھی اپنی ایک الگ دنیا بسالی' شروع کے دنوں کے بعد جب میری زبان نے لڑکھڑانے کے بجائے مضبوطی پکڑی اور میرے مرعوب ذہن پر سے اس بات کا ہوا اترا کہ یہاں پر موجود سب لوگ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑھ کر ہیں' تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ انگلش میڈیم اسکولز سے فارغ التحصیل اور مضبوط اکیڈمک بیک گراؤنڈ کی حامل میری ہم عمر طالبات سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ذہنی اور عملی سطح پر مجھ سے پیچھے ہیں میرے اندر چھپے ہوئے جوہر خود بخود باہر نکلنا شروع ہو گئے۔

حیرت انگیز طور پر میں نے کمال تیز رفتاری سے اپنے اوپر گزرنے والی کیفیات پر قابو پا کر نئے ماحول کو قبول کر لیا۔ اس پر اردو میں مجھے میڈم علوی اور انگلش لٹریچر میں میڈم ستارہ جیسی ٹیچرز کی سر

پرستی حاصل ہوگئی- انگریزی میں شاہ صاحب کی اتنی سالوں کی محنت اور توجہ رنگ دکھانے لگی- میں نے میڈیم ستارہ کو اپنی انگریزی دانی اور زبان کی تاریخ اور ادب سے متعلق معلومات سے ششدر کر دیا-

میڈم علوی کے لیے یہ ایک انتہائی حیرت انگیز بات تھی کہ میں جہاں سے آئی تھی وہاں کی ایک لڑکی تاریخ اردو اور تاریخ ادب اردو سے اس حد تک واقف ہوگی ان دونوں خصوصیات نے مجھے بیک بینچز سے اٹھا کر فرنٹ بینچ پر بیٹھا دیا- فرسٹ ایر کا اکنامکس اور فلاسفی کا کورس میں میٹرک کے بعد کے فارغ وقت میں مکمل کر چکی تھی- یوں میرے اپنے نزدیک یہ ناقابل یقین معجزہ ہوا کہ میں جو یہاں آنے کے بعد مستقل یہاں رہنے کے تصور سے ہی لرزاں تھی اپنی کلاس کی حد تک ایک بڑا نام بن گئی- اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ یہ اس وقت ابا' اماں اور شاہ صاحب کی دعاؤں کی برکت ہی تھی کہ مجھے خدا نے یوں اس قدآور ادارے میں پاؤں جمانے کا موقع دیا اور خود کو ان صلاحیتوں کی اہل ثابت کرنے کے جنون میں میں اسی طرف مصروف ہوگئی- یوں نہ ہوتا تو یوں بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں پاؤں نہ جمنے کے باعث میں سگریٹ کے کش لگاتی' پلے بوائے اور ووگ قسم کے میگزین پڑھتی' نت نئے فیشن اپناتی' سال کے سال مایوس کن رزلٹ لاتی' لڑکیوں کے گروہ میں شامل ہو جاتی- ہم اپنے بارے میں قسم نہیں کھا سکتے کیونکہ کمزور لمحوں کا کیا ہے' وہ تو کسی بھی وقت آ سکتے ہیں-

سو یہ طے تھا کہ یہ سب کرامات' ابا' اماں' شاہ صاحب کی دعاؤں کی وجہ سے تھیں (نجانے بعد میں اماں' ابا کی دعاؤں میں اثر نہ رہا یا میرا ہی وجود حصار سے نکل گیا-)

پھر ایسا بھی تھا کہ وہ تعصبات جو شروع سے میری سائیکی میں موجود تھے' وہ کنڈلی مار کر بہت دیر تک میرے اندر بیٹھے رہے اور پر لڑکیوں کی جس قسم کا میں نے ذکر کیا ہے' ان کو دیکھ کر ایک عرصے تک میری زبان پر لاحول اور استغفار کے کلمے بے اختیار آتے رہے- اب میں سوچتی ہوں کہ تعصبات کا حصار ایک ایسی چیز ہے جس کو ہم کبھی توڑ نہیں پاتے' خواہ ہماری تعلیم کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو ہم روشن خیال دانشور ہی کیوں نہ بن جائیں-

میری جبلت میں شامل نسل در نسل چلے آنے والے تعصبات زندگی کے ہر موڑ پر میرے سامنے آتے رہے' یہ اور بات ہے کہ پہلے پہل کے بعد میں نے دانستہ طور پر ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں- اب یہ بھی خیال آتا ہے کہ ایسا بہت حد تک ممکن ہے کہ وہ لوگ جو صالح ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود گناہ کی دنیا کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اپنی گھٹی میں پڑے لاحول اور استغفار کی آواز کو دانستہ طور پر میری طرح اپنے اندر دبا کر رکھتے ہیں-

سب کا سب بہت اچھا اور مکینیکل اس وقت تک رہا جب تک میں اماں ابا کی دعاؤں کے حصار

میں رہی- پہلے سہ ماہی ٹیسٹ میں' میں نے کلاس میں ٹاپ کیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی- اس ٹیسٹ کے بعد میں تقریباً چار ماہ مسلسل ہاسٹل میں رہنے کے بعد دسمبر کی چھٹیوں میں پہلی بار گھر گئی تھی-

ان چار مہینوں میں ابا کے خط میرے نام اور میرے خط ابا کے نام تواتر سے آتے جاتے رہے- سو میں جس طرح کے دن گزار رہی تھی' ان کا بیان اماں اور ابا کے لیے نیا نہ تھا نہ ہی گھر میں اہم اور غیر اہم رونما ہونے والے واقعات میرے لیے نئے تھے- مگر جب میں ابا کے ساتھ ملتان کینٹ اسٹیشن پر اتری تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے مانوس قبیلے سے بچھڑی کوئی بنجارن واپس اپنے قبیلے تک آ پہنچی ہوں- اس سے قبل کتابوں اور کہانیوں ہی میں' میں نے مانوس فضاؤں کے بارے میں پڑھا تھا اس روز حقیقت میں فضا میں بکھری مانوس خوشبو کو میں نے محسوس کیا تھا- راستے کے سارے منظر میرے جانے پہچانے تھے- چک کی طرف جانے والا کچا راستہ' جانو بابا کا تانگہ' کچے راستے سے اٹھتی دھول- چوہدری فتح محمد کا کنواں سب کچھ مانوس اور جوں کا توں تھا-

گھر کا دروازہ' اماں اور خالہ رحمت کی پرشوق نگاہیں اور محبت بھرے سینے سب کے سب میرے منتظر تھے- میں اتنے دنوں میں یادوں کے قبرستان سے اتنے گڑے مردے اکھاڑ چکی ہوں کہ اب وہ تمام منظر میری نظروں کے سامنے روشن روشن اور صاف نظر آ رہے ہیں- مجھے یاد آ رہا ہے کہ اماں نے مجھ سے ایک بھی سوال نہیں کیا تھا- مگر پہلی نظر میں انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا تھا- وہ ماں کی نظر تھی اور مجھے یقین ہے کہ ایک ہی نظر میں انہیں اس بات کا علم ہو گیا ہوگا کہ مجھ میں کیا تبدیلیاں آئی تھیں-

اس ایک نظر کے بعد وہ مطمئن اور خوش رہیں جتنے دن میں وہاں رہی وہ میری تواضع اور مدارات کرتی رہیں- خالہ رحمت کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے کہیں ایسی جگہ چھپا دیں جہاں سے راستہ تلاش کرنے میں مشکل پیش آنے پر میں واپسی کا ارادہ ترک کر دوں- ہاں! چچا انور اور ان کی فیملی کے رنگ ڈھنگ وہی تھے- ان میں سے کوئی بھی مجھ سے خوش ہو کر نہیں ملا تھا- چچی رشیدہ کی ناقدانہ نظریں مجھ میں وہ تبدیلی تلاش کرتی رہیں جس کو بنیاد بنا کر وہ کوئی اعتراض کھڑا کر سکیں- مگر جیسا میں نے بتایا کہ وہ سب جو میں نے کالج اور ہاسٹل کی چار دیواری کے اندر دیکھا مجھے اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہا تھا-

اس لیے میں اس پہلے وزٹ پر جوں کی توں واپس آ گئی تھی- بلکہ میں نے اس مانوس ماحول میں اس وقت سے زیادہ شوق سے دن گزارے تھے جب میں مستقل وہاں رہتی تھی- میں نے یہاں آ کر محسوس کیا تھا کہ تعلیمی میدان میں معرکے مار لینے کے جنون میں مصروف رہنے کے باوجود ہاسٹل میں جو چیز اکثر مجھے اپنے اندر چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی' وہ اس ماحول' زبان' ثقافت اور ماں

باپ سے دوری ہی تو تھی۔
آپ کو اس داستان کے یہ صفحے اور لفظ قدرے بگڑے ہوئے اور بکھرے ہوئے معلوم ہوں گے' یہ الفاظ میرے ان آنسوؤں میں بھیگ کر بگڑے ہیں جو ان کو تحریر کرتے ہوئے میری آنکھوں سے بے اختیار نکلے اور ٹپکے ہیں۔

اب میں خود پر طاری ہونے والی رقت پر قابو پانے کے لیے کچھ دیر توقف کرتی ہوں۔
ہاں! تو قصہ کوتاہ' میں واپس ہاسٹل پہنچتی ہوں' کالج لائبریری اور پروفیسرز کے ذہن میں پوشیدہ بیش بہا خزانوں سے استفادہ حاصل کرتے کرتے ایف اے کا پہلا سال مکمل کرتی ہوں' کلاس میں میری پوزیشن حسب سابق فرسٹ آئی۔ اب سیکنڈ ایر کا سال شروع ہوا۔ اس سال میں ہمیں ڈارمیٹریز سے نکال کر کیوبکلز میں بھجوا دیا گیا اور یہ تبدیلی آگے جا کر میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی۔ اس چھوٹے کمرے میں جو ایک لڑکی کے لیے بنایا گیا تھا تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے دو' دو لڑکیوں کو رکھا گیا۔ یہاں میری پچھلے کمرے کی روم میٹس کے بجائے ایک نیا چہرہ میرا منتظر تھا۔ یہ چہرہ تانیہ قدوائی کا تھا اور یہ وہ چہرہ تھا جس کا آپ نے بھی اپنی کہانی کے دوران ایک دو بار ذکر کیا ہے۔

میری پچھلی روم میٹس اتفاق سے میرے ہی طبقے اور کم و بیش میرے جیسے حالات سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے مجھے کمرے میں ایڈجسٹ کرنے میں وقت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر اب کے صورت حال مختلف تھی۔ تانیہ قدوائی اس وقت پاکستان کی ایک بہت بڑی انڈسٹریلسٹ فیملی سے تعلق رکھتی تھی اور تفریحاً محض تجربے کی غرض سے ہاسٹل رہنے کے لیے آئی تھی۔

اس شام جب ہم نے کمرے میں اپنا اپنا سامان سیٹ کیا تو مجھے یاد ہے کہ وہ چھوٹا سا کمرہ دو مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا مرقع نظر آ رہا تھا اور میں جو کالج اور ہاسٹل میں اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑنے میں مصروف تھی اندر ہی اندر بے چین ہو رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ میں تانیہ قدوائی یا اس جیسی لڑکیوں سے لاشعوری طور پر مرعوب تھی۔ بلکہ یہ ایک ایماندارانہ سچ ہے کہ باوجود بہت زیادہ کشش ساز و سامان سے مرصع ہونے کے تانیہ کے طبقے کی لڑکیاں مجھے اپنی جانب متوجہ نہیں کر پائی تھیں۔

میں نے کالج میں بہت سی ایسی لڑکیاں دیکھی تھیں جو تانیہ قدوائی قسم کی لڑکیوں کے سامنے جھینپی ہوئی اور دبی دبی سی لگتی تھیں۔ مگر جیسا میں نے پہلے ذکر کیا کہ میری انا اتنا ڈیویلپڈ تھا کہ مجھے ان سب میں کوئی خاص بات کوئی قابل ذکر اور قابل رشک خصوصیت نظر نہیں آتی تھی۔ میرا ان سے میل جول لیے دیے رہنے کا سا تھا ضرورت کے وقت بات کر لی ضرورت ہوئی تو لاتعلق رہے۔ مگر اب معاملہ دوسرا تھا وہ میرا کمرہ میرے ساتھ شیئر کرنے جا رہی تھی اب لاتعلق ہو کر رہنے کا کیا

سوال تھا۔
"میں نے دانستہ طور پر تمہارے ساتھ رہنے کا انتخاب کیا ہے۔" اس شام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ڈھنگ سے پہلی بار مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے بھی اس بات کے جواب میں پہلی بار اسے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں کوئی خاص نسوانی کشش نہ ہونے کے باوجود اعتماد اور دبدبے کا رنگ تھا۔ وہ جس ماحول کی پیداوار تھی وہاں ایسا ہونا ایک فطری سی بات تھی۔

"مجھے تمہارا اعتماد' علم اور ذہانت متاثر کرتی ہے' میں فرسٹ ایر سے تمہیں آبزرو کر رہی ہوں اور تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں تم سے دوستی کرنا چاہتی تھی مگر اس ایک سال میں موقع نہیں ملا' ہاسٹل میں رہنے کا خیال آیا تو سوچا کہ اس سے بہتر موقع کہاں ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ دوستی کرنے کا۔" پھر اس نے میرے چہرے پر آئے سوالیہ رنگ کا جواب دیتے ہوئے بہ زبان انگریزی کہا۔
اس غیر متوقع بات کو میری انٹروورٹ طبیعت نے بخوبی جذب کیا اور میں ویسی ہی بے نیاز نظر آتی رہی جیسی کہ عموماً نظر آتی تھی۔ حالانکہ یہ انجانا میدان میں نے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مارا تھا۔ تانیہ قدوائی کو مجھ سے اور مجھے اس سے دوستی کر   کے لیے مزید کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس ماحول میں آنے کے بعد پہلی بار میری کسی لڑکی سے دوستی ہوئی اس سے پہلے بہت سی لڑکیوں سے میری رسمی گپ شپ تو تھی مگر دوستی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔
تانیہ قدوائی ایک عام سی شکل و صورت کی' اس زمانے کے ٹیڈی فیشن کا منہ بولتا نمونہ قسم کی لڑکی تھی۔ بظاہر اس کی اور میری کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ مگر اس کی چند خوبیوں نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ ایک تو وہ اپنی طرح کی دوسری لڑکیوں کی طرح Snob (گھمنڈی) نہیں تھی بلکہ خاصا بے تکلف اور دوستانہ مزاج رکھتی تھی۔ اس کو کسی دوسرے کی خوبیوں' صلاحیتوں اور کامیابیوں کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا اور اگر کبھی وہ کسی میں کوئی ایسی صلاحیت دیکھتی جس کو نکھار دینے میں وہ اس کی مدد کر سکتی تو وہ اس کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار رہتی تھی۔
اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے تانیہ قدوائی سے بالواسطہ اور بلاواسطہ بہت کچھ سیکھا۔ ایسی ہی بات وہ میرے بارے میں کہتی تھی۔ وہ آرٹ اور ادب کی مدح تھی مگر اس کا علم صرف مغربی آرٹ اور ادب تک محدود تھا۔ اس کو مقامی فنون لطیفہ سے متعارف میں نے کروایا تھا۔ وہ تخلیقی اپروچ رکھتی تھی ہر دم متحرک اور متجسس اور اس کی ان عادتوں نے ہی مجھے متاثر کیا تھا۔ مگر میں نے اس کے ساتھ دوستی کا ہاتھ ملانے سے پہلے اپنے محسن و مربی شاہ صاحب سے ایک دفعہ کنسلٹ کرنا ضروری سمجھا وہ کسی کام کے سلسلے میں لاہور آئے تھے اور میرے وزیٹرز کی فہرست میں واحد نام ان کا تھا۔

''یہ بہت اچھا ہے کہ تمہیں ایسی کمپنی میسر آ گئی' میرا خیال ہے کہ اس موقع سے تم بہت کچھ سیکھو اور سکھاؤ گی' سکندر نے تمہیں جو باتیں یہاں آنے سے قبل سمجھائی تھیں وہ اپنی لاجک کے لحاظ سے مناسب اور درست تھیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر گریز اور یوں محدود ہو کر رہنا بھی درست نہیں اپنے اردگرد سے اچھی باتیں سیکھو' مشاہدہ کرو اور جو بہتر سمجھتی ہو اس کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔''

انہوں نے کہا تھا اور یہ میری دل و دماغ پر چھائی عہد کی پاس داری کے سلسلے میں پہلی ڈھیل تھی اس کا ایک فوری نتیجہ تو یہ ہوا کہ میں نے جب سے میں لاہور آئی تھی۔ پہلی بار تانیہ کے ساتھ کالج کی چاردیواری سے باہر قدم رکھا۔

میں پہلی بار باغ جناح میں ہونے والا اس سال کا مشہور و معروف کل پاکستان مشاعرہ سننے گئی تھی اور وہاں کل تک کے ہیولوں اور تخیلاتی پیکروں کو اپنی سماعت اور بصارت کے روبرو پانے پر خدائے بزرگ و برتر کے حضور شکر گزار ہوئی۔ وہ چہرے اور وہ نام جو اس وقت تک صرف اخباروں اور رسالوں میں دیکھے اور پڑھے تھے جب اپنا اپنا کلام ایک ایک کر کے سنا رہے تھے۔ میرے دل سے ایک ہی سوال اٹھ رہا تھا ''میں اب تک کہاں رہتی رہی تھی۔''

اس زمانے تک مشاعرے کا ماحول خالص ادبی روح و روایت کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ پھولوں کے ہار شمع دان' روایتی خوشبوئیں اور جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو وہ ایسا دور تھا جب اردو کے تمام مشہور نام اعلیٰ پائے کے فن پارے تخلیق کر رہے تھے۔ اب آج کل یہاں لندن میں ایشین لابی کا ہائی فائی نینس HighFinance جو کمرشل قسم کے مشاعرے اور ادبی محفلیں اسٹیج کر رہا ہے' اسے سن اور دیکھ کر میں اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ ایک دو بار کے بعد میں نے ایسے مسالہ پروگراموں میں جانا ہی چھوڑ دیا ہے اب تو لوگ واہ واہ کے بجائے تالیاں پیٹتے نظر آتے ہیں۔ ہاں! تو بات اس پہلے قدم کی ہو رہی تھی جس کے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ یہ چوری نہیں بلکہ ایک بالواسطہ اجازت کے بعد اٹھانے جا رہی ہوں۔

اس مشاعرے کا فسوں بہت دنوں تک میرے ذہن و روح پر چھایا رہا۔ پھر تانیہ نے مجھے لاہور کی لائبریریاں دکھانا شروع کیں اس کے توسط سے میں نے چند ان لوگوں سے بھی ملاقات کی جن کے ذاتی کتب خانوں میں بیش بہا نادر قسم کی کتابیں موجود تھیں۔ برٹش کونسل کا کارڈ اس نے اپنے نام پر بنوا رکھا تھا۔ ہم پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کی لائبریری جانا شروع ہوئے ان تمام ایکٹیوٹیز نے مزید میرے ذہن کو جلا بخشی اور چھ سات بار کے وزٹس کے بعد میری جھجک دور ہو گئی مجھے کتابوں کی ان دنیاؤں میں مزا آنے لگا۔

اور یہ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے جب آپ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ بھی عجیب اور منفرد واقعہ ہے کہ آپ کے متعلق کوئی بھی بات میرے حافظے میں محفوظ نہیں۔ آپ کی اس روز کی گفتگو کے بعد ذہن پر زور دینا شروع کیا ہے تو یاد آیا ہے کہ ہاں! آپ وہ صاحب ہوں گے جن سے کچھ کتابیں ملیں۔ ذہن پر مزید زور دیا ہے تو برستی بارش میں پکچر دیکھنے کے بعد کا منظر بھی دھندلا دھندلا سا نظر آیا ہے اور دل میں عجیب ہلچل سی مچی ہے کیا میرے آتھکس کسی دور میں اتنے بلند بھی رہے ہیں کہ میں فلم دیکھنے کے بعد یوں پیدل مارچ کو معیوب سمجھتی تھی۔

آہ! میری حیات کے یہ چند قابل فخر واقعات میری سیاہ کاریوں کے ڈھیر میں یوں چھپے پڑے ہیں کہ گہری نظر ڈالنے پر بھی نظر نہیں آتے۔

ہاں! وہ کتاب ''ظالم محبت'' بھی یاد آتی ہے۔ ٹین ایج کی یادیں' اس دور میں ''ظالم محبت'' کیسی پرفسوں کتاب لگا کرتی تھی۔ آج کے دور کے بچے پڑھیں تو اکتا کر ایک طرف ڈال دیں محض مفروضوں اور تصوراتی خاکوں پر گھڑی کتابیں۔

مجھے یاد آیا ہے کہ وہ کتاب بہت عرصے تک میرے پاس پڑی رہی تھی۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہ آپ نے مجھے دی تھی بلکہ اس لیے کہ مجھے اس کتاب سے عشق تھا' یہ بات لکھی ہے تو حلق سے چیخیں سی ابھرنے لگی ہیں۔ کاش مجھے اس وقت علم ہوتا کہ وہ کتاب آپ نے یوں میرے لیے دوست سے مانگ کر رکھی تھی' کاش اس وقت مجھے علم ہو جاتا کہ ایک شخص میری ذات کی خاطر یوں پوری دنیا میں سرگرداں ہے۔ اب ہاتھ میں لکھنے کی سکت نہیں رہی' لہٰذا توقف کرتی ہوں۔

☆☆

بہت دیر اس بات کو روئی ہوں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ اگر اس وقت مجھے پتا چل بھی جاتا تو کیا فائدہ ہوتا۔ میرا اس زمانے میں جو مزاج تھا' وہ اس بات پر کیا ری ایکٹ کرتا۔

اب یاد آتا ہے کہ ایک بار تانیہ نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ ''یہ اتفاق کی بات نہیں ہے'' یہ بک سیلر صاحب ہر جگہ موجود ہوتے ہیں' کہیں فری ہونے کی کوشش نہ کرنے لگیں۔''

''اونہہ' بک سیلر اور ہم'' مجھے اپنا احمقانہ جواب اچھی طرح یاد آ گیا ہے اور میرا دل ایک بار پھر ڈوب سا گیا ہے۔

ہاں! تو بات آؤٹ ڈور ایڈونچرز کی ہو رہی تھی تانیہ قدوائی نے مجھے لاہور کی اس دور کی ہر قابل ذکر عمارت دکھائی۔ وہ میری ادب پرستی سے بخوبی واقف تھی اس نے اپنے تعلق داروں کی وساطت سے کئی ایک نابغہ روزگار ہستیوں سے مجھے ملوایا اور مجھے اس سارے میں ایسا ذہنی سکون میسر آنے لگا جس کو میں بیان نہیں کر سکتی اب اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ۔

میں ایک بار بھی تانیہ کے رہن سہن' لباس اور فیشنز' اس کے لب و لہجہ کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ غالباً اس لیے کہ مجھے اپنے رہن' سہن حلیے اور زبان و بیان میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ واقعہ بھی تھا کہ تانیہ نے بھی کبھی مجھ سے اس حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ جبکہ اس کے برعکس

تانیہ کی لڑکیوں سے جب جان پہچان بڑھی تو ان میں سے کئی ایک نے مجھ سے کہا۔

"عائشہ! تم کبھی ڈوپٹہ سر پر سے اتار بھی لیا کرو۔"

"تمہارے لباس کی کلر اسکیم کچھ اتنی اچھی نہیں ہوتی۔"

"کبھی لپ اسٹک ہی لگا لیا کرو باہر جانے سے پہلے۔"

مگر میں نے کبھی ان باتوں پر کان نہیں دھرا تھا۔ میرے نزدیک میرا چادر اتارنے کا اقدام بھی غلط تھا مگر ایسا میں نے اس لیے کیا کہ ان جدید لڑکیوں کے غول میں میں یوں چادر اوڑھنے سے عجوبہ نظر نہ آؤں۔ سن رکھا تھا کہ ایک جیسی چیزوں کے درمیان مختلف چیز پر نظر زیادہ پڑتی ہے، سو میں نے چادر چھوڑ کر ڈوپٹے کی بکل مارنا شروع کر دی تھی۔ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی میری اس انفرادیت پر بھی میری طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔

تانیہ البتہ میرے ہاں اور نہیں پر کبھی کبھی جھنجلا جاتی تھی۔ میرے مختلف چیزوں کے بارے میں نظریات اور ویلیوز کے پیچھے سولہ سترہ سال تک اماں اور ابا کی مسلسل تربیت چھپی ہوئی تھی۔ اس کے اماں اور ابا نے بھی یقیناً اس کو بہت کچھ سکھایا ہوگا مگر وہ مجھ سے بہت حد تک مختلف تھا۔

ایسا ہی پکچر کا لیٹ نائٹ شو اور بارش میں واپسی کے مسئلے پر ہوا ہوگا۔ اب اس سے مجھے یہ بھی یاد آیا کہ پاکستان کے کلچرل سین سے بھی تانیہ ہی نے مجھے متعارف کروایا تھا۔ میں نے پہلی بار پکچر ہاؤس میں جا کر فلم بھی تانیہ کے ساتھ دیکھی تھی اور مجھے فلم کا نام تو یاد نہیں مگر بچپن میں جن زیبا اور وحید مراد کو میں نے ڈبے والے کے پردہ پر چھوٹے شیشے سے آنکھ چپکا کر دیکھا تھا بڑے پردے پر یہ پہلی فلم جو میں نے دیکھی ان ہی دونوں کی تھی۔ ہالی ووڈ کی تاریخی اور کلاسیک فلموں کا علم بھی میرے دماغ میں تانیہ کے توسط سے ہی اترا تھا۔ گو مجھے علم تھا کہ میرے ماں باپ کبھی بھی ان باتوں کو پسند نہ کرتے، مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس قسم کی ایکٹیوٹیز میرے اخلاق پر کوئی اثر نہیں چھوڑ سکتیں میں ان میں مصروف رہی۔ ریڈیو کے وہ ڈرامے، مشاعرے اور گانے جو پہلے میں اپنے کے لیے شجر ممنوعہ سمجھتی تھی وہ بھی ان ہی دنوں میں سننے لگی۔

غرض تانیہ کی ہمراہی میری سپاٹ زندگی میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں لے کر آئی اور ان تبدیلیوں کو جب میں سیکنڈ ایئر کے پرچے دینے کے بعد گھر گئی تو اماں کی نظروں نے بخوبی بھانپ لیا۔ گو انہوں نے مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کی مگر ان کی نظریں مشکوک سی تھیں۔

"چلو اچھا ہوا۔ پرچے ہو گئے، اب آرام سے گھر بیٹھنا تو ملے گا۔ ایسا بھی کیا پڑھنا کہ دوری کی وجہ سے انسان سال میں صرف دو مرتبہ گھر آئے۔" انہوں نے ایک روز ٹھنڈے لہجے میں کہا اور کپاس کاتنے میں مصروف ہو گئیں۔

"اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ علم حاصل کرو، خواہ چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔" میں نے

نجانے کیوں جل بھن کر تلملاتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں ایک جامد خاموشی ملی۔

اس بار یہ واقعہ بھی ہوا کہ لاہور جانے کے بعد پہلی دفعہ گھر آمد پر جو مانوسیت اور اپنائیت مجھے محسوس ہوئی تھی، وہ اس بار محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ "کتنی ایک سی زندگی ہے نہ کوئی ہلچل نہ کوئی مصروفیت۔" میں اپنے ساتھ لائی کتابیں کھنگالتے ہوئے اکتا کر سوچتی مجھے علاقے کی روٹین سے چڑ سی ہونے لگی۔ خالہ رحمت پانی پلا رہی ہیں، اماں دودھ بلو رہی ہیں، ابا زیادہ وقت مسجد اور زمین پر گزار رہے ہیں۔ اماں سوت کات رہی ہیں، چچی رشیدہ اور ان کی بہو ہر بار آمد پر مجھ میں تبدیلی تلاش کر رہی ہیں۔

"بھنویں بنانے لگی ہو، ناخن بڑھے ہوئے لگ رہے ہیں سارے شہر کے فیشن۔"

وہ کہتیں اور میرا دل سلگ اٹھتا، وہ کون ہوتی تھیں اس طرح کی تنقید کرنے والی۔

"اچھا۔ تو اب گانے بھی سنے جانے لگے۔" ایک بار مجھے ریڈیو کے کان مروڑ کر رونا لیلیٰ کا گانا سنتے ہوئے دیکھ کر وہ یوں خوشی سے بولیں گویا کوئی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔

"شہر جا کر پڑھیں گی تو یہ نتیجہ نکلے گا ہی۔"

مجھے یاد ہے کہ میں نے کوئی جواب بھی کبھی کسی کو نہیں دیا تھا۔ بلکہ اپنے اکتاہٹ بھرے دل کے ساتھ اس مخصوص روٹین سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ میرے بچپن کی دوست ہاجرہ کا بیاہ ہونے والا تھا اور میں محض اپنا دھیان بٹانے کے لیے اپنی روٹین سے ہٹ کر اس کے بیاہ میں حصہ لیتی رہی تھی۔

آخر خدا خدا کر کے ایف اے کا رزلٹ آیا۔ میری آرٹس گروپ میں کالج میں دوسری اور بورڈ میں چھٹی پوزیشن آئی۔ چک میں موجود سب لوگوں کو اپنے سوالات اور تجسس کا جواب مل گیا تھا۔ میں وہاں جو کرنے گئی تھی اسی میں مصروف رہی تھی۔ اماں جو اب تک فکر مند اور وسوسوں کا شکار تھیں ان کے چہرے پر مسرت رقصاں ہونے لگی۔

"شکر ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔"

ابا مطمئن اور خوش تھے۔ میں نے ان کے چہرے پر سکون اور تشکر کے آثار دیکھے اور دل ہی دل میں خدائے برتر کے حضور شکر گزار ہوئی، میں نے اپنے آپ کو سرخرو کر دیا تھا شاہ صاحب رزلٹ کے وقت لاہور میں موجود تھے، رزلٹ لیتے ہی گاڑی میں بیٹھ ادھر آ گئے۔ وہ بے حد خوش تھے۔

"مجھے یقین تھا کہ تم کوئی کارنامہ سرانجام دو گی، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ اتنے بڑے کالج اور اتنے بڑے بورڈ میں اس نے پوزیشن لے لی سکندر!" وہ کہتے رہے اور ابا سر جھکائے زیر لب ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہتے مسکراتے رہے۔

میں نے ابھی یہ واقعہ لکھا ہے تو خیال آیا ہے کہ آپ کو بقول آپ میری تلاش میں اتنا عرصہ سرگرداں رہے تو کیا آپ نے ان دنوں اخبار میں ایف اے کی رزلٹ کے بارے میں نہ پڑھا ہو

گا- اب تو خیر یہ بھی یاد نہیں کہ خبر کس ڈھنگ سے لگی تھی-

خیر! شاہ صاحب نے بی اے کے لیے مضامین کا کمبی نیشن جوڑنا شروع کیا- جس کو اماں کے ہنگامے نے التوا میں ڈال دیا- ''دسویں سے آگے پڑھنا تھا- پڑھ لیا' لاہور دیکھنا تھا- دیکھ لیا' ہوٹلس (ہوسٹل) رہنا تھا رہ لیا- اب بہت ہو چکی' سارے شوق پورے ہو گئے- اب یہ گھر ہی رہے گی' کوئی ضرورت نہیں آگے پڑھنے کا سوچنے کی-'' انہوں نے کہا تھا-

''ہاں حمید شاہ صاحب' بہت ہو چکی-'' ابا نے نیچی نظروں اور آواز کے ساتھ کہا-

شاہ صاحب کا جواب آں لیکچر شروع ہو گیا- مگر اب کے ابا پکڑے جاتے دکھائی نہیں دیتے تھے- میں نہیں جانتی تھی کہ وہ بار بار میری مجبوری' میری مجبوری کی جو تکرار کرتے تھے وہ کون سی مجبوری تھی (کاش میں کوتاہ بین جانتی ہوتی)

میں نے اس تین دن کی بحث و تمحیص سے تنگ آ کر ابا سے خود بات کرنے کی ٹھانی- میری گفتگو میرے اصول' وضع داری کی پاس داری' روایات کے احترام' بہترین محنت اور رزلٹ پر مشتمل تھی میرا موقف یہ تھا کہ اگر مجھ میں کسی میدان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود تھی تو پھر مجھ سے مواقع چھیننے کی کوشش کیوں ہو رہی تھی-

میں نے کالج چٹھی لکھ کر فلاسفی کی مس فخر سے ابا کے نام ایک خط بھی منگوا رکھا تھا' جس میں انہوں نے مجھ جیسی ٹیلنٹڈ اور ذہین لڑکی کا مستقبل تعلیم کے دروازے بند کر دینے پر تباہ نہ کرنے کی اپیل کی تھی ان کی رائے تھی کہ پاکستان کو مجھ ایسی پر شوق اور علم سے محبت کرنے والی لڑکیوں کی اشد ضرورت ہے- ساتھ ہی ساتھ میرے بلند اخلاق و کردار کا ذکر بھی تھا اور اس ضمن میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اس دور کی فیشن کی دلدادہ اور پڑھائی سے دور بھاگنے والی لڑکیوں میں میری جیسی سادگی پسند' معصوم لڑکی کی موجودگی ایک نعمت تھی-

وہ خط قائداعظم اور علامہ اقبال کے فرمودات کے افکار سے بھرپور تھا اور آخر میں انہوں نے ابا کو مخاطب کر کے یہ بھی لکھا تھا کہ انہیں یقین ہے کہ وہ اس تاریخ ساز ادارے کو ایک قابل فخر طالبہ سے محروم نہیں کریں گے وغیرہ وغیرہ-''

یہاں یہ بتاتی چلوں کہ امتحان کے بعد گھر آنے سے قبل آنے والے ممکنہ حالات کے خدشات کا ذکر کرنے پر مس فخر کو خط لکھنے کا مشورہ مجھے تانیہ قدوائی نے ہی دیا تھا-

میرے وہ خط دکھانے پر ابا مخمصے میں پھنس گئے- پھر میں نے ابا کو اموشنلی بلیک میل کرنا شروع کیا انہیں اپنی ذات کے بارے میں خدا کے حضور کیے گئے وعدے کی یاد دلائی-

''ہاں! مجھے وہ وعدہ بالکل یاد ہے-'' اس سب کے جواب میں ابا نے حسب عادت سر جھکا کر کہا- ''مگر مجھے اور بھی بہت سے وعدوں کا پاس ہے- ان کے لیے بھی میں اس کے حضور جواب دہ

ہوں-'' میں خاموشی بیٹھی انہیں دیکھتی رہی-

''تمہارے قابل فخر کارناموں کو دیکھ کر جی تو میرا یہ چاہتا ہے کہ تم کو ایم اے اور پی ایچ ڈی بھی کراؤں- مگر لوگ جینے نہیں دیں گے' میں پہلے ہی بہت کچھ سن چکا ہوں-''

''لوگ!'' میں نے تصورات میں دانت پیستے ہوئے تقریر کرنا شروع کی جو لوگوں کے جلاپے' رشک اور حسد پر مشتمل تھی اور آخر میں ابا کے آگے گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑ دیے-'' صرف بی اے کر لینے دیں ابا' پھر آپ سے کچھ نہ کہوں گی-'' میں نے روتے ہوئے کہا تھا-

ابا نے تڑپ کر میرے ہاتھ پکڑ لیے'' بیٹیاں ہاتھ جوڑ کر بات کرنے کے لیے نہیں ہوتیں' بیٹیاں تو مطالبہ کرنے کے لیے ہوتی ہیں' فرمائش کرنے کے لیے ہوتی ہیں-''

میرا سادہ لوح' نیک فطرت' شفیق باپ میری اموشنل بلیک میلنگ کے آگے ہتھیار ڈال گیا-

''اور پڑھاؤ گے تو بیاہ کا کیا بنے گا؟'' اماں نے مجھے سامان باندھتے دیکھ کر تلملا کر کہا-

''مجھے بیاہ کرنا ہی نہیں-'' میں نے رکھائی سے جواب دیا-

اور یہ حقیقت بھی تھی' مجھے انسانی زندگی کے اس پہلو سے نجانے کب سے سخت چڑ تھی' مرد' عورت کا تعلق کسی بھی صنف میں مجھے متاثر نہیں کر سکا تھا- میں نے کالج میں لڑکیوں کو لو' لورز' اور ڈیٹس کا ذکر کرتے دیکھا تھا- بوائے فرینڈز کے دیے تحائف کزنز کی تصویریں' لو لیٹرز ہاسٹل میں لڑکیوں کا ہاٹ ٹاپک ہوا کرتا تھا مگر مجھے اس موضوع میں کبھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی-

''وہ لڑکا دیکھو' تمہیں دیکھ رہا ہے- مسلسل' کبھی کبھی ویگن یا بس میں سفر کرتے ہوئے تانیہ مجھے ٹہوکا مار کر کہتی تو اول تو مجھے کوئی لڑکا کبھی نظر نہیں آتا- یا پھر تانیہ کے ٹہوکے مجھے بہت برے لگتے اور اس بات پر میری اس سے جھڑپ بھی ہو جایا کرتی تھی-

میرے اندر کی پیاسی زمین جن چیزوں سے سیراب ہوتی تھی' ان کے علاوہ مجھے کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی- مجھے یقین سا ہو رہا ہے کہ اگر مجھے اس وقت آپ کے اپنا پیچھا لینے اور گاہے گاہے مدد کرنے کا راز معلوم ہو جاتا تو آپ کی شخصیت کا اگر کوئی احترام میرے دل میں موجود تھا بھی تو چاروں شانے چت کر جاتا-

یہی وجہ تھی کہ میں اماں کی اس قسم کی باتوں اور اپنے لیے مختص پیٹیوں کو دھڑا دھڑ بھرتے دیکھ کر ہمیشہ برافروختہ ہو جایا کرتی تھی- یقیناً جب میں ایسا کرتی ہوں گی میری تقدید ہلکا سا تبسم ضرور کرتی ہو گی-

☆☆

مزید دو دن گزر گئے' اپنی داستان نہیں لکھ سکی اس دوران دو مرتبہ آپ کی جانب سے آنے والی کالز کے جواب میں فون پر آنسر نگ مشین لگا رکھی ہے- ایک ہفتہ سے گھر میں بند ہوں نہ کوئی ملنے

آیا ہے سوائے دودھ کی بوتلیں اور ڈبل روٹی تقسیم کرنے والے کے' مجھے کچھ اور دن دنیا کی دلفریبیوں اور رنگینیوں سے دور رہ کر اپنی ذات کا تجزیہ کرنا اور اپنے بارے میں فیصلہ کرنا ہے- سو میں نے بندر ہنے کا فیصلہ کیا ہے- آیئے' آپ کو آگے کی کہانی سناؤں- اس سے قبل کہ پاکستان ہائی کمیشن سے کوئی اور ایلچی آن موجود ہو' میں اختتام پر پہنچنا چاہتی ہوں-

یوں میں تھرڈ ایر میں واپس آئی- میرے آنے سے ایک دن پہلے چچا انور اور چچی رشیدہ خونخوار تیور کے ساتھ گھر آئے- مگر ابا نے ان سے نجانے کیا کہا کہ وہ شام تک ٹھنڈے ہو کر چلے گئے-

اور اسی شام ابا نے مجھ سے کہا کہ وہ میری محبت سے مجبور ہو کر مجھے دوبارہ لاہور بھجوا رہے تھے اور یہ کہ میرا اس سلسلے میں یہ آخری مطالبہ ہوگا- بعد میں وہ اپنی کمٹ منٹس نبھائیں گے-

حسب معمول بے دھیانی میں یہ بات سنتے ہوئے میں نے سوچا کہ ان کی کمٹ منٹس زیادہ سے زیادہ کیا ہوں گی' اماں سے کمٹ منٹ آگے نہیں پڑھانا' ماحول' روایات سے کمٹ منٹ ٹھیک ہے یہ ٹائم تو گزرے لاپروائی سے سوچا اور سامان اٹھا عازم لاہور ہوئی-

اس بار تانیہ کے ساتھ کمرہ میں نے دانستہ طور پر لیا اور ہم نے مل کر اس کمرے کو خوش ذوقی سے سجایا تعلیمی لحاظ سے یہ زیادہ Profilic ٹائم تھا- اس درمیانی وقفے کے قصے میں نے اس کو سنائے اور وہ جی بھر کے ہنسی- اس کا خیال تھا کہ پڑھنا میرا حق تھا اور یہاں واپس پہنچ کر میں نے جو صدیوں سے جمود کے شکار نظام کو کاری ضرب لگائی تھی' اس کا مجھے بہت ثواب ملنا تھا-

یہ ان ہی دنوں کی بات تھی' جب ایک دوپہر کالج سے لوٹنے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں عادتاً کچھ دیر سونے کے لیے لیٹی تھی- میری آنکھیں نیند سے بند ہونے ہی والی تھیں کہ ایک نامانوس آواز نے مجھے چونکا دیا-

یہ آواز نامانوس تھی- میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں کمرے کی نیم تاریکی میں پہلے تو مجھے محض ایک سایہ ہلتا نظر آیا اور جب میری آنکھیں کمرے کی روشنی سے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا' وہ تانیہ تھی جو گھنگھرو پہنے مختلف ردھم کے پوز بنا رہی تھی' وہ نامانوس آواز گھنگھروؤں کی تھی-

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟-'' میں نے کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھتے ہوئے حیرت زدہ آواز میں پوچھا-

''رقص-'' اس نے ایک خاص ادا سے بازو پھیلائے اور پورا گھوم گئی'' چھم چھم چھم'' کمرے کی خاموش فضا ایک بار پھر گھنگھروؤں کی آواز سے گونج گئی-

''مگر یہ......'' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نئی بات کی حیرت مجھے اپنے سامنے کے منظر پر یقین کرنے سے مکمل طور پر روک رہی تھی- اور میری آواز حلق میں ہی دب گئی تھی-

''یہ رقص ہے رقص' عائشہ نیازی-'' اس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا-

''کلاسیکل رقص' کتھک' یہ کوٹھے والیوں کا ڈانس نہیں ہے تم اس قدر حیرت زدہ اور خوفزدہ کیوں ہو رہی ہو-'' وہ میری کیفیت کو بھانپ گئی تھی-

''مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ تم...... میرا مطلب ہے کہ تم-'' میں واقعی اس کی زندگی کے اس نئے رنگ پر حیران تھی-

''میں نے سوچا اور کام تو سب لوگ کرتے پھر رہے ہیں' میں کیوں نہ یہ کام کروں' ہنر' آرٹ' ورزش سب کچھ ہے اس میں' فائدہ ہی فائدہ ہے انسان فٹ بھی رہتا ہے اسی لیے میں نے مہاراج غلام حسین کتھک کی کلاسز جوائن کر لی تھیں-'' تانیہ کے لیے یہ شائد کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی' مگر میرے لیے یہ اتنی انہونی اور غیر معمولی بات تھی کہ میں بہت دن اس کو ہضم نہ کر پائی-

''اگر ابا' اماں یا شاہ صاحب کو علم ہو جائے کہ ہاسٹل میں میری روم میٹ اور لاہور میں میری بیسٹ فرینڈ رقص کرتی ہے تو-''

میں یہاں تک سوچتی تو مجھے جھرجھری آ جاتی ''لاحول وقوۃ-'' پھر میرا دل کہتا ''میں نے تانیہ سے دوستی کرتے وقت یہ کب سوچا تھا کہ وہ اس طرح کا کام بھی کر سکتی ہے وہ لاکھ اس کو فن کا' آرٹ کا نام دیتی تھی مگر میرے دل میں رقص کا امیج وہی تھا جو ہمارے ہاں کے ایوریج ذہنوں میں ہو سکتا ہے' مگر میں نے تانیہ کے سامنے ایک مرتبہ بھی اس کے اس نئے شوق پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا وہ کالج کے بعد مہاراج سے کلاس لینے چلی جاتی- شام پڑے واپس آتی اور پھر کمرے میں پریکٹس کرتی-

ان دنوں میں ہماری وہ مثالی ذہنی ہم آہنگی' دوستی سیر و تفریح سب سرگرمیاں ماند پڑ گئیں- اس کی عدم موجودگی میں میں ہاسٹل میں تنہا بیٹھی کتابوں میں سر دیے رہتی اور وقت کاٹنا مشکل ترین ہو جاتا- انگلش اور اردو کی ٹیچرز سالانہ مباحثہ کے لیے تقریر کی تیاری پر زور دیتی رہیں مگر تانیہ کی عدم موجودگی نے جیسے مجھے معذور کر دیا تھا میں نے انکار کر دیا-

گزشتہ سال کے سالانہ تقریری مقابلوں میں کچھ لڑکیوں نے مجھے چیلنج کیا تھا کیونکہ ان دنوں میں اپنی حیثیت کو منوانے کے مراق میں مبتلا تھی- اب موقع آیا تھا اور تانیہ غائب تھی- پھر ایک روز جب تانیہ کلاس لینے نہیں گئی تو میں نے اس سے ڈیبیٹس کا ذکر کیا- اور اس نے مجھے ڈانٹ کر اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا کہا اس کی دوستی اور خلوص کا ایک بڑا ثبوت یہ تھا کہ اس نے رقص کی کلاسوں میں جانا موقوف کر دیا اور مجھے تقریر کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا-

اسی نے مجھے مجمع میں بولنے کا اعتماد دیا-

اور میں اس سارے میں اس بات پر خوش تھی کہ وہ لوٹ آئی تھی میں غالباً اس کے سہارے اور دلاسے کی عادی ہو چکی تھی میں نے پوری لگن سے اس تقریری مقابلے میں شرکت کی جس کا تذکرہ

آپ نے بھی کیا۔

ہاں! اب مجھے آپ کا کردار اس دور کی کہانی میں یاد آیا۔ آپ گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تھے اور سیلز مینی سے لیکچرر شپ تک کی' ترقی پر ہم نے خاصی حیرت کا اظہار کیا تھا بہر حال ہم دونوں اور میڈم ستارہ کی محنت سے میں نے وہ میدان مار لیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بعد میں بہت دن تک یہ بات سنی تھی کہ عائشہ نیازی فرام کینئرڈ کالج نے میدان مار لیا ہاں اس افواہ نے یا پھر شاید سچی خبر نے میرے دل میں فخر اور غرور کی کیفیت ضرور پیدا کر دی تھی۔ میں کچھ بھی نہیں تھی مگر اتنی کامیابیوں نے میرا دماغ خراب کرنا شروع کر دیا تھا اس پر تانیہ تھی جو ہر دم مجھے یہ یقین دلانے میں مصروف رہتی کہ میں دقیانوسی ماحول کے لیے نہیں بنی تھی۔

میں نے لاشعوری طور پر غیر محسوس طریقے سے خود میں اور اپنی ظاہری شخصیت میں تبدیلیاں لانا شروع کر دیں۔ میں نے لاہور آنے سے لے کر اس وقت تک ڈوپٹہ سر سے نہیں اتارا تھا اب میں نے ڈوپٹہ گلے میں ڈالنا شروع کر دیا اور کچھ نڈر ہو کر ایسی جگہوں پر جانا بھی شروع کر دیا جہاں جانے کا پہلے میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ایسی ہی جگہوں میں ایک جگہ ریڈیو اسٹیشن بھی تھی۔

جب مس فخر احمد نے مجھے کوئز پروگرام ریکارڈ کروانے کے لیے ریڈیو اسٹیشن چلنے کے لیے کہا تو میرے دل و دماغ میں ایک جنگ چھڑ گئی۔ کئی دن میرے ذہن نے اس بات کا اندازہ لگاتے ہوئے گزار دیئے کہ اس طرح کے پروگرام جنوبی پنجاب کے اس پس ماندہ چک میں سنے جانے کا کتنے فیصد چانس ہو سکتا تھا۔ شاید یہ چانس ایک فیصد بھی نہیں تھا' اسی مفروضے کی بنیاد پر میں نے کوئز پروگرام میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہاں! مجھے اپنے ریڈیو اسٹیشن جانے کا وہ منفرد واقعہ اچھی طرح یاد ہے لیکن اس کے ساتھ وہ واقعہ آپ نے خوب یاد دلایا۔ دھوپ اور سایا ان دنوں کالج اور ہاسٹل کی لڑکیوں کا پسندیدہ ترین ڈرامہ تھا اور اس کے مصنف کے بارے میں بڑی افواہیں گرم تھیں۔

عزیز احمد صاحب کی تصویر جو انگلیوں میں سگریٹ دبائے عینک کے پیچھے سوچتی آنکھوں کے ساتھ اخباروں میں شائع ہوا کرتی تھی اسے دیکھ کر بھی ہمارے ذہن میں کبھی اس شخص کا خیال نہیں آیا تھا جو آپ کے ساتھ' ہمیں پکچر ہاؤس سے ہاسٹل تک چھوڑنے آیا تھا اور اونچی آواز میں غالب کی غزلیں گاتا رہا تھا۔

اس روز ریڈیو اسٹیشن پر آپ نے بتایا تھا اور پھر اس کے بعد لندن میں یہاں اسی شخص کا بھوت تھا۔ جس سے میں اتنے سال چھپتی رہی ہوں' نجانے کیوں مجھے اس ڈھٹائی کی زندگی میں صرف اسی شخص سے شرم آتی رہی اور میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ میں اس شخص کی نظروں میں نہ آؤں' اپنے تئیں میں اپنے سیاہ کرتوتوں پر اس شخص کی نظروں کے سامنے پردہ ڈالے بیٹھی تھی۔ آپ کی

اس اطلاع پر کہ آپ ان کے توسط سے مجھ تک پہنچے ہیں' اور یہ کہ انہوں نے آپ سے میرے اس نئے نام کا تعارف کرایا ''آشا چاٹگام والا'' آہ میرے مخاطب! میں آپ سے کیا کہوں کہ زندگی کے لیے جو میری رہی سہی ہمت تھی یہ بات سن کر وہ بھی جواب دے گئی۔

ہاں تو یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں اونچی اڑانیں لگانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اور خود پر خاصی نازاں بھی تھی اور میں خود بھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ جو مختلف چیزوں کے سلسلے میں میرے اندر ایک جھجک تھی' وہ کچھ کچھ کم ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب تانیہ نے مجھ سے کہا کہ وہ اتنے دن تک میری وجہ سے کتھک کی کلاسز سے غائب رہی تھی اور تب چونکہ اسے دوبارہ جوائن کرنا تھا۔ لہٰذا میں کمپنی دینے کے لیے اس کے ساتھ چلوں' اب یہ بھی بات تھی کہ ان کچھ دنوں کی غیر معمولی مصروفیات نے میرے ان چیزوں کے بارے میں تعصبات کی شدت کو کچھ کم کر دیا۔

پھر مجھ پر تانیہ کے کئی احسانات تھے' کم از کم میں ان کو احسان ہی مانتی تھی' سو میں نے اس کے ساتھ چلنے کی ہامی بھر لی۔

وہ فن اور فنکار کی دنیا میرے لیے بالکل نئی تھی' مگر حیرت انگیز طور پر مجھے دلچسپ معلوم ہوئی۔ وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ (جن دنوں کی یہ بات ہے ان دنوں میں میڈیا اتنا پاور فل نہیں تھا جتنا آج ہے) ان دنوں میں بھی اس فن سے محبت کرنے والوں کی تعداد کافی تھی بہت سے شوقین لڑکے اور لڑکیاں وہاں سر اور تال کے ساتھ جسم کا آہنگ مخصوص انداز میں کرنے میں مصروف تھے تانیہ بھی وہاں جا کر اسی عمل میں مصروف ہوئی' اور میں ایک طرف بیٹھ کر یہ منظر دیکھتی رہی۔ دو چار دن میں اسی طرح تانیہ کے ساتھ وہاں جاتی رہی اور اعترافات کی اس کہانی میں یہاں مجھے یہ سب سے بڑا اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں ایک غیر محسوس انداز میں اس دنیا کی طرف متوجہ ہو رہی تھی۔

وہ غالباً پانچواں یا چھٹا دن تھا۔ جب تانیہ اور اس کے ساتھ کی ایک لڑکی مہاراج کے سمجھائے انداز میں آنکھوں اور انگلیوں کی جنبش دینے میں مسلسل ناکام ہو رہی تھی۔ مہاراج ان کو سمجھانے میں ناکام ایک طرف بیٹھے تھے یکا یک میرے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ میں نے اٹھ کر مہاراج کے بتائے ہوئے قدم اٹھائے انگلیوں کو آنکھوں کے قریب لا کر پتلیوں کو جنبش دی اور ہاتھوں کو کنپٹیوں پر رکھ کر بھرپوری ادا کے ساتھ گھوم گئی۔

''یوں نہیں تانیہ یوں۔'' میرے لبوں نے ایک عجیب فقرہ ادا کیا اور پھر میں نے اگلا قدم ادا کیا ''پھر ایسے۔'' میں کہہ رہی تھی اور مجھے' فقط مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میرے حواس میرے ساتھ نہیں تھے میں مکمل طور پر ایک اور دنیا میں موجود تھی جس کے ساتھ اس سے پہلے میرا کوئی...... تعلق نہیں تھا مگر ایک انجانی قوت تھی جو میرے اندر بھر گئی تھی اور میں گھوم رہی تھی میرے ارد گرد موجود

لوگ حیرت سے منہ کھولے میری طرف دیکھ رہے تھے جب مجھے ہوش آیا اور میرے قدم رکے تو میرا ایکدم دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں مجھے ایسا لگا جیسے بھرے مجمع میں میں بے لباس کھڑی تھی میں آنکھیں جھکائے پسینہ پسینہ کھڑی تھی۔ پھر کہیں دور سے جیسے تالی بجنے کی آواز آئی۔

''خوب' بہت خوب لڑکی!'' یہ مہاراج کی آواز تھی۔ ''تم پیدائشی فنکار معلوم ہوتی ہو' تم لوگ۔'' پھر وہ تانیہ کی طرف گھومے۔

''اتنے دن سے جو چیز نہ سمجھ سکی تھیں اس لڑکی نے کیسا سمجھا اور کیسا پایا۔ آؤ لڑکی! تم اس فن میں بہت آگے جانے کے لائق ہو' سیکھو گی۔''

''نہیں۔'' میں نے سر ہلایا اور آنسو روکتی ایک طرف بیٹھ گئی۔ مہاراج نے اس انکار کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ایک طرف بیٹھ کر اپنا معمول کا لیکچر دینا شروع کر دیا۔

''رقاص اپنے سر' اپنی آنکھوں' اپنی بھوؤں' اپنے بازوؤں' اپنے ہاتھوں' انگلیوں' پیروں' اپنے پورے جسم' سارے وجود کے ذریعے کائنات اور زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ آنکھوں' انگلیوں بازوؤں میں آہنگ قائم کرتا ہے مور کی چال' ہاتھی' گھوڑے شیر کی چال قدم رکھنے کے دس' چکر کاٹنے کے آٹھ انداز ہیں۔''

اور میں ایسے جیسے ساری دنیا کی نگاہیں مجھ پر گڑی تھیں۔ خود کو بازوؤں کے گھیرے میں چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔ مگر مہاراج کا لیکچر پھر بھی پوری آواز کے ساتھ میرے کانوں میں اتر رہا تھا اور میرے اندر چھپا وہ نہ جانے کون تھا جو بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ میری دنیا تھی' جیسے میں نے سب کچھ اسی کی تلاش میں کیا تھا جیسے میں کسی صحرا میں جلاوطن کسی مانوس فضا میں پہنچ گئی تھی۔ اور یہ اتنی غیر متوقع اور حیرت انگیز کیفیت تھی کہ مجھے خود بھی اس پر سوچنے اور یقین کرنے میں تامل محسوس ہو رہا تھا۔ مگر میں اپنی کیفیت پر قابو پانے میں ناکام رہی تھی۔

پھر مشق کا دوسرا دور شروع ہوا۔ دو قدم آگے بازو کے گھیرے اس حد تک' اب انگلیوں کی حرکت اس انداز میں' ایک پاؤں زمین پر' دوسرا اوپر اٹھا ہوا' اب دو چکر پورے گھوم کر' تیسرا آدھا گھومو۔

شر شر شر میرے جسم کا سارا خون تیزی سے بھاگ رہا تھا میری شریانوں میں' میرے دماغ میں' دل کے اندر' باہر اور میرا وجود ٹھنڈے پسینے میں بھگو رہا تھا۔

''یہ وہ دنیا ہے جس سے میں متعلق ہوں' مجھے یہاں ہی تو موجود ہونا چاہیے تھا بہت پہلے سے میں یہاں اتنی دیر سے کیوں آئی۔؟'' کوئی میرے اندر پکار پکار کر کہہ رہا تھا، آپ کو یہ صورتحال ڈرامیٹک لگ رہی ہوگی۔ مجتبیٰ حسین صاحب! مگر جب یہ مجھ پر گزری تھی' اس وقت منطق کے سارے سوتے کہیں جا سوئے تھے۔

میں نہیں جانتی کہ کتنی دیر میں وہاں بیٹھی رہی تھی اور کب تانیہ نے مجھے ''اٹھو چلو'' کہا تھا' میں جب اٹھی تو مجھے لگا جیسے میں ٹرانس کی حالت میں تھی تانیہ نے ہاتھ جوڑ کر مہاراج سے اجازت چاہی اور میں نے لحظہ بھر کو نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا وہ مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

''پھر آ رہی ہو نا؟'' انہوں نے کہا۔

''جی ہاں!'' میری آواز کہیں کنوئیں سے نکلی تھی جب ہی تو میرے اپنے کانوں کو نامانوس لگی تھی۔

می رقصم

مجھے اپنے بچپن کا ایک منظر اچھی طرح یاد ہے۔ ایک بار ابا مجھے اپنے ساتھ اپنے مرشد صاحب کے ہاں سالانہ عرس پر ساتھ لے کر گئے تھے' وہاں رات کو محفل سماع کا اہتمام تھا۔ ایک قوال جو بہت مشہور تھے اور جن کی شکل مجھے آج تک یاد ہے ان سے مرشد صاحب نے فرمائش کر کے کہا۔

قوال صاحب نے تان اڑائی۔

''عثمان ہارونی سنایئے۔''

اور پھر جو انہوں نے گایا' مجھے اس کے الفاظ تو عقل میں نہ پڑ رہے تھے مگر محفل میں جیسے کوئی بھی اپنے ہوش میں نہ رہا تھا ایک ہجوم خود مست تھا جسے حال آیا ہوا تھا میں نے وجد کی یہ کیفیت دیکھی اور مجھے یاد ہے کہ میرے اندر میری روح اس حال میں آنے کو پہلی بار پھڑ پھڑائی تھی۔

میں ایک جوش کی کیفیت میں ابا کی گود سے اٹھی اور بازو سر سے اوپر اٹھا کر گول گول گھومنے لگی۔ ابا نے مسکراتے ہوئے مجھے پکڑا اور دوبارہ اپنی گود میں بٹھا لیا۔ وہ یقیناً اسے بچکانہ نقل سمجھے ہوں گے اور میری اندرونی کیفیت سے کبھی بھی واقف نہ ہوئے ہوں گے۔ مگر میں اب تک وہ کیفیت اپنے دل میں محسوس کر سکتی ہوں' میرا وجود ابا کے بازوؤں کے مضبوط گھیرے میں بلبلا اٹھنے کو بے چین تھا مگر میں کیسے اٹھ سکتی تھی۔

کئی برس بعد پھر ہمارے ہاں شاہ صاحب آئے جو صبح صبح ریڈیو سیلون سنا کرتے تھے۔

''اب آپ آغا بشیر قوال کی آواز میں قوالی سنیئے۔''

اناؤنسر جو اردو سروس سے متعلق تھا' ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتا اور فارسی زبان میں وہ یہی الفاظ دہرائے جاتے جن کو سن کر مجھ پر بچپن میں وہ کیفیت طاری ہوئی تھی اور یہ حقیقت تھی کہ جب بھی میں وہ قوالی سنتی' میری روح بے چین ہو کر پھڑ پھڑاتی۔ اب تو اس قوالی کا ایک ایک لفظ یاد ہے جس کا اردو ترجمہ شاہ صاحب نے مجھے سنایا تھا۔

خوشا رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را
زہے تقوی کہ من باجبہ ودستاری رقصم
نمی دانم کہ آخر چوں دم دیداری رقصم
مگر نازم براں ذوقے کہ پیش یاری رقصم

بیاں جاناں تماشا کن کہ درانبوہ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سر بازاری رقصم
خوشا رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را
زہے تقویٰ کہ من باجبہ ودستاری رقصم
شدم بدنام از مشقت بیا اے یار من اکنوں
نمی ترسم از رسوائی بربازاری رقصم
مرا خلقے ہمی گوید چرا چندی وی رقصم
بہ دل دارم اسرارے ازاں اسراری رقصم
اگر چہ قطرہ شبنم نہ پوید بر سر خارے
من آں قطرہ شبنم بہ نوک خاری رقصم
من آں عثمان ہارونی کہ بار شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے ومن برداری رقصم

قوال اپنی دھن میں گائے جاتا اور اس غزل کا ایک ایک لفظ میرے دل پر جا کر لگتا' ایک روز جب شاہ صاحب کنوئیں پر غسل کرنے گئے ہوئے تھے- صبح صبح میں نے جا کر ریڈیو کا کان مروڑا آغا بشیر قوال کی آواز کمرے میں گونج گئی-

''بصد سامان رسوائی سر بازاری رقصم''

میرے بازو ہوا میں بلند ہوئے-

نمی ترسم از رسوائی بر بازاری رقصم

میں نے سر کو عجیب وحشت کے سے انداز میں جھٹکے دیے اور میرے بال بکھر گئے-

من آں قطرہ شبنم بہ نوک خاری رقصم

تک پہنچتے پہنچتے میں اچھا خاصا حال کھیلنے لگی تھی-

؎ ملامت می کند خلقے ومن برادری رقصم میں خود اپنے حوش میں نہ رہی تھی' قوالی ختم ہونے تک میں نے بہ دقت خود کو سنبھال کر رکھا' شکر تھا کہ میں کمرے میں اکیلی تھی' بعد میں اماں نے اتنی اونچی آواز میں ''گیت'' سننے پر خوب ہی جھاڑا تھا-

اپنے بچپن کی یہ بات مجھے ایک بار پھر اس وقت یاد آئی جب مہاراج نے مجھ سے پوچھا-

''پھر آ رہی ہونا؟-''

وہ کون سی غیر مرئی قوت تھی' جس نے مجھ سے اقرار کر لینے کو کہا- وہ میں جس نے اقرار میں سر ہلایا تھا' وہ یقیناً وہ نہیں تھی' جو میں اس سے پہلے تھی-

ہاسٹل واپس آ کر میں نے اپنی جون میں واپس آنے کی پوری کوشش کی کتابیں کھول کر سامنے رکھیں نوٹس فائل پر قلم سے لکیریں کھینچیں- ان لڑکیوں سے شریک گفتگو ہوئی جن سے پہلے کبھی شاید بات بھی نہ کی ہو- تانیہ اس دوران بالکل خاموشی سے میرا مشاہدہ کر رہی تھی- گو بظاہر وہ اپنے کاموں میں مصروف تھی پھر ایک دم اس نے کمرے میں آنے پر مجھ سے پوچھا-

''عائشہ! اس طرح تم خود کو الجھا لو گی- جو تم چاہتی ہو وہ کرو' جو سمجھتی ہو کہ ٹھیک ہے' وہی کرنا بہتر ہے-'' وہ اسی طرح بغیر تمہید کے براہ راست بات کرتی تھی- میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور سر جھکا کر رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں کوئی نہ نظر آنے والی شے ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی-

''ویسے یہ فن ہے' آرٹ ہے- اس کو کلچر بھی کہا جا سکتا ہے- مہاراج کہتے ہیں کہ اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے من کا صاف ہونا بہت ضروری ہے اور جس چیز کے لیے من کا صاف ہونا ضروری ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی-'' اس نے لیکچر دینا شروع کیا-

''ہاں' یہ البتہ درست ہے کہ جہاں سے تم آئی ہو' وہاں اس کی گنجائش بالکل نہیں ہے-'' پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا-

''تمہارا دل کیا کہتا ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھا- میں نے جیسے بے بسی کے عالم میں آنسو بہانا شروع کر دیے-

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی-'' اس نے مایوسی سے سر ہلایا- ''عائشہ! اس سے پہلے میں نے تمہیں یوں خود فراموشی میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھا- اس ماحول میں تمہارے اندر جو گھنٹیاں بجی تھیں تم ان کی آواز کانوں میں پڑنے سے روکنے کے لیے جتنے مرضی ہاتھ اپنی سماعت پر رکھو- یہ بجتی گھنٹیاں ہر دم تمہارے ساتھ رہیں گی- بغیر کسی ٹریننگ اور ریاضت کے- تم نے جس طرح وہ اسٹیپ لیے' میں کیا' وہاں موجود ہر شخص دم بخود ہو گیا- یہ ایسے ہی ہے جیسے . . . .

کوئی شخص اچانک تحریک ملنے پر برش اٹھا کر اصل سے ہو بہو ملتی جلتی تصویر بناتا ہے اور پھر اس پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ وہ تو مصوری جانتا ہے- ایسے لوگو کو ''بورن آرٹسٹس'' کہا جاتا ہے اور پیدائشی فنکاروں کو جب موقع ملے- اور وہ اس سے فائدہ حاصل نہ کریں تو یہ بھی قتل کے مترادف ہے-''

''کاش میں وہاں نہ گئی ہوتی- کاش تم مجھے وہاں نہ لے کر جاتیں-'' میں نے بہ دقت کہا-

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے-'' وہ لاپروائی سے بولی- ''یہ کیفیت تو زندگی کے کسی بھی موڑ پر تم پر طاری ہو سکتی تھی- یہ تو وہ ہے جو تمہارے اندر ہے تم اسے کیسے روک سکتی ہو-''

میں نے کوئی جواب نہ دیا- صرف ایک نظر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا-

''اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے- رقص سیکھ کر تم اپنے اندر کی ذات کی نفی کرو گی- تم کو پروفیشن تھوڑی بنانا ہے کو- اس satisfaction (تسکین) کے لیے تم اس کے رنگ و آہنگ سیکھو- یہاں

میں اور ملتان کے اس چک میں بہت فاصلہ ہے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ وہاں کس کو معلوم ہو سکتا ہے- اس سے تمہاری انفرادی زندگی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے- صرف یہ ہی ہے نا کہ تم اپنے ٹیلنٹ کو چمکا لو گی- انسان کی کوئی ایسی ایکٹوٹی بھی ہونی چاہیے یار! تم اتنا پڑھ لکھ گئی ہو- تمہارے خوف اور تعصبات تمہیں ختم کر دیں گے' تمہاری ہر صلاحیت اور شوق کو- اس سے تو بہتر تھا کہ تم وہیں پڑی رہتیں- میٹرک پاس سگھڑ سلیقہ مند بی بی-''

اب وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی-

میں نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں نفی میں سر ہلایا اور منہ سر لپیٹ کر لیٹ گئی مگر تانیہ میری کمزوری کو جان گئی تھی- اس نے اٹھ کر ٹیپ ریکارڈ لگایا اور گھنگھرو باندھ کر مشق کرنے لگی-

''کبھی بولے چھن-'' مہاراج کے ماہر گویے کی آواز ابھری- ساتھ میں تانیہ کے گھنگھرو گونجے- ''کبھی بولے چھن-'' اس ردھم کے ساتھ پاؤں کو فرش سے بجایا-

''کبھی بولے چھن تیرے گھنگھرو-'' اس نے آدھا چکر گھوما-

''ہے یہ شوم پن کہ بن نہیں کرتے پن تیرے گھنگھرو-''

چھن چھن لے کے ساتھ تانیہ نے اگلا قدم اٹھایا اور مجھ پر دوبارہ سے وہی کیفیت طاری ہو گئی- کسی نے میرے اندر زور سے انگڑائی لی اور بیدار ہو گیا- میں ہیجان کی کیفیت میں اٹھ کر چارپائی سے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی-

''گیا دل بھی چھن جو نہی بولے چُھن-'' گویے نے اگلا انترا اٹھایا- اور تانیہ گھومنے لگی-

''لگی لگن کوئی ڈالے گن تو میں گاؤں گن-'' تانیہ کے اگلے چکر میں آگ تھی' ایک شعلہ تھا' جس نے میرے وعدوں' میرے تعصبات' روایات کی پاس داری' اصولوں اور نصیحتوں کو آگ لگا کر بھسم کر دیا تھا- میرا جسم پسینے میں شرابور ہونے لگا-

''اٹھو عائشہ!'' تانیہ نے محو رقص بھی میری کیفیت کو بھانپ لیا تھا-

''گیا دل بھی چھن جو نہی بولے چھن-'' مصرعہ دہرایا گیا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھی اور پھر-

ملامت می کند خلقے و من بر دار می رقصم

اس کے بعد میر زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا- میں نے ابا کے بھجوائے جیب خرچ سے مہاراج کی تربیت گاہ کی فیس ادا کی اور باقاعدگی سے تربیت حاصل کرنے لگی- میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ سب میں کیوں کر رہی تھی مگر میں کر رہی تھی-

میرے مستقبل کا نقشہ جو بننے والا تھا اس پر اس کا پیچ میں کہاں جوڑوں گی- میں یہ بھی نہیں جانتی تھی یہ زندگی کا وہ قدم تھا جس کے سلسلے میں' میں نے تمام احتیاط' شرم و حجاب اور اصولوں سے منہ موڑ لیا تھا- میں وہاں پہنچ کر ایک ایسی دنیا میں مگن ہو جاتی جس میں جا کر مجھے اپنا وجود ہر بوجھ' ہر غم'

فکر سے آزاد محسوس ہوتا- سازندے کی موسیقی' گویے کی تان اور رقص کا ردھم میں مگن ہو جاتی- مہاراج کے لیکچر جیسے میری روح کو شانت کر دیتے-

''ہر شے میں تال ہے' لے اور سر ہے' تخلیق ارتقاء اور بقا اور تخریب میں رقص ہے- روح کی تشکیل اور آزادی میں رقص ہے-''

وہ کہتے اور کائنات میرے ارد گرد رقصاں ہو جاتی وہ جو میرے اندر کوئی جاگا تھا' مہاراج کی ہاں میں ہاں ملاتا-

''ہر شے میں تال اور سر ہے' لے ہے اور رقص ہے-''

''رنگ اور سر اور رس' حرکت' تال اور لے ساری کائنات میں ردھم ہی ردھم ہے-'' میرا دل گواہی دیتا اور میں کسی خیال کی لے پر رقصاں ہو جاتی-

یہ وہ چار پانچ مہینے تھے جب آپ کے بقول میں آپ کو نظر نہیں آئی- تھرڈ ایر کے امتحان میں' میں نے معمولی سی پوزیشن لی اور میری ٹیچرز چونک گئیں-

''یہ کیا ہوا عائشہ اس بار؟'' ان میں سے ہر ایک نے پوچھا-

''کچھ بھی نہیں میڈم! اس بار ایگزیم میں' میں بیمار ہو گئی تھی- اس لیے تیاری نہ کر سکی-'' میں نے اس عرصے میں دھڑلے سے جھوٹ بولنا بھی شروع کر دیا تھا-

''مگر آپ جیسی اسٹوڈنٹس تو پیپر تیار نہ بھی کریں تو ایسی پوزیشن نہیں آنی چاہیے تھی-'' مس فخر نے کہا-

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میڈم! مگر میں نے پیپر بھی بخار کی حالت میں دیے تھے- کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھ رہی ہوں-''

ایک اور جھوٹ بولا- اور وہ مطمئن ہو گئیں- میرے جیسی لڑکی سے انہیں جھوٹ اور غلط بیانی کی توقع جو نہ تھی-

فورتھ ایر کے سال کا پہلا حصہ کتھک کی باقاعدہ تربیت میں گزرا- پہلے ابتدائی چیزیں پھر ہم نے تماثیل اور قصوں کو رقص کی زبان میں پیش کرنے کا فن سیکھا- اس سیکھنے کے دوران میں نے وہ کچھ بھی سیکھا جو یہاں آئے بغیر غالباً کبھی نہ سیکھ سکتی تھی- پہلے باہر نکل کر میں جو کسی اجنبی سے بات کرنی پڑ جانے پر لال گلال ہو جایا کرتی تھی- سب سے پہلے وہ شرم و جھجک کم ہوئی- اس کو تانیہ اعتماد کا فقدان کہا کرتی تھی-

پہلے میں وقت مقررہ سے زیادہ دیر تک باہر رکنے کے تصور سے ہی کانپ جایا کرتی تھی- کیونکہ لیٹ آنے والی لڑکیوں کے بارے میں خواہ وہ کتنی پاک باز ہی کیوں نہ ہوتیں' طرح طرح کی کہانیاں گھڑی جاتی تھیں- ہوسٹل کے چوکیدار تک ایسی لڑکیوں کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے

تھے- اب میں بغیر ڈرے رات پڑنے پر بھی ہاسٹل واپس آ جاتی اور چوکیداروں اور ہاسٹل کی وارڈن تک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہانے گڑھنا شروع ہوگئی تھی-

میں نے پہلے ہلکا پھر تیز میک اپ کرنا شروع کر دیا جدید وضع کی تراش خراش کا لباس پہننا شروع کر دیا تھا- میرا دوپٹہ سر سے اتر کر کندھوں پر پھیلا اور پھر اس زمانے کے ہائی فیشن کے مطابق چن کر گلے کے گرد لپٹ گیا- جب تربیت کے درمیان میں پہنچے مہاراج کا ایک شو آ گیا- اس کے لیے خصوصی لباس کی تیاری کا مرحلہ درپیش ہوا- اگر چہ میرے دل سے وہ جھجک ابھی تک نہیں گئی تھی، جس کی وجہ سے مجھے اس طرح اوپن ہو کر پرفارمنس دینا مشکل امر لگ رہا تھا مگر مہاراج کے ہاں کا ماحول ہی ایسا تھا- ہر نیا بندہ ذوق وشوق سے تیاریوں میں مصروف تھا- وہاں جا کر ایک امنگ، ایک جذبہ دل میں بیدار ہو جاتا تھا- اور پھر میں تو اس وقت کی ایک اہم ٹرینی تھی-

اب میں نے ان چار سالوں میں پہلی بار خود سے ابا کو خط لکھ کر زیادہ جیب خرچ بھجوانے کا مطالبہ شروع کر دیا- وجہ وہی پٹی ہوئی تھی کہ پڑھائی زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے زیادہ پیسے درکار تھے- میل ہا میل دور بیٹھے میرے معصوم اور شریف النفس باپ کو کیا معلوم تھا کہ اس کی محنت کی کمائی کو میں کس شوق کی نذر کرنے جا رہی تھی- انہوں نے میری توقع سے زیادہ رقم بھجوائی، مع ایک پدرانہ شفقت سے بھرپور خط کے- جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ صرف میرے لیے محنت کرتے تھے اور جو وہ کماتے تھے، وہ اسی لیے تھا کہ میں اپنی تعلیم، لگن اور جستجو کو بھرپور طریقے سے مکمل کر سکوں- مزید یہ کہ ان کی آنکھیں اور دل شوق اور انتظار کی کیفیت سے لبریز ہیں- کب میں اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس پہنچوں گی اور وہ مجھے گھر میں موجود دیکھ سکیں گے- (واضح ہو کہ بی اے کے سال کے آغاز سے اس وقت تک میں کسی چھٹی میں بھی گھر نہیں گئی تھی- جس کے لیے میرا موقف یہ تھا کہ وقت ضائع ہونے کا اندیشہ تھا- جبکہ میں ان چھٹیوں میں مہاراج کی کلاسز لیتی رہی تھی-)

اس شو کے لیے مجھے اپنے لباس کی مناسبت سے سرخ، کالی اور سنہری کانچ کی چوڑیاں درکار تھیں- میں اور تانیہ یہ ضروری خریداری کرنے کے لیے انارکلی گئے تھے- چوڑیوں کی دکان پر جگمگاتی چوڑیاں دیکھتے ہوئے مجھے ایک غیر متوقع مگر مانوس آواز اپنے عقب سے سنائی دی-

''عیشاں! ہا! یہ تو اپنی عیشاں ہے-'' مجھے جیسے فل وولٹ کا کرنٹ لگا اور میں نے فطری طور پر گردن گھما کر دیکھا- وہاں کالے روایتی برقعے میں پھنسی پھنسائی چہرے کو نقاب سے ڈھانکے ایک شخصیت کھڑی تھی-

''ہاں، یہ تو واقعی عیشاں ہے-'' اس نے پیچھے مڑ کر ایک اور شخصیت سے کہا- تیل سے چپڑے بالوں اور سرمے سے بھری آنکھوں والی یہ پہلی شخصیت مجھے قدرے مانوس لگی-

''عیشاں! میں ہاجرہ ہوں-'' پھر برقعے والی نے اپنا تعارف کرایا-

میرے چہرے پر جو پل کی پل میں عیاں ہوا، میرے جسم کو جس نے تھرتھرایا اور میرے دل میں جو کرنٹ کی طرح دوڑا، وہ خوف جیسے ذرا کی ذرا سکون پذیر ہوا- کسی دوسری شخصیت کے بجائے ہاجرہ پھر بھی ایسی شخصیت تھی جس سے مجھے کم خطرہ لاحق ہو سکتا تھا وہ اپنی نئی شادی کے بعد شوہر کے لاہور میں مقیم رشتہ داروں سے ملنے وہاں آئی تھی اور اب انارکلی کی سیر کرتی پھر رہی تھی- وہ بجا طور پر میرے نئے حلیے میری سہیلی اور نئے طور طریقوں پر حیران و پریشان تھی-

''ہاں! یہ تو ٹھیک ہے بھئی، اب شہر میں رہنا ہے تو شہر والوں کی طرح رہنا ہے-''

انارکلی کا معروف فروٹ جوس پیتے ہوئے اس نے اپنے میاں کو جیسے تسلی دیتے ہوئے کہا- حالانکہ میں جانتی تھی کہ یہ تسلی وہ خود اپنے آپ کو دے رہی تھی اس شریف انسان کو بھلا اس بات سے کیا غرض ہو سکتی تھی کہ میں کیسی بن گئی تھی- میں نے ہاجرہ سے اماں اور ابا کا حال پوچھا اور اس نے روح کو توڑنے والی ایک بات کی-

''چاچی تمہاری شادی کی تیاریاں کر رہی ہیں لحافوں کے لیے روئی بہاولپور سے منگوائی سچی کپاس کی، کھیس خاص طور سے ملتان سے کتوائے ہیں سچی تمہارا جہیز تو اتنی شان سے تیار ہو رہا ہے کہ کیا بتاؤں-''

''میری شادی!'' میں نے ناگواری سے کہا، اور پھر خاموش ہو گئی-

''چاچی کہتی ہے کہ عیشاں چودھویں پڑھ کر آ جائے پھر فوراً شادی کر دوں گی-'' ہاجرہ نے مزید ٹکڑا لگایا-

میں اماں کے اس فضول شوق سے بے حد واقف تھی اور مجھے اس میں ظاہر ہے کہ کوئی خاص دلچسپی نہ تھی- میں نے فروٹ چاٹ اور جوس سے ہاجرہ کی تواضع کی اور پھر اس سے رخصت ہو کر تانیہ کے ساتھ واپس ہاسٹل آ گئی، پھر میں نے اوپن ایئر تھیٹر میں ہونے والے شو میں شرکت کی- یہ وہ شو تھا جس کو آپ نے نہیں دیکھا اس میں ہم نے ہیر رانجھا کی تمثیل پیش کی اور خاص بات یہ تھی کہ ہیر کے کردار پر میں نے پرفارم کیا- لوگ کہتے تھے کہ میری ایک ایک جنبش اور لفظوں کے زیر و بم پر میرے آہنگ نے لوگوں کے دل جیت لیے تھے-

``Touching Perprmance``

اس شو پر ایک مختصر ریویو ڈان میں شائع ہوا، مگر یہ اتنی غیر اہم جگہ پر لگا کہ کم ہی لوگوں کی نظر اس پر پڑی ہو گی-

اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا- میں نے مہاراج کے ساتھ فلیٹیز ہوٹل میں پرفارم کیا اور ایک آدھ نجی محفل میں بھی- مہاراج کا جو شو آپ نے دیکھا تھا، اس وقت بھی میں زیر تربیت تھی سو میں بھی تماشائیوں کے درمیان بیٹھی تھی- اگر واقعی آپ ذرا عقل سے کام لے کر مہاراج کے کیمپ تک

چلے جاتے تو میں آپ کو مل جاتی' مگر واقعات کو جس طرح ظہور پذیر ہونا ہوتا ہے' وہ اسی طرح رونما ہوتے ہیں اب سوچوں تو جانوں کہ آپ کو اس وقت مل بھی جاتی تو کیا فائدہ ہوتا- جس سرکشی پر میں منہ زور ہو کر اس وقت اتری ہوئی تھی اس میں آپ کی بساط کیا ہوتی؟

ان ہی دنوں میں ایک روز اچانک ہاجرہ مجھ سے ملنے ہوسٹل آ گئی- وہ اپنے کسی سسرال رشتہ داری کی وفات پر لاہور پہنچی تھی-

''ہاعیشاں! یہ کمرہ تو امیر زادیوں کا کمرہ لگتا ہے-''

اس نے کمرے میں موجود سامان پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا' جس میں سے بیشتر میرا تھا مگر میں نے اسے بتایا کہ وہ سب تانیہ کا تھا-

''چاچی نے پیغام بھجوایا ہے' پرچوں سے پہلے ایک بار اس سے مل جاؤ چاچی تو کبھی تمہیں یہ بات خط میں نہیں لکھیں گے- ان کا خیال ہے کہ اس سے تمہارا حرج ہوگا- ویسے بھی جب پرچوں کے بعد جائے گی تو جانے کے ساتھ ہی تیری شادی ہو جائے گی' چاچی کے پاس بھلا کیا رہ سکے گی-''

اس نے ٹھنڈی ٹھار سیون اپ کے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا-

''چلو رہنے دو...... مجھے نہیں کرنی شادی وادی-'' میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا-

''ہائے ہائے-'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا اور ہنسنے لگی-'' وہاں ساری تیاری مکمل ہے' چاچی رشیدہ نے تو ساری بری بھی بنالی ہے' چار ڈوپٹے مجھ سے منگوائے ہیں ملتان سے' کہتی ہے پڑھی لکھی لڑکی ہے شہر کی چیزیں پسند کرے گی-''

وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی اور میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تھا-

''کیا مطلب ہے' چچی رشیدہ اور اس کی بری' کہہ کیا رہی ہو تم؟'

''میں نے کیا کہنا ہے' تمہاری شادی' تمہاری بری' بلکہ بھائی اعجاز کی بری-'' اس نے سادگی سے کہا-

''شٹ اپ' پلیز شٹ اپ!'' میں نے بے قابو ہوتے ہوئے کہا-

''ہاعیشاں' گالیاں دے رہی ہے انگریزی میں-'' اس نے ذرا برا مانتے ہوئے کہا-

''تم سے کس نے کہا' چچی رشیدہ نے یا اعجاز نے-؟ یہ دن کے خواب کس نے دیکھے ہیں-؟''

''میرے سے کس نے کہنا ہے' سارے چک کو پتا ہے خود چاچی خورشید تیاریاں کر رہی ہے اس نے تو چاول تک تلوا کر صاف کر لیے ہیں-''

میں ہاجرہ کی بات پر کبھی بھی یقین نہیں کر سکتی تھی- سو میں نے اسے چچی رشیدہ کی اڑائی گپ سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہا' رہیں اماں تو وہ تو میری شادی کے خواب اس وقت سے دیکھ رہی تھیں' جب

میں نے گڑیا کھیلنا چھوڑ دیا تھا-

میں اس بات کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی مگر میرے چاہنے کے باوجود بھی ہاجرہ کے جانے کے بعد کئی دن تک یہ بات میرے ذہن سے نہ نکل سکی-

''رقص کے لیے من کا صاف ہونا بہت ضروری ہے' من کی میل' من کا غصہ اور من کا دکھ رقص کی خوب صورتی کو کھا جاتا ہے' من کی صفائی کے بغیر ریاضت ممکن نہیں' ریاضت صرف اس طرح نہیں ہوتی کہ گھنگھرو تمہاری پنڈلیوں کا گوشت کھا لیں' بلکہ ریاضت کے لیے ذہن اور دل کا ہلکا ہونا بہت ضروری ہے-'' ایک روز مہاراج نے میری ٹینشن کو بھانپتے ہوئے کہا-

''جو تمہاری الجھن ہے' پہلے اس کو دور کرو پھر آگے کام کریں گے-'' انہوں نے دوبارہ مجھے غلط قدم اٹھاتے دیکھ کر کہا-

میں نے اسی دن چند دنوں کے لیے چک جانے کا پروگرام بنا لیا- میں اس الجھن کی آگ میں جل کر اپنے دن تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی- سو میں نے پہلی بار اکیلے ہی سفر کی تیاری شروع کر دی- یہاں میں یہ اعتراف بھی کروں گی کہ گھر اور چک کا تصور بھی مجھے عجیب سی بوریت میں مبتلا کر رہا تھا- اب میں اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھی جس کے ڈر سے میرے علاقے جیسے علاقوں کے لوگ اپنی بچیوں کو پڑھانے سے ڈرتے ہیں' کردار کی خرابی' آزاد روشی' ماڈرن اپروچ ان تینوں خدشات میں سے آخر الذکر دو تو میرے سلسلے میں سچ ثابت ہو رہے تھے اور وہ جو مجھے گھمنڈ تھا کہ شہر' کالج اور تعلیم کی آزاد ہوائیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں تباہ ہوتا دکھائی دیتا تھا-

ہاں! یہ بات البتہ ضرور تھی کہ میرا کردار اور میری اخلاقیات اب تک ثابت و سالم تھیں' وہ جو ایک خدشہ والدین کو لاحق رہتا تھا غالباً اب بھی ہوگا کہ گھر سے نکل کر لڑکی کا کردار خراب ہو جائے گا- اس سے میں یقیناً اس لیے بچ گئی تھی کہ سب کچھ موجود ہونے اور دیکھنے کے باوجود میرے دل میں ان چیزوں کے لیے کوئی کشش پیدا نہ ہو سکی تھی-

مہاراج کے ہاں لڑکے بھی تربیت حاصل کرنے آتے تھے- ان میں سب بہت سے پڑھے لکھے اور اٹریکٹو بھی تھے- کئی ایک نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی کی تھی مگر میں اس سلسلے میں اپنی سخت مزاجی اور درشتی کی وجہ سے محفوظ رہ گئی تھی- پھر تانیہ کا ساتھ بھی تھا جس کے لیے یہ معاملات کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے وہ خود بھی اس سلسلے میں لاپروا اور بے نیاز تھی-

اب میری گھر جانے کی تیاریوں کے دوران ہی تانیہ نے مجھے بتایا کہ مہاراج ایک ٹروپ لے کر یورپ جانے والے ہیں' مہاراج کے پروموٹرز اس بار ان کے شوز مختلف جگہوں پر کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں-

''مہاراج تمہیں ساتھ لے کر جانا چاہتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ تم جیسی باصلاحیت اور ماہر فنکارہ

سے لوگ یقیناً بہت متاثر ہوں گے، مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارے لیے ناممکن ترین بات ہے، تم نے کون سا اس چیز کو پروفیشن بنانا یا اس سے کمائی کرنا ہے- میں نے انہیں بتایا ہے کہ یہ صرف تمہارا شوق ہے-''

''ہاں، یہ تو ہے- یہ بات تو قطعی ناممکن ہے، بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ گھر سے واپسی پر میں یہ سلسلہ بالکل ہی ختم کر دوں- پیپرز سر پر کھڑے ہیں، کالج ایگزام کی بات دوسری تھی- یونیورسٹی کا رزلٹ ایسی چیز ہے جس کے سب منتظر ہوں گے- اگر وہ خراب آیا تو بہت برا ہوگا-''

میری نظروں کے سامنے سے ابا، اماں اور شاہ صاحب کے چہرے گزرے-

یوں میں سامان اٹھائے تانیہ کے ساتھ ریلوے اسٹیشن تک آئی وہاں سے ہی ملتان تک کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی- یہ عجیب بات تھی کہ پہلی بار اتنی دور کا سفر اکیلے کرتے ہوئے میرے دل میں کوئی خوف نہیں جاگا تھا، نہ ہی یہ ڈر آیا تھا کہ گھر پہنچوں گی تو ابا خفا ہوں گے یا فضول باتیں بنیں گی، لیکن ان باتوں سے ہٹ کر کوئی خوف ضرور تھا جو میرے دل میں اٹھتا تھا لیکن جس کو میں کوئی معنی نہیں پہنا سکی تھی-

ملتان تک کا سفر بخیر و خوبی گزرا تھا، اب اصل مسئلہ آگے کا درپیش تھا- میں نے چہرہ اور سر بڑی چادر میں لپیٹا اور قصبے کو جانے والی بس پر بیٹھ گئی وہاں کئی آشنا چہرے تھے مگر کوئی مجھے پہچان نہ سکا تھا قصبے سے آگے تانگے پر بیٹھ کر میں نے شکر کا سانس لیا تھا اب آگے سفر آسان تھا مگر وہ مانوس راستے، مانوس فضائیں اور مانوس منظر جو پہلی مرتبہ لاہور سے واپسی پر اتنے اپنے اپنے سے لگے تھے اب اجنبی سے لگ رہے تھے-

''کتنی یکسانیت ہے یہاں، ہر چیز پر جمود طاری ہے-'' مجھے اب تک یاد ہے میں نے ناک سکیڑ کر سوچا تھا، چک کے اندر جانے والے سولنگ پر جانے کے لیے میں گامے فوجی کے تانگے پر سوار ہوئی- گاما فوجی ساتھ والے چک کا رہنے والا تھا اور خاصی ہر دلعزیز شخصیت تھی- اس نے پہلے تو مجھے بغور دیکھا پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر جھٹکا اور گھوڑے کی باگیں ہلائیں-

''جوگی اتر پہاڑوں آیا تے چرخے دی کوک مک گئی-''

وہ مشہور گیت بہ زبان سرائیکی گنگنا رہا تھا، گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اس کی ٹانگوں پر چڑھے اور گلے میں پڑے گھنگھروؤں کے ساتھ گامے فوجی کی گنگناہٹ نے مجھے اچانک ایک ایسے نوسٹلجیا میں مبتلا کر دیا جو اس سے پہلے کبھی کبھار ہی دل میں اترتا تھا- میری آنکھوں میں ذرا دیر کو آنسو آ گئے نہ جانے یہ میری ماضی کا نوسٹلجیا تھا یا گھنگھروؤں کی آواز نے مجھے کسی اور کیفیت میں مبتلا کرنے کی سعی کی تھی-

''نیازی صیب دی گھراں ونج تھیوو-''

گامے فوجی نے مڑے بغیر پوچھا-

''ہاں!'' میں نے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا-

اس نے گھر کے عین سامنے جا کر تانگہ کھڑا کیا میں نے اسے کرایہ ادا کیا اور بیگ اٹھا کر اونچے مضبوط لکڑی کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی-

''ٹھن، ٹھناک-'' خالہ رحمت کے ہاتھ میں پکڑی پیتل کی بالٹی چھوٹی تھی اور پانی ایک دم بہہ گیا تھا مگر اسے قطعی پروانہ ہو رہی تھی-

''بے بے جان!'' اس کے منہ سے خوشی کی چیخ نکلی تھی- اماں اس کی آواز سن کر جلدی سے باہر آئی تھیں-

''میری جان نکال دی- کیا ہوا ہے نی رحمتے!'' انہوں نے جھڑکتے ہوئے خالہ رحمت کی نظروں کا تعاقب کیا اور جیسے ان کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا تھا-

''آج کوا بول رہا تھا، آج راستوں سے دھول اڑی تھی، چٹی نیہری آنے والی تھی میرا دل کہتا تھا میری عیشاں آئے گی پر دماغ کہتا تھا کہ کیسے، نہ کوئی لینے گیا نہ کسی نے بلاوے کا پیغام بھیجا- کیسے آئے گی-'' وہ خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھیں-

''تم اکیلی آئی ہو، دل تانگ کرے تو کوئی دس نہیں ریتا-'' پھر اس جذباتی منظر سے فارغ ہو کر انہوں نے مجھے اندر لے جا کر سمجھاتے ہوئے کہا-

''میرا اپنا دل بے چین تھا- تمہارے باپ سے کہا- وہ نہیں آ سکتی تو مجھے ہی لاہور لے جاؤ پر وہ نہیں مانے- تم آ گئیں- ماں کو خوشی ہوئی- پر بیٹا! یہ دنیا یہ لوگ بہت برے ہیں- ان سے یہ ذکر کرنا کہ تم اکیلی آئی ہو قیامت لانے کے مترادف ہوگا- اس لیے بہتر ہوگا کہ کہہ دیں گے کہ شاہ صاحب چھوڑ کر دوپہر دوپہر ہی میں واپس چلے گئے-''

''مگر اماں! شاہ صاحب تو تبلیغی مشن کے ساتھ گئے ہوئے ہیں-'' میں نے حیرت سے کہا-

''ہمیں پتا ہے نا- لوگوں کو کیا پتا-'' انہوں نے تسلی سے کہا اور عام لوگوں کو یہ ہی قصہ سنایا گیا-

ابا مسجد سے آئے تو مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی'' میں بہت اداس ہو گئی تھی ابا!'' میرے بے ایمان دل نے جھوٹا بہانہ گھڑا-

''میں جانتا ہوں بیٹا! اور دیکھو مجھے تمہارے تنہا آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا بلکہ شاید خوشی ہوئی، میں تمہیں ایسا ہی با اعتماد دیکھنا چاہتا ہوں، مگر علاقے کی ریتوں روایتوں کا احترام بہرحال کرنا پڑتا ہے، تمہاری اماں نے پہلی بار کوئی عقل کی بات کی اور درست بہانہ بنایا-''

میری روایتی خاطر مدارات اور ناز برداریاں شروع ہو گئی تھیں- اماں کا خیال تھا کہ میں کمزور ہو چکی ہوں اور میرا رنگ بھی خراب ہو گیا ہے-

''دفع کرو ایسی پڑھائی کو-'' خالہ رحمت نے روایتی سا کمنٹ دیا-مگر میں جانتی تھی کہ اگر اماں کا خیال درست تھا تو اس میں قصور پڑھائی کا نہیں اس سلسلے کا تھا جو میں نے شروع کر دیا تھا-

دوسرے دن اماں شوق وخوشی کی سرشار کیفیت سے باہر نکلیں اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں میری آؤ بھگت کرنا شروع کر دی-

میں نے تیل لگوانے سے انکار کیا' لسی ڈال کر بال دھونے سے انکار کیا' دیسی گھی میں پکے کھانوں سے منہ موڑا اور حسب عادت چچی رشیدہ اور ان کی بیٹی کی آمد پر اماں کے بلاوے کے باوجود کمرے کے اندر بیٹھی رہی-اماں یہ سب دیکھ رہی تھیں- چچی رشیدہ کمرے میں آ کر مجھ سے ملیں-اس بار خلاف معمول ان کا رویہ میرے ساتھ تیکھا ہونے کے بجائے بڑا میٹھا اور خوشامدی سا تھا-

''آ گئیں راہ راست پر-'' میں دل ہی دل میں طنزاً ہنستی رہی-

ان کے جانے کے بعد اماں چرخہ لے کر بیٹھ گئیں' میں ان کے پاس بیٹھ کر خالہ رحمت کو لاہور کی باتیں سنانے لگی' مجھے گھر کے سینیٹری سسٹم پر سب سے زیادہ اعتراض ہو رہا تھا اور کل سے اسی بات پر میں بے تکان تبصرہ کر رہی تھی-

''کر کتں ول دھیان کڑے-'' پھر اچانک اماں نے دھیمے سروں میں تان اٹھائی-

نت متیں دیندی ما دھیا
کیوں پھرنی ایں اینویں' آدھیا
نہ شرم حیانوں گوا دھیا
تو کدے تاں سمجھ ندان کڑے

وہ چرخہ کاتنے کے ساتھ مسلسل گنگنا رہی تھیں خالہ رحمت اسے ان کی پرانی عادت جان کر دھیان نہیں دے رہی تھی' مگر میرے کان پورے کے پورے کھڑے ہو گئے تھے-میں جانتی تھی کہ یہ وہ مجھے سنا رہی تھی-

نت متین ریاں ولتی نوں
اس بھولی کملی جھلی نوں
جد پوسی وخت اکلی نوں

''ہا! ہا! کرسی جان کڑے-'' اماں مست ہو کر گنگنائے جا رہی تھیں-

توں سدا نہ پیکے رہنا اے
نہ پاس امڑی دے بہنا اے
بھاہ! انت وچھوڑا سہنا اے

وس پئیں گی سس نناں کڑے
کرماں نہ حسن جوانی دا
پردیس نہ رہن سیلانی دا
اس دنیا جھوٹی فانی دا
نہ رہ سی نام نشان کڑے

''اور کیا ہے رحمتے اس میں؟'' اماں نے چرخے کی تانت کستے ہوئے آہستگی سے پوچھا-

''ہائے بی بی پیر پر یہ نشان کیسے ہیں؟'' رحمت خالہ نے میرے پاؤں دباتے دباتے پنڈلیوں پر سے ذرا سی اٹھی شلوار کے نیچے دیکھتے ہوئے کہا-

''کچھ نہیں-'' میں نے تیزی سے پاؤں چھڑا کر پیچھے کیے اور شلوار درست کی-

''کیسے نشان؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا-

''کچھ نہیں' ایک بار کیڑا اچھر گیا تھا ٹانگ پر-'' میں نے لرزتی آواز میں جھوٹ بولا-

''احتیاط کرنا چاہیے' ایسے نشان مٹتے نہیں-'' اماں نے یونہی کہا اور پھر مشغول چرخہ ہوئیں مگر نجانے کیوں مجھے ایسے لگا جیسے انہوں نے میرے دل کا چور پکڑ لیا ہو' میرا دل ان کی گنگناتی کافی اور پھر ان کے کہے جملے میں اٹک گیا تھا-

تھوڑی دیر کے بعد خالہ رحمت ایک گٹھڑی اٹھائے آ گئی-اس ململ کی چادر کے اندر بیش قیمت کپڑے تھے' زردوزی' اطلس اور کمخواب کے-

''بے بے جان نے شہر سے منگوائے تھے شاہ صاحب کو کہہ کر' وہ کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہے عیشان اب ایسے کپڑے ہی پسند کرے گی-'' وہ چمکتے چمکاتے کپڑے اٹھا اٹھا کر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی-

''کیا ضرورت تھی اتنا خرچا کرنے کی' میں بھلا یہ کپڑے کیسے پہن سکتی ہوں-'' میں نے غصے سے کہا-

''ساری دلہنیں پہنتی ہیں' تم کیا شادی کے دنوں میں سوتی کپڑے پہنو گی یا لٹھے کے-'' خالہ رحمت نے مذاق سے کہا-

''ادھر رشیدہ بی بی نے بھی ایک سے ایک کپڑا منگوایا ہے بری کے لیے' یہ شادی تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی چک کی سب سے شاندار شادی ہوگی-'' خالہ رحمت نے ایک دھماکا سا کیا تھا-

''کیا مطلب ہے؟'' یہ کہتے کہتے میری نظریں اماں کی نظروں سے چار ہوئیں-جو غالباً اس بات کی منتظر تھیں کہ اس بات کو سن کر میرا ردعمل کیا ہوگا--

''مطلب کیا ہو سکتا ہے' وہی جو ہونا چاہیے' وہی جو تھا-'' پھر وہ سکون سے بولیں-

"کیا مطلب ہونا چاہیے؟ کیا مطلب تھا؟" میں نے ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ سوال کیا۔

"تمہاری اور اعجاز کی شادی اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔"

"یہ کس کا دماغ خراب ہوا؟ کس نے اس قدر لغو اور بیہودہ بات سوچی ہے۔" میں نے غصے سے بپھر کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ دماغ آج خراب نہیں ہوا بی بی! نہ ہی یہ لغو اور بے ہودہ بات اب سوچی گئی ہے۔ یہ تو عرصے سے طے تھا۔" اماں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کون سے عرصے سے؟ کس نے طے کیا؟ مجھ سے کیوں نہیں پوچھا بتایا؟"

"یہ بات اس وقت سے طے ہے جب سے تمہیں پڑھنے کا شوق کودا تھا' لاہور جا کر پڑھنے کا شوق آیا تھا کیا تمہیں وہ دن یاد نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں پہلے کا وہ دن جب امتیاز کی شادی تھی۔ تمہارے ابا اور انور میں یہ بات عرصے سے طے تھی تمہارے رویے پر ان کا غصہ اسی لیے بجا تھا اور پھر جب تم نے پڑھائی پر زور لگایا تو تمہارے باپ نے اسی وعدے کے بعد تمہارا شوق پورا کرنے تمہیں لاہور بھیجا تھا کہ جب تم پڑھ لکھ جاؤ گی تو تمہاری شادی اعجاز ہی سے ہوگی رہی بات تم سے پوچھنے اور بتانے کی تو یہ تمہارا اور تمہارے باپ کا معاملہ ہے۔ میں نے جب بھی پوچھا' انہوں نے یہی کہا' اس سے بات ہو چکی ہے عائشہ کو پتہ ہے کہ کیا ہونا ہے اگر انہوں نے تمہیں نہیں بتایا تو اس میں ان کی کیا مصلحت تھی۔ یہ وہ ہی بتا سکتے ہیں۔"

"نہیں' نہ کبھی نہیں۔" میرے اندر کا وہ انجانا خوف جو چند دن سے میرے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اب پوری طرح سامنے آ گیا تھا اور میرا رواں رواں اس کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ میں نے وہ سارا دن تڑپتے کھولتے اور اس حقیقت سے جنگ کرتے گزارا تھا۔ شام تک مجھے غالباً ایک سو تین ڈگری بخار چڑھ چکا تھا۔

ابا مسجد سے آئے تو انہیں صورت حال کا ادراک ہوا۔ اماں ان سے جھگڑ رہی تھیں وہ غالباً ان سے یہ دریافت کر رہی تھیں کہ مجھے کیوں نہ بتایا گیا تھا اور ابا اس بات پر خفا تھے کہ اب بھی کیوں بتایا گیا تھا جب میں پرچے دے کر آ جاتی تو خود ہی سہولت سے بتا دیا جاتا۔ ان دونوں میں یہ بحث جاری تھی اور میں بخار میں پھنکتے ہوئے یہ بحث سن رہی تھی۔

"کاش قیامت ٹوٹ پڑتی مگر یہ الفاظ میرے کانوں میں نہ پڑے ہوتے۔" میں سن ہوتے دماغ کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ "وہ اعجاز" مجھے الٹی آنے لگی۔ "کاش میں نے کچھ نہ پڑھا ہوتا' کاش میں اب تک بیری کے درخت پر ہی بیٹھی ہوتی' کاش میں کسی روڈ ایکسڈنٹ میں مر جاتی۔"

میں ہذیان سوچتی رہی' نجانے وہ کتنواں دن تھا جب مجھے بخار سے ہوش آیا اور ذرا سی سمجھ آتے ہی ایک تصور نے میرے جلتے دماغ پر خنک چھینٹے ڈالے' ابا اور شاہ صاحب' ہر معاملے میں میرے

مددگار رہے تھے' میری جائز و ناجائز ماننے والے' میرے تھوڑے آنسو' میری بھوک ہڑتال بلکہ میری یہ مسلسل بخار کی کیفیت ہی کام کر دکھائے گی میں نے سوچا اور کچھ دیر کے لیے شانت ہو گئی۔

میرے ذرا سنبھلنے پر ابا میرے پاس آئے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ان کی طرف اور وہ میری طرف تقریباً پندرہ منٹ تک مسلسل خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے سر جھکا لیا۔

"تمہاری اماں درست کہتی ہیں بیٹا! مجھے یہ بات تمہیں بہت پہلے بتا دینی چاہیے تھی' مگر میں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اگر تم کو پڑھائی کا اتنا شوق ہے تو پھر تمہیں تسلی اور سکون سے پڑھنے دینا چاہیے' غلط تمہاری اماں نہیں تو غلط میں بھی نہیں تھا۔

دراصل! بیٹا میں اس کا کیا کروں کہ تم پر مجھے اپنی ذات سے بڑھ کر اعتماد ہے' اسی اعتماد کی وجہ سے میرا دل کہتا تھا کہ جب بھی تمہیں اس بات کا پتا چلے گا' تم اسے خدا کی اور پھر باپ کی رضا جان کر قبول کر لو گی بیٹا دل کے ماننے کی بات ہو تو شاید میرا بھی نہ مانے لیکن اس چیز میں مصلحت ہے' شاید مجبوری بھی' انور اور میں ہر چیز کے حصے دار ہیں۔ میرے اور انور کے درمیان یہ بات شروع سے طے تھی کہ ہم آپس میں یہ رشتہ ضرور جوڑیں گے۔ ہمارا کوئی اور عزیز ہے ہی نہیں خصوصاً میرا۔ مجھے اس رشتے کی زیادہ ضرورت تھی۔ سب کچھ ٹھیک چلتا رہتا مگر درمیان میں تمہارا پڑھائی کا شوق آ گیا۔ میں نے تمہارا شوق دیکھتے ہوئے اس کے آگے اس لیے ہتھیار ڈال دیے کہ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا میٹرک کے بعد تمہاری پڑھائی پر شاہ صاحب نے مجھے مجبور کیا' مگر اس وقت انور اور میرے درمیان یہ معاہدہ ہوا' بلکہ میں نے اس سے عہد کیا تھا کہ تمہارے ایف اے کرتے ہی شادی کر دی جائے گی۔ تمہیں شاید وہ ہنگامہ یاد ہو جو اس سالانہ ختم کی صبح یہاں ہوا تھا اسی کی وجہ سے میں یہ عہد کیا تھا۔

پھر تم نے بی اے کرنے کے لیے جس انداز میں کہا' اس کے آگے میں مزاحمت نہ کر سکا۔ مگر تمہیں اپنی وہ بات تو ضرور یاد ہو گی جو تم نے اس وقت کہی تھی کہ۔

"صرف یہ بات مان لیں پھر جو آپ کہیں گے میں کروں گی۔"

تمہارے اسی وعدے پر یقین کرتے ہوئے میں نے تمہیں بی اے کرنے کے لیے بھیج دیا' تمہاری اس ذاتی خوشی کے لیے میں نے کیا کیا باتیں سنی اور سہی ہیں' یہ میرا دل جانتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم میری مجبوری اور حالات کو دوسروں کی نسبت بہتر طور پر سمجھ سکو گی اور جب واپسی کے بعد تمہاری شادی کا وقت آئے گا تم اسے حقیقت پسندی کے ساتھ قبول کر لو گی۔"

"مگر ابا!" میں نے اپنی ساعتوں پر بجنے والے ہتھوڑوں کی پروانہ کرتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔

مگر التجا' جذباتی بلیک میلنگ' مرنے جینے کی دھمکیاں کچھ بھی کام نہ آ سکیں۔ ابا کو الٹا میرے

ردعمل پر غصہ آیا تھا زندگی میں پہلی بار مجھے انہوں نے لال آنکھوں سے دیکھا تھا- پھر انہوں نے سبز باغ دکھانے شروع کیے- اعجاز سمجھ گیا ہے' بیبا بندہ ہے' اسکول بنوادے گا' خواہ قصبے کے اسکول میں ملازمت کرلو اعتراض نہیں کرے گا وغیرہ وغیرہ' مگر میں اپنے دل کا کیا کرتی جو کسی بھی طرح اس صورت حال کو ماننے سے انکاری تھا۔

مجھے خود پر غصہ آتا اور میں اپنے آپ پر سو بار لعنت بھیجتی میری گھمنڈ سے بھرپور بے نیازی نے مجھے وہ دن دکھایا تھا- نہ میں اپنے اردگرد سے اتنی بے خبر رہنے پر فخر کرتی نہ یہ باتیں وقت پر میرے علم سے باہر رہ جاتیں- کیا تھا جو اماں اور چچی رشیدہ کی جھڑپ کے بارے میں معلوم کرلیتی کیا ہوتا جو نستم والی صبح ابا اور چچا انور کے جھگڑے کا سبب جان لیتی اتنے عرصے میں سو بہانے اور سو فرار سوچے جاسکتے تھے- اب جب کوئی مہلت ہی نہیں رہ گئی تھی- سنبھلنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا اب کیا فائدہ تھا با علم ہونے کا-

پھر مجھے ابا پر غصہ آتا- کیوں انہوں نے مصلحتاً ان حالات سے مجھے بے خبر رکھا- مجھے پتا ہوتا تو اول تو میں پڑھنے ہی نہ جاتی' جو پڑھتی تو کم از کم اپنے آپ میں تو رہتی- اب میرے اونچے خوابوں' سوچوں اور آدرشوں کا کیا ہوگا اور پھر شاہ صاحب تھے جو ہر بات سے باخبر تھے انہوں نے بھی تو مجھے کچھ نہ بتایا تھا- وہ تو کہتے تھے کہ جو بات بڑوں کے کرنے سے سنبھالی جاسکتی ہو' اس میں الفاظ کے دریا بہانے کی کیا ضرورت تھی- بڑوں نے بات یوں ہی سلجھائی تھی کہ میرا سارے کا سارا مستقبل گروی رکھ کر مجھے پڑھایا گیا تھا۔

''کیا فائدہ تھا اس کا' کیا فائدہ تھا-'' میں نے بار بار کڑھتے ہوئے سوچا تھا- پھر نجانے کس طرح میں نے خود کو ٹھنڈا کیا اور سکون سے سوچنے کی تلقین کی- غصے سے بپھرنے سے کچھ نہیں بنے گا-

میں نے خود کو سمجھایا تھا اور آہستہ آہستہ نارمل ہوتے ہوئے میں نے بظاہر اماں اور ابو کی تسلی دی کہ جیسے وہ چاہیں گے ویسا ہی میں کروں گی- گھر میں ایک ہفتے سے پیدا ہوئی ہوئی بے چینی میری اس بات سے سکون پذیر ہوئی اور اماں اور ابا نے سکون کا سانس لیا-

پھر میں نے ان سے کہا کہ مجھے واپس جا کر پیپر دینا ہیں اور سامان لانا ہے- اس لیے اب مجھے جانے دیا جائے- انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا-

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے مجتبیٰ حسین صاحب! کہ جس روز میں نے چک سے لاہور واپس آنا تھا' اس رات میں خالہ رحمت کے ساتھ پورے چک میں گھومی تھی- بہت سارے لوگوں سے ملی تھی- سب لوگ ہی میرے مزاج کی اس تبدیلی پر حیران تھے اور یہ بھی تھا کہ میرا یوں خود سے ملنا بہت سے اپنا اعزاز سمجھ رہے تھے-

وہیں ساتھ والے چک کے ساتھ بہنے والے نالے کی طرف جاتے ہوئے میں نے شام کے پھیلتے اداس اندھیرے میں اعجاز کو کھیت میں کھڑے دیکھا- بڑے ہوئے بال' بڑھی ہوئی شیو ہاتھ پر تھوپی گئی مہندی کے رنگ اور انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں' آخ تھو میرا دل الٹ گیا- میرے نفاست پسند' لبرل مزاج کے باپ نے یہ میرے لیے کیا انتخاب کیا تھا- بہت سی بڑی بڑی باتوں پر نہ جھکنے والے شخص نے کہاں آکر ہمت ہار دی تھی-

''مصلحت' مجبوریاں فائدے-'' مجھے ابا کا بیان یاد آ گیا-

''روایات' عہد' وفا' عزت آبرو-''

بیان کا دوسرا حصہ-

ان کے لہجے کی سختی کے آگے میرے دم مارنے کی گنجائش نہ تھی- ان کے فیصلہ کن انداز کے سامنے میرے دلائل میری التجائیں بیکار تھیں' وعدوں کے نبھانے کے تمام مراحل سے کم از کم میرے سلسلے میں سرخرو ہوچکے تھے- اب انہیں ایک دوسرے وعدے میں سچا ہونے کا مرحلہ درپیش تھا-

میں ان کے لہجے میں کسی لچک کے موجود نہ ہونے کی بو سونگھ چکی تھی- فی الحال مصلحت خاموشی اور رضامندی ہی میں تھی- نیازی پٹھانوں کا دماغ الٹتے دیر نہیں لگا کرتی- میں ٹھنڈے سوچنا چاہتی تھی- اس آخری شام نالے کے پاس بیٹھے بیٹھے میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا ہے- بے خود ہو کر اپنی خواہشات اور آدرشوں کو پورا کرنا ہے- اپنی زندگی بچانا ہے یا پھر اپنی عظیم خوشیوں کو ہمیشہ کی آگ میں جلا دینا ہے-

میرے سامنے ایک اکیلا جگنو گلاب کی شبنم آلود جھاڑی میں دمک رہا تھا اور بے نیازی سے اڑتا پھر رہا تھا- ایک گرگٹ کانٹے دار ٹہنی سے اڑ کر سبز پتوں سے لدی گھنی شاخوں میں جا چھپا تھا' کہیں دور ایک آوارہ کتا مسلسل رو رہا تھا اور میرا دل میرے کل کے خاکے اور منصوبے تشکیل دے رہا تھا اور جب میں نالے سے اٹھ کر شبنم آلود کھیتوں کی مٹی پر پاؤں جماتی واپس گھر کی طرف آئی میں دل میں فیصلہ کرچکی تھی کہ آئندہ مجھے کیا کرنا تھا-

اگلی صبح ابا مجھے واپس چھوڑنے چلے- گامے فوجی کا تانگہ قصبے تک جانے کے لیے خاص طور سے جتوایا گیا تھا اور صبح ہی صبح ہم عازم سفر ہوئے تھے- چلنے سے پہلے میں اماں اور خالہ رحمت سے ملتے ہوئے پہلی بار دھواں دھار روئی تھی- میں نے اماں کی کڑوں والی کلائیاں چومیں اور گورے نرم ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا- گھر کے ایک ایک کونے کو غور سے دیکھا شاید حسرت سے بھی-

اماں میرے اس انداز سے رخصت ہونے پر حیران تھیں اور خود بھی رو رہی تھیں- راستے میں میں نے مانوس منظروں کو غور سے دیکھا' گھر کے اندر کا بیری کا درخت دور ہوتا نظر آ رہا تھا- زمیندار سلطان کا کنواں' آنکھوں پر کھوپے چڑھائے بیل گھوم رہے تھے اور کنویں کے چکو پانی اگل رہے

تھے۔ ایک درخت کے نیچے شیدانائی اپنی میز کرسی شیشے اور سامان سجائے کسی کا خط بنانے میں مصروف تھا۔ وہ قصبے سے آنے والی سڑک پر رکی بس سے تصویروں کے ڈبے والا اپنا ڈبہ سنبھالتا اتر رہا تھا۔ اس روز وہ چک چک گھوم کر بچوں کو تماشا دکھانے والا تھا۔

میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ درخت' وہ پیڑ' وہ راستے یکبارگی میرا دل ان تمام منظروں کے قربان جانے کو چاہنے لگا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے اپنا مستقبل یاد آ گیا اور میں وہیں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

ملتان اسٹیشن سے لاہور تک کے سفر میں ابا مجھے نرم لہجے میں سمجھاتے رہے اور تسبیح کے دانے پھیرتے رہے۔ میں فرمانبردارانہ شکل بنائے چادر سے سر لپیٹے سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی۔ ان کے خیال میں میرا مستقبل تابناک تھا۔ قریب ہونے کی وجہ سے اعجاز مرعوب رہے گا' میں راج کروں گی' اسکول بناؤں گی۔ میری تعلیم اگلی نسل کے کام آئے گی' میں اپنوں میں رہوں گی۔ ماں' باپ کے پاس۔

کالج کے گیٹ پر پہنچ کر میں نے جی بھر کر ابا کو غور سے دیکھا اور استدعا کی کہ میرے پیپرز کے دوران دو تین ماہ میں مجھے قطعی ڈسٹرب نہ کیا جائے تا کہ بس یکسوئی سے محنت کر کے پڑھ سکوں۔

''پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ سے شاید میں باقاعدگی سے خط نہ لکھ سکوں' فکر مت کیجیے گا۔''

یہ آخری جملے تھے جو میں نے اپنے نیک' مشفق' شریف اور محبت بھرے دل کے مالک باپ سے کہے اور کالج کے اندر گھس گئی۔

میں کالج ٹائم میں آئی تھی اسی وجہ سے ہوسٹل خالی تھا۔ اندر آ کر میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر اکیلی بیٹھی کمرہ بند کیے روتی رہی اور تانیہ کے آنے تک میں اپنے دل سے پچھتاووں' غموں' پشیمانیوں کے لاوے آنسوؤں میں بہا چکی تھی۔

اسے اپنے دل اور گھر کا احوال بتائے بغیر میں اس شام مہاراج کے پاس گئی اور لندن جانے والے ٹروپے کے بارے میں پوچھا' تانیہ اور مہاراج دونوں حیران تھے کہ میں اس ٹروپے کے ساتھ جانے پر رضامند کیسے ہو گئی تھی۔ مگر میں نے فن کی خدمت اور اس فن کو کلچر کا حصہ بنانے کے لیے کوشش کرنے کے بارے میں وہ تقریر کی جسے سن کر وہ دونوں میرے شوق اور جذبے کے قائل ہو گئے۔

مہاراج اور ان کے ساتھی دل سے چاہتے تھے کہ میں اس ٹروپے کے ساتھ جاؤں۔ کیونکہ میں اس وقت ان کی تربیت گاہ کی ہونہار ترین اسٹوڈنٹ تھی۔ سو میرا نام ٹروپے کے شریک کاروں میں شامل ہوا اور ریہرسلز شروع ہوئیں۔

آج لکھنے بیٹھی ہوں تو سوچتی ہوں مجتبیٰ حسین صاحب کہ میرے اندر وہ دم خم کیسے آ گیا جو میں

نے اپنی روایات اور وفاداری کے عہد کی پاسداری کو جذباتیت اور غصے کے گھاٹ اتار دیا۔ کیا وہ عمر اور اس عمر کی عقل اور امیچورٹی کا نتیجہ تھا کہ میں اپنے تئیں اپنے مستقبل اور زندگی کو داؤ پر لگانے چلی تھی۔ کون سا فن اور کہاں کی خدمت میرا ابتدائی ارادہ تو یہ ہی تھا کہ میں ٹروپے کے ساتھ جاؤں' وہاں کچھ وقت گزاروں اور اسی فن کے حوالے سے اپنے مستقبل کے کچھ چانسز بناؤں تا کہ واپسی پر جو نقشہ میرے ماں باپ میری زندگی کا بنا رہے تھے اس سے بچ جاؤں۔ سو میں نے قدیم تمثیلوں کی کردار نگاری کی مشق شروع کی اور این او سی۔ ویزا پاسپورٹ کے مراحل سے گزر کر کوچ کا دن آ گیا۔

جس روز ہمیں شام کو لندن کے لیے فلائی کرنا تھا' اسی روز صبح کی ڈاک سے مجھے شاہ صاحب کا خط ملا۔ جو انہوں نے انقرہ سے بھجوایا تھا۔ وہ تبلیغ مشن کے ساتھ یورپ گئے اور اب انقرہ پہنچے تھے۔ ان کے خط کے مندرجات بھی ویسے ہی تھے جیسی ابا کی راستے بھر کی گفتگو۔ انہوں نے بھی اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ میری اور اعجاز کی ''مجوزہ'' شادی کا تذکرہ کیا تھا ان کا خیال تھا کہ اگر چہ یہ کوئی منطقی فیصلہ نہیں تھا مگر جو ہمارے حالات تھے ان کے لحاظ سے اس فیصلہ کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے امید ظاہر کی تھی کہ میں بی اے کے امتحان میں فرسٹ کلاس لاؤں گی اور پھر اپنے علاقے میں جو اس وقت تک جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ علم کی روشنی پھیلاؤں گی۔ اس سلسلے میں ابا' اعجاز' چچا انور اور ان کے بعد شاہ صاحب کی دعائیں میرے ہمراہ ہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہونہہ! الفاظ' الفاظ اور صرف الفاظ کا الٹ پھیر لفظ' کہانیاں' امیدیں' توقعات' مفروضے' محض کلیشے اور میں نے ان کا خط پڑھ کر بددماغی سے سوچا تھا۔

''میرے بزرگوں نے مجھ سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ کیا وہ مجھے اس مشن کے تحت پڑھا رہے تھے کہ میں ان کے بقول اندھیرے علاقے میں روشنی اور ذہنوں کو جلا وغیرہ بخشوں گی اور اس سارے کے عوضانے میں مجھے اعجاز جیسے جاہل' غلیظ اور بدتمیز شخص کا عمر بھر کا ساتھ ملے گا۔ اگر ابا اور شاہ صاحب کے بقول میرے حالات میں میرے لیے اور کوئی موقع پیدا ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اس بیک ورڈ علاقے میں کس شہزادہ گلفام نے مجھے بیاہنے آنا تھا' تو مجھے ایسے ہی بھی چھوڑا جا سکتا تھا۔ علم کی روشنی تو میں شادی شدہ ہوئے بغیر بھی پھیلا سکتی تھی۔ خود اپنے ذہنوں سے تو برسوں پرانے لڑکی کے لازمی شادی شدہ ہونے کے تصور کو نکال نہیں سکتے تھے۔ جہالت تو یہ تھی جس میں یہ دونوں اپنے تئیں پڑھے لکھے' سوجھ بوجھ رکھنے والے اصحاب ڈوبے ہوئے تھے اور توقع مجھ سے کر رہے تھے روشنیاں پھیلانے کی۔''

میں نے پتے ذہن کے ساتھ سوچا تھا اور شاہ صاحب کا خط معہ ان کی اس تصویر کے جس میں وہ استنبول کی مشہور مسجد کے سامنے کھڑے تھے، پھاڑ کر پرزہ پرزہ کردی تھی۔

آپ اگر اس قصے کو غور سے پڑھ رہے ہیں مجتبیٰ حسین صاحب! تو پھر اس ذہنی زوال پر ضرور غور کیجیے گا جو اس وقت مجھ بدبخت پر آیا ہوا تھا۔ میں جو اپنے تئیں ایک مزید نئی دنیا دریافت کرنے چلی تھی جس کے اردگرد کے لوگ اس وقت اسے ایک فرسٹ ریٹ پرفارمنگ آرٹسٹ

(First rate performing artist)

گردان رہے تھے۔ جن کے بقول میرے جانے سے طائفے کی قدروقیمت اور قابلیت بڑھنے والی تھی۔ اس وقت مجھے دنیا اپنے سامنے تسخیر ہوتی نظر آرہی تھی۔ لندن، پیرس، بلجیم، اٹلی میں نہ جانے کہاں کہاں جانے والی تھی اور نہ جانے کیا کیا کہلائی جانے والی تھی۔ اب پس ماندہ علاقے، تنگ سوچ، شرعی نقطہ نظر سے دنیا کے اندر حیثیت وغیرہ غیرہ بہت ثانوی بلکہ تیسرے درجے کی سوچ نظر آنے لگی تھی۔ اب سوچوں تو جانوں کہ جب کسی چھوٹے برتن میں زیادہ چیز ڈال دی جائے تو وہ یونہی ابلنے لگتی ہے یا پھر برتن ہی پھٹ جاتا ہے۔ مجھے اس وقت دنیا کی رنگارنگی اور دل فریبی میں اپنا آپ بے حد اہم لگ رہا تھا۔ جب سمجھ میں آیا کہ دراصل میں بے حد معمولی ہوں اور تنہا ہوں۔ اس وقت پانی سر کے بہت اوپر سے گزر چکا تھا مگر اب سوچنے کا کیا فائدہ۔

خیر، اس روز میں اپنا سامان باندھ کر تانیہ قدوائی کے چچا کے گھر پہنچی۔ میرے ساتھ میرے کپڑے، میک اپ کا سامان، جوتے، چند کتابیں اور وہ رقم تھی جو ابا نے آتے ہوئے دی تھی۔ میرے پاس وہ چار چوڑیاں جو ابا نے بنوا کر دی تھیں۔ سونے کی چین، چھوٹے ٹاپس اور ایک سونے کی انگوٹھی محفوظ تھی وہ رقم کم تھی۔ تانیہ سے تذکرہ کیا تو وہ بولی۔

''پیسوں کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں ہمارے کام کا معاوضہ ملے گا۔ طعام وقیام کا ذمہ پروموٹرز کے سر ہے۔ ہمیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

یہ دوسری بات تھی کہ تانیہ اس روز سے جب سے میں نے طائفے کے ساتھ جانے کا عندیہ ظاہر کیا تھا، اس وقت سے جانے کے وقت تک سمجھ نہیں سکی تھی کہ میں نے خود کو اتنا بڑا اقدام اٹھانے پر کیسے تیار کیا تھا۔

''تم نے اپنے پیرنٹس کو بتادیا؟'' اس دوران اس نے کئی مرتبہ مجھ سے پوچھا۔

''کچھ کچھ۔'' میں لاپروائی سے مختصر جواب دیتی رہی۔

''انہوں نے تمہیں ساتھ جانے کی اجازت دے دی؟'' اس کے لہجے میں شک تھا۔

''ہاں!'' میں یہ جواب اس لیے دیتی کہ اگر کسی کو یہ بھنک بھی پڑ گئی کہ میں یوں بغیر گھر والوں کی اجازت کے جارہی ہوں تو یقیناً کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ مہاراج کے نزدیک یہ

بات اتنی اہم ہوتی کہ وہ مجھے جانے سے منع کردیتے۔

''عجیب سی بات ہے عائشہ! کہاں تو ان کے بارے میں تم بتاتی ہو کہ وہ دقیانوسی اور پس ماندہ لوگ ہیں۔ تو تم اندر سے اٹھنے والے فن کے ابال کو دباتی رہی تھیں۔ کہاں وہ ایک دم تیار ہوگئے تمہیں بھیجنے پر۔''

تانیہ کی حیرت اور سوالات غلط نہیں تھے۔ کوئی بھی سنتا تو حیران رہ جاتا مگر یہ بھی تھا کہ تانیہ میری ہمراز اور گاڈ مدر نہیں تھی۔ سو اس نے ابتدائی سوالات اور شکوک کے اظہار کے بعد مجھے اپنی اس کوشش اور کامیابی پر بک اپ کرنا شروع کردیا تھا۔

''بہت اچھا ہوا، تم نے بولڈ بن کر فیصلہ کیا اور اپنی زنجیر تڑوا آئیں۔ اب تم جیسی فرسٹ ریٹ فنکارہ کو باندھ کر رکھنا تو ویسے بھی فن اور ثقافت کے ساتھ زیادتی ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

خیر، میں تذکرہ کررہی تھی اس روز کا جب ہمیں اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ تانیہ کے چچا ہمیں ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئے۔ پاسپورٹ اور ٹکٹ ہمارے ساتھ تھے۔ ایرپورٹ پر ہمارے گروپ کے دوسرے لوگ موجود تھے۔ کلیرنس سے فارغ ہوکر ڈیپارچر لاؤنج پہنچنے پر ہمیں لندن میں مقیم پروموٹر کے پاکستانی نمائندے نے بتایا کہ مہاراج کسی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جارہے تھے۔ گروپ کے چند لڑکوں کو اس بات کا پہلے سے علم تھا اور وہ کہہ رہے تھے کہ اب ہمارا پیٹرن کون ہوگا۔

''آپ سب لوگ خود باکمال ہیں۔ ریہرسلز کرچکے ہیں۔ اب پیٹرن کی کیا ضرورت ہے۔ ڈیڑھ مہینے کا ٹور ہے پھر آپ کو واپس مہاراج کے پاس ہی آنا ہے۔'' وہ شخص کہہ رہا تھا۔

''مگر ہمیں مہاراج سے ملنے تو دیا ہوتا۔ اگر ہمیں پہلے پتا ہوتا تو ہم ان سے مل کر آتے۔'' ایک لڑکی جس کا نام رخسانہ تھا، نے کہا۔

اور میں، جس کی ٹانگیں اس پہلے ہوائی سفر، بیرون ملک اور آنے والے دنوں کے تصور سے پہلے ہی کانپ رہی تھیں۔ مزید دل کے ڈوبنے کا شکار ہوئی۔

''مہاراج نے سب کو اجازت دے دی ہے جانے کی۔ سلیم صاحب سے پوچھ لیں۔'' اس شخص نے لاؤنج میں آتے ہوئے ایک اور شخص کی طرف اشارا کیا۔ یہ شخص مہاراج کا پرانا شاگرد تھا اور اکثر ہماری کلاس لیا کرتا تھا۔ سلیم صاحب کی موجودگی ہم سب کے لیے باعث اطمینان ثابت ہوئی اور ہم نئے جوش کے ساتھ سفر کے لیے تیار ہوئے۔

جب ہم جہاز میں بیٹھ کر ایر ہوسٹس کی ہدایت کے مطابق سیٹ بیلٹس باندھ چکے اور جہاز ٹیک آف کے لیے بالکل تیار ہوگیا تو تانیہ نے اچانک مجھ سے کہا۔

''عائشہ! تمہارے پیرنٹس نے کبھی سوچا ہوگا کہ ایک دن ان کی بیٹی یوں شہرت کی بلندیوں کو چھونے کے لیے آسمانوں پر محو پرواز ہوگی۔''

یہ بات اس نے انگلش میں کہی تھی اور اس بات پر بہت سے لوگوں نے مڑ کر میری جانب دیکھا تھا- میں نے محسوس کیا- اس خنک موسم میں بھی میرے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا-

''وہ کتنے خوش ہوں گے عائشہ! جب وہ تمہارے فن کے بارے میں لوگوں کے کمنٹس سنیں گے-'' آنے والے وقت کے تصور اور ایکسائٹمنٹ میں گم ہمارے تمام ساتھی اس بات پر ہنسے تھے اور جہاز نے ٹیک آف کیا تھا-

''تانیہ! میرے والدین کو قطعی علم نہیں کہ میں اس وقت کہاں ہوں- وہ میری شادی میرے جاہل' اجڈ اور گنوار کزن کے ساتھ کرنے کا پختہ فیصلہ کر چکے تھے- جس سے بغاوت کر کے میں تم لوگوں کے ساتھ چلی آئی ہوں- میرے اس اقدام کو عرف عام میں گھر سے بھاگنا کہتے ہیں-'' معلوم نہیں میرے الفاظ اور لہجے میں اتنی مضبوطی اور اعتماد کہاں سے آیا تھا جو میں نے چبا چبا کر یہ الفاظ تانیہ کے گوش گزار کر دیے تھے-

''کیا؟'' اس کا چہرہ حیرت سے سفید ہوا تھا یا خوف سے' یہ میں جان نہ پائی-

''میں نے غلط کیا؟'' اب میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا-

''نہیں' پتا نہیں-'' اس نے لرزتے لہجے میں کہا' لیکن تم تو کہتی تھیں کہ تمہارے والدین کو تم سے شدید محبت ہے' پھر انہوں نے تم پر یہ غلط اور ناپسندیدہ فیصلہ کیوں مسلط کیا؟''

''وہ اپنی شدید محبت کا خراج وصول کرنا چاہتے تھے اس لیے-'' میں نے بڑی بڑی کتابوں میں پڑھی بڑی بڑی باتیں کرنا چاہیں-

''او گاڈ عائشہ! تمہیں سوچ لینا چاہیے تھا تمہارے اس اقدام سے تمہارے واپس گھر جانے کے سارے امکانات بھی ختم ہو سکتے ہیں-''

''ہو سکتے نہیں' ہو چکے ہیں-'' میں نے سنجیدگی سے کہا-

''پھر؟'' اب اس کی آنکھیں پھٹ گئیں-'' پھر تم کیا کرو گی؟ کہاں رہو گی؟ کیسے رہو گی؟''

''تانیہ! کیا تمہاری دنیا میں ایک فرسٹ ریٹ پرفارمنگ آرٹسٹ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو گی-'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا- جواب میں اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا-

'''' کیا تم نہیں کہتی تھیں کہ مجھ جیسی پیدائشی آرٹسٹ کو اپنا ہنر اور ٹیلنٹ فن کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے-''

''ہاں' یہ تو ٹھیک ہے-''

اس نے کہا اور پھر اچانک ہی میرے اس فیصلے کو سراہنے کے لیے تقریر کرنا شروع کر دی' اور ایسی تقریر کی کہ اس طویل اور تھکا دینے والے سفر کے اختتام تک میرا دل آنے والے ہر لمحے کے خوف سے آزاد ہلکا اور پرسکون ہو چکا تھا- ورنہ میں ظاہر جو بھی کر رہی تھی' یہ حقیقت تھی کہ پاکستان سے

چلنے سے پہلے مجھے ایسے لگتا تھا کہ وہاں کی زمین میرے پاؤں جکڑ رہی ہو- سیکیورٹی کلیرنس کے دوران اچانک میرا دل بھاگ کر واپس چلے جانے کو چاہنے لگا تھا- اپنی زمین' اپنے وطن کے متعلق بچپن سے ہزاروں مرتبہ سنی باتوں کا اثر ذہن پر کیا تھا یہ اس مرحلے پر سمجھ میں آ رہا تھا- مگر طیارے میں تانیہ قدوائی کی باتوں نے جیسے مجھے سارے تعصبات' خوف اور بے سکونی سے آزاد کر دیا تھا-

اب اتنے طویل سفر کے بعد سینکڑوں مرتبہ سنا ہیتھرو ایئرپورٹ میرے سامنے تھا- یہ اس دور کی بات ہے جب برطانیہ کے ویزے کا حصول آج کی طرح دشوار نہیں تھا- اور یہاں پر پاکستانی پاسپورٹ کو اس حقارت سے نہیں دیکھا جاتا تھا' نہ ہی پاکستانیوں کے لیے یہ لوگ اتنی ``Reservation`` رکھتے تھے پھر ہمارے پاسپورٹس پر تو آرٹسٹ درج تھا- ہمیں یہاں خوش دلی سے ریسیو کیا گیا- ہمارے پروموٹر شیر علی صاحب ایئرپورٹ پر موجود تھے-

ایک مرتبہ پھر بتاؤں کہ وہ دور تھا جب پاکستان سے خال خال کوئی ثقافتی طائفہ یہاں آیا کرتا تھا- آج کل تو ہر دوسرے دن کوئی طائفہ یہاں آ موجود ہوتا ہے- جس میں بے سرے بے ڈھنگے سفارشی فنکاروں کی بھرمار ہوتی ہے جو یہاں آ کر فحش لباس اور گری زبان کے ساتھ اپنے تئیں ہندوستانی کلچرل پروگرامز کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے ساتھ ساتھ ملک کو بھی رسوا کرتے ہیں- وہ زمانہ معیار اور وضع داری کا تھا- تب کلچر اور آرٹ کے نام پر جگت اور فحاشی کے دھبے نہیں لگے تھے- اسی لیے برصغیر سے آئے فنکاروں کا احترام ہوتا تھا- سو ایسا ہی احترام ہمیں بھی ملا- یہاں آ کر ہمیں مختلف لوگوں کے گھروں میں ٹھہرایا گیا- مجھے جس فلیٹ میں ٹھہرایا گیا- وہ یہاں کے خوبصورت علاقے سینٹ جانز وڈ میں تھا اور میری میزبان ایک ہندوستانی نژاد خاتون ثمن دیدی تھیں-

وہ خود بھی کلاسیکل رقص کی ماہر تھیں مگر کتھک کے بجائے بھارت ناٹیم ناچتی تھیں- میں طائفے میں موجود ان لوگوں میں سے تھی جو لندن کی سڑکوں اور اونچی عمارتوں کو منہ اونچا کر کر کے دیکھ رہے تھے- کچھ وہ تھے جن کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا' ان ہی میں تانیہ قدوائی بھی شامل تھی- اس کے بہت سے رشتہ دار انگلینڈ میں رہتے تھے اور وہ اس سے پہلے تین مرتبہ یہاں آ چکی تھی-

جب میں نے سنا کہ وہ اپنی کسی خالہ کے ہاں ٹھہر رہی تھی تو میں نے سوچا کہ وہ مجھے بھی وہیں رہنے کی آفر دے گی' مگر میری توقع کے برعکس اس نے ثمن دیدی سے کہا-

''یہ میری دوست ہے- اب اس کی میزبانی اور ذمہ داری آپ کے ذمے-''

میں ایک انڈین خاتون کے ساتھ رہنے میں متامل تھی- (اس دور میں فنانسر اور پروموٹر اتنے فراخ دل نہیں تھے کہ فنکاروں کو ہوٹلوں میں ٹھہراتے- یہ آج کل کے انڈر ورلڈ کا فنانسر ہے جو ٹکے ٹکے کے فنکاروں کو پروموٹ کر کے اپنے کالے دھن کو سفید اور چھوٹے فنکاروں کی قیمت بڑھاتا ہے-) لہٰذا اس زمانے میں پروموٹرز کے تعلق دار (وہ جو فن اور فنکاروں کی قدر کرتے

تھے۔) آنے والوں کو بخوشی اپنے ہاں ٹھہراتے تھے۔

''انڈین ہیں تو کیا ہوا۔ ہندو تو نہیں ہیں نا۔'' تانیہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''اور دیکھنے میں تو بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ اب آ ہی گئے ہیں تو کہیں ٹھہرنا تو ہے، ہی کون سا ہمیں یہاں ان لوگوں کے ساتھ ہمیشہ رہنا ہے۔ دن بھر تو اپنے کام میں مصروف رہیں گے، رات ہی گزارنا ہے نا۔''

چنانچہ میں قدرے بے دلی کے ساتھ ثمن دیدی کے پاس ٹھہرنے کو تیار ہوگئی۔

ایک نئے اور انتہائی ترقی یافتہ ملک میں یہ نئی نئی آمد ہمیں بے حد ایکسائیٹڈ بھی کر رہی تھی۔ ہم صادق حسین صاحب کے گھر پر ریہرسلز کے ساتھ اس نئے ملک کو ایکسپوز بھی کر رہے تھے۔ ہمارا پہلا کانسرٹ رائل البرٹ ہال میں ہونے والا تھا۔ اس شو کے لیے ہم نے دوسرے ایونٹس کے ساتھ امیر خسرو کا ''سکل بن پھول رہی سرسوں'' تیار کیا تھا۔ اور اس کے سلسلے میں ہم سب بہت پر امید تھے۔ یہ اتنی مصروفیت، جوش اور دلچسپی کے دن تھے کہ مجھے ایک بار کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا کہ میں پیچھے کیا کر آئی تھی، اور جو میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اس کے نتیجے میں، میں کیا فیس کرنے والی تھی۔ میرا حال ایسا تھا جیسے میں کوئی بڑی نامور رقاصہ تھی اور میرے پیروں کے نیچے ہر دم سرخ قالین بچھنے والے تھے۔ اس پر طرہ مجھے ریہرسلز کے دوران پرفارم کرتے دیکھنے والوں کے ریمارکس تھے۔ وہ میرے ایک ایک قدم پر، ایک ایک جنبش پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے تھے اور میں ہواؤں میں اڑتی تھی۔

پھر ہمارا پہلا شو ہوا۔ البرٹ ہال میں پرفارم کرنے کی خواہش ہر فنکار کو ہوتی ہے۔ اس وقت زیادہ ہوا کرتی تھی کیونکہ اس وقت وہ ہارٹ آف پرفارمنگ آرٹ کہلاتا تھا۔ شو کے ٹکٹ ایشین کمیونٹی میں عموماً اور ساؤتھ ایشین کمیونٹی میں خصوصاً خاصے بکے تھے۔ اس وقت کلاسیکل رقص کے حوالے سے بھارتی فنکاروں کا طوطی بولتا تھا۔ پاکستان میں گو اس وقت خاصی لبرل جمہوری حکومت موجود تھی مگر مذہب کے نام پر ایکسپلائٹ ہونے کے ڈر سے نام نہاد پابندیاں موجود تھیں۔ ایسے میں پاکستانی فنکاروں اور کلاسیکل رقص کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں شکوک موجود تھے۔ وہاں اس چیز کو ہمارا کلچر نہیں سمجھا جاتا تھا مگر مجھے اپنی مختصر فنکارانہ زندگی کی وہ رات تمام عمر یاد رہ سکتی ہے وہ ڈی، ڈے تھا ایک ایسی ایکسائٹمنٹ، ایک ایسا جوش جیسے دنیا فتح ہونے جا رہی ہو۔ پھر تالیوں کی گونج تھی، سیٹیوں کی آوازیں تھیں اور ہم اپنے گروپ کی مرکزی علامت ''ہیر رانجھا'' پیش کر رہے تھے۔ میں جانتی تھی کہ تاریک ہال کی اسپاٹ لائٹ زیادہ تر میرے چہرے اور میری حرکات و سکنات پر تھیں، مگر نہ جانے کہاں سے مجھ میں وہ اعتماد اور حوصلہ آ گیا تھا کہ میں اتنی۔ میچورڈ اور باذوق آڈیئنس کے سامنے پرفارم کیے جا رہی تھی، اس رقص کے دوران مجھ پر میری وہی وجد اور سرور کی کیفیت طاری تھی۔ جس نے مجھے ایک اچھی بھلی سیدھی سادی جیتی

جاگتی زندگی سے اس زندگی میں لا پھینکا تھا۔ جہاں مجھے آگے چل کر پتا چلنے والا تھا کہ یہ کتنا بڑا جوا تھا، جو میں نے اپنے ساتھ کھیلا تھا۔

میں اپنی دھن میں مگن ایک ایک قدم اٹھا رہی تھی، میرے بازو گویا ہواؤں میں تیر رہے تھے۔ میرے پاؤں کے نیچے جیسے پانی سرک رہا تھا۔ پہلی تمثیل ختم ہوئی اور میں بے خودی سے ہوش میں آئی۔

لباس تبدیل کرنے اور میک اپ کے لیے درمیانی وقفہ آیا۔ میں نے ہیر رانجھا کی ہیر کی کیفیت سے خود کو ڈھالا۔ ''سکل بن پھول رہی سرسوں'' یہ ہمارے اس ٹور کے دوران مقبولیت کا نقطۂ آغاز تھا۔ حاضرین میں ہندوستانی فن رقص کے ماہر اور انٹرنیشنل بیلے نقاد بھی موجود تھے۔

شو کے اختتام پر ان میں سے کسی ایک نے میری جانب اشارا کیا۔

''یہ کتھک ڈانسر، ناچتے ناچتے صرف اس کے ہاتھوں اور پیروں کی حرکت ایسی تھی کہ بڑے بڑے بیلے نقاد انگشت بدنداں رہ گئے۔''

پروموٹرز اور میزبانوں کا سارے کا سارا رویہ میرے ساتھ اچانک بدل گیا اور میں نے جو خوابوں میں دیکھے تھے، وہ سرخ قالین میرے قدموں میں بچھنے لگے مگر میں اس ساری تعریف و توصیف، تالیوں اور کمنٹس سے بے نیاز اس کیفیت میں ڈوبی تھی جس میں اس تین گھنٹے کے شو جو تقریباً ساڑھے چار گھنٹے جاری رہا، نے مجھ پر طاری کر دی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس روز میں دل سے ناچی تھی۔ اس لیے نہیں کہ یہ بڑا شو تھا یا میں نے شہرت اور نام کمانا چاہا تھا۔ بلکہ میرے دل سے ناچنے کی وجہ مجھ پر چھائی وہ کیفیت تھی جس نے شروع سے آخر تک میرے ذہن اور جسم کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ صرف میں جانتی تھی کہ میں خود اپنے آپ میں نہیں تھی۔ میرا وجود کہیں ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا اور میں فضاؤں میں رقصاں تھی مگر مجھے ہر اس تمثیل اور ایونٹ کے سارے توڑے یاد تھے جو میں نے اور میرے ساتھیوں نے پیش کرنے تھے۔

اس بے خودی کی کیفیت میں بھی میرا ایک بھی قدم غلط نہیں اٹھا تھا اور اس سارے کا انجام یہ تھا کہ میں گھنٹوں کے اندر اندر لائم لائٹ میں آ گئی تھی میرے گروپ میں شامل میرے ساتھی توصیفی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''محنت تو ہم نے بھی کی تھی اور پرفارم ہم نے بھی کیا تھا مگر یہ بات سو فیصد درست ہے کہ تم نے میدان مار لیا عائشہ!''

ان میں سے کئی ایک نے مجھ سے کہا۔

میں نے اس سارے میں اپنی ہمدم، رفیق ہمراز ساتھی کو تلاش کیا مگر مجھے تانیہ کہیں نظر نہیں آئی۔

''وہ تھک گئی تھی، اس لیے واپس چلی گئی۔'' کسی نے مجھے بتایا۔

''کمال ہے۔ مجھ سے مل کر تو جاتی۔'' میں نے بھاری پشواز دوپٹے سے نجات حاصل کر کے

گہنے اتارتے ہوئے سوچا-

☆☆

پھر ہمارا وہ ٹور کامیابی سے جاری رہا- پہلے شو کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا- ہمارے فن اور فن کاروں کے لیے داد وتحسین میں اضافہ ہوتا گیا- ناہید صدیقی کے علاوہ یہ دوسرا موقع تھا جب پاکستان سے آئے لوگ ہندوستانی اجارہ داری کا مقابلہ کررہے تھے- میں نے زندگی میں بے شمار غلط بیانیاں کی ہیں مگر میری یہ اسٹیٹمنٹ غلط نہیں ہے کہ اس ٹروپے کا مرکزی فکر اس وقت کی حد تک میں ثابت ہوئی- میرے اندر اپنے کیے کی پریشانی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دھن، فن اور رقص کی دنیا دیکھنے، سراہنے والے لوگوں اور پھر ملنے والے پرکشش معاوضوں، اعلا طعام قیام کی سہولتوں اردگرد بکھری خوبصورتیوں کے نظاروں نے جیسے بجلیاں بھر دی تھیں-

یہ ایک انڈر اسٹیٹمنٹ نہیں تھی کہ میں پیدائشی فنکارہ تھی- میں جانتی تھی کہ سر، تال، لے کے ساتھ قدم اور جسم کی جنبش کے آہنگ میں میرے جیسا کمال میرا کوئی دوسرا ساتھی حاصل نہ کرپایا تھا- پھر میں نے خصوصی طور پر ان شوز کے لیے سخت محنت اور ریاضت کی تھی- کیونکہ غالباً میرا لاشعور جانتا تھا کہ والدین کے مسلط کردہ مستقبل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جو مستقبل میں نے اپنے لیے چنا تھا اس کے لیے مجھے اسی قسم کی محنت کی ضرورت تھی-

اس ٹروپے کے ساتھ ہم نے لندن، شیفلڈ، گلاسکو اور ویلز میں پرفارم کیا- پھر گرینڈ کنسرٹ بریڈفورڈ میں ہوا- جہاں پاکستانی کمیونٹی بہت بڑی تھی- اس سارے میں ثمن دیدی میری میزبان ہونے کے ساتھ ایک اچھی دوست اور مددگار بھی ثابت ہوئیں- تانیہ کا رویہ میں نے دیکھا- پہلے کنسرٹ کے ساتھ ہی میرے ساتھ بدل گیا تھا- مجھے شک سا گزرا کہ میں نے کئی بار اپنے لیے اس کی آنکھوں میں حسد اور رقابت کے سائے بھانپے تھے- میں اس کے اس ردعمل اور مزاج پر حیرت زدہ ہوئی- اس کو تو ان کامیابیوں پر خوش ہونا چاہیے تھا- وہ تو انگلی پکڑ کر مجھے اس میدان میں لائی تھی- میں نے کئی بار اس سے گفتگو کرنا چاہی مگر اس نے کھل کر مجھ سے بات نہیں کی-

''تانیہ قدوائی کہتی ہے کہ عائشہ نیازی نے مجھے بائی پاس کرنے کی کوشش کی ہے-''

ہمارے گروپ کی ایک ساتھی نے مجھے بتایا- یہ کیسے ممکن تھا، میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی- کسی بھی تمثیل یا پیشکش میں مجھے جو بھی کردار دیا گیا- میں نے اس سے انصاف کرنے کی کوشش ہی کی تھی، کسی ساتھی سے آگے نکلنے کی تمنا تو مجھے کبھی نہیں رہی تھی- پھر تانیہ نے ایسا کیوں سوچا تھا- میری سمجھ میں نہیں آیا-

''تم لوگوں کے پروموٹرز کی چاندی ہو رہی ہے پاکستانی اور بنگالی ترسی ہوئی کمیونٹی کو تمہارے شوز دیکھنے کو ملے ہیں- یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے کمارہے ہیں مگر تمہاری رائلٹی بہت کم ہے-''

ایک روز ثمن دیدی نے مجھ سے کہا- وہ انگلینڈ اور باقی یورپ کے ٹور کے وقفے کے دوران مجھے اپنے ساتھ سیر اور شاپنگ پر لے گئی تھیں- میں نے ان کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی- کیونکہ میں پکاڈلی سرکس، ہائیڈ پارک، نیشنل گیلری، تساؤ میوزیم اور ویسٹ اینڈ کے تھیٹرز دیکھنے اور اپنی آنکھیں پھاڑنے میں مصروف تھی- معاوضہ جو بھی تھا، وہ سوان اینڈ ایڈگر اور آسٹن ریڈ کے اسٹورز سے شاپنگ کرنے کے لیے کافی ثابت ہورہا تھا- میں نے کارنبی اسٹریٹ میں اس زمانے کے مشہور اسٹورز ہزاینڈ ہر، لارڈ اینڈ لیڈی، ہی اینڈ شی سے خریداری کی اور خود کو کچھ دیر کے لیے ایلزبتھ ٹیلر اور صوفیہ لارین کی ہم سر سمجھا- کیونکہ اس دور میں یہ جگہیں فیشن کی جنگ کے وار آفس کہلاتی تھیں-

یقیناً جب میں دنیا ومافیہا سے گم ان سرگرمیوں میں مصروف تھی میرے آنے والے دن دانت کھولے مجھ پر زور زور سے ہنس رہے ہوں گے- کیونکہ ان دونوں میرا ذہن آنے والے دنوں کے لیے پہلی سوچ سے مختلف خاکے بنانے لگا تھا- پہلے میرے ذہن کا کینوس محدود تھا، میرا خیال تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد جب پاکستان واپس جاؤں گی تو ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا ہوگا- گھر خط لکھ کر حالات کی بو سونگھوں گی- فضا سازگار نہ ہوئی تو رقص کے میدان میں کوئی مستقبل تشکیل دوں گی- اس وقت جو میں ٹروپے کے ساتھ یہاں آئی تھی تو سراسر ذہنی فرار کے لیے آئی تھی میں اپنے ماں باپ کی اپنی شادی کے سلسلے میں سختی کی بنا پر اپنے عمر بھر کے وفاداری اور وعدوں کی پاس داری کرتے دل کو اس چھوٹی سی بغاوت پر آمادہ کرتے ہوئے اپنے خیال میں ان سے بدلہ لے رہی تھی-

اب یہاں آ کر میرے ذہن کا کینوس بڑا ہوگیا تھا بہت سوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میری آواز بہت خوبصورت ہے- ذرا سی محنت اور ریاضت مجھے ایک اچھی گلوکارہ بھی بنا سکتی ہے- مجھے آرٹ، ثقافت اور آرٹ اکیڈمیوں پر لیکچر دیے گئے تھے- میری ظاہری خوبصورتی، رقص کی مہارت اور پرکشش شخصیت کے متعلق مجھے جی بھر کر آگاہ کیا گیا تھا- ان لوگوں کی لائف ہسٹریز سنائی گئی تھیں جو فن کی دنیا کے بڑے نام بن چکے تھے- یہاں سکھانے والا ایک نہیں، ہزاروں تھے- پاکستانی، انڈین، بنگالی- اب پاکستان واپس جا کر میرے ذہن نے نئے پیمانے پر کام کرنا تھا مگر جس وقت میرا ذہن یہ خاکے بن رہا تھا، اوپر بیٹھا میرا خدا کچھ اور ہی لکھ رہا تھا-

ایک روز جب میں ثمن دیدی کے فلیٹ پر تھی اور خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی- کسی نے وحشت ناک انداز میں مجھے جھنجوڑ کر جگایا-

''عائشہ! اٹھو، بڑا غضب ہوگیا-'' کسی نے کہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا- میرا ذہن ابھی مکمل طور پر نیند کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا-

''عائشہ! جاگ بھی جاؤ- دیکھو انہوں نے کیا کیا-'' اب میں نے اپنے گروپ میں شامل نگہت کی آواز پہچانی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی-

"کیا ہوا؟" میں نے اپنے سامنے کھڑی سراسیمہ نگہت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شیر علی اور اس کے ساتھی اچانک کہیں غائب ہوگئے۔" اس نے بتایا۔ "غائب ہوگئے۔" میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "کہاں غائب ہوگئے؟"

"آج رات جب طاہر نے ان سے پیرس جانے کا پروگرام پوچھنے کے لیے رابطہ کیا تو وہ وہاں نہیں تھے اپنے فلیٹ پر۔ اس نے ہر اس جگہ پر انہیں تلاشا جہاں وہ ہوسکتے تھے مگر وہ نہیں ملے۔ صبح پتا چلا کہ وہ اچانک یہاں انگلینڈ سے کہیں اور چلے گئے ہیں۔ کل دوپہر کو ان کی فلائٹ تھی، غالباً ناروے کے لیے۔"

"تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آجائیں گے۔" میں اب بھی نہ جانے کہاں گم تھی۔

"کہاں سے آجائیں گے عائشہ بے وقوف، وہ اپنے ساتھ ہمارے باقی کے معاوضے، پاسپورٹس اور آئی ڈی سرٹیفکیٹس بھی لے گئے ہیں۔"

اب میرے پیروں تلے سے زمین کھسکی، بلکہ بیڈ کھسکا، کہنا چاہیے۔ کیونکہ میں ایک ہی بار میں اٹھ کر اس سے نیچے اتر آئی تھی۔

"وہ کہاں جائیں گے، کہاں گئے ہوں گے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" مسئلے کی انتہائی نوعیت کو سمجھتے ہی بے ربط جملے میرے منہ سے نکلے۔

"تم لوگوں کے ساتھ کوئی بہت بڑا دھوکا ہوا ہے، بلکہ فراڈ ہوا ہے۔" یہ ثمن دیدی نے بتایا جو چائے کی کشتی اٹھائے اندر آئی تھیں۔

"شیر علی اور اس کے ساتھی فنانسر ہم لوگوں کے لیے بھی نئے تھے مگر جب وہ اپنے ساتھ یہاں موجود معتبر لوگوں کی گارنٹی لائے تو ہم لوگوں نے بھی ان کے مہمانوں کو ٹھہرانے کی ہامی بھرلی۔ انہوں نے تمہارے شوز سے خوب کمایا۔ اس روز میں نے تم سے کہا بھی تھا عائشہ! وہ تم لوگوں کو کچھ بھی نہیں دے رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک دن یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ شخص ویزوں کی مدت اتنی کم رہ جانے کے باوجود اگلے پروگرامز Delay کیوں کررہا ہے مگر پھر میں اسے اس کی مصلحت سمجھ کر چپ رہی۔ اب جو نگہت بتا رہی ہیں، اسے سن کر مجھے خیال آیا ہے کہ وہ شخص کوئی ساؤنڈ اور پرفیکٹ قسم کا فراڈ تھا۔ تم نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پہلے مہاراج غلام حسین کو بھی تم لوگوں کے ساتھ آنا تھا مگر عین وقت پر وہ نہیں آئے۔ وہ کیوں نہیں آئے یہ جاننے کی کوشش تم لوگوں نے نہیں کی۔ اب میرا ذہن یہ کہہ رہا ہے کہ یقیناً اس شخص کے ساتھ ان کی کوئی درست ڈیل نہیں ہوئی ہوگی۔ جب ہی وہ نہیں آئے۔ اس طرح کے فراڈز پہلے بھی دو، تین بار منظر عام پر آئے اور انہوں نے اپنے ساتھ ورغلا کر لائے ہوئے لوگوں کو خوب خوار کیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سب کا تعلق پاکستان سے تھا۔"

ثمن دیدی کے لیے دلچسپ بات تھی۔ جبکہ ہمارے لیے ہوش اڑا دینے والا واقعہ۔ سب سے

بڑی پریشانی پاسپورٹس اور آئی ڈی سرٹیفکیٹس کی تھی۔ ان کے بغیر ہم کون تھے، ہمارا کہاں سے اور کس سے تعلق تھا۔ ہم کسی کو کیا بتاتے۔ وہ قیامت خیز صبح تھی۔ میں نے تانیہ جہاں ٹھہری ہوئی تھی، ان لوگوں کو فون کیا۔ ایک مزید ہوش اڑا دینے والی خبر میری منتظر تھی۔ تانیہ اس رات کی فلائٹ پر اپنے انتظام پر واپس پاکستان جاچکی تھی۔

باقی لوگ اس بحث میں مشغول ہوئے کہ تانیہ کے پاس پاسپورٹ کہاں سے واپس آیا تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ تانیہ نے اپنا پاسپورٹ ان کے پاس جمع ہی نہیں کرایا تھا۔ کچھ کہہ رہے تھے کہ تانیہ کی ان لوگوں کے ساتھ کوئی ملی بھگت تھی۔ کچھ کو یاد آرہا تھا کہ تانیہ ہی ان کو ان پروموٹرز کی طرف متوجہ کرکے لائی تھی مگر میرے لیے ہر بات اور قیاس آرائی سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ تانیہ واپس چلی گئی تھی اور میں اس اجنبی ملک میں بے نام ونشان اکیلی رہ گئی تھی۔

یہ احساس ہی میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا اور مجھے یاد ہے کہ میں کئی دن تک گم صم حالت میں چلتی پھرتی رہی تھی۔ گروپ کے باقی لوگوں کے یہاں تعلقات تھے۔ تقریباً سب ہی کا کوئی نہ کوئی واقف کار یہاں موجود تھا پھر ان کے پیچھے ان کے گھر والے، اعزاء واحباب ان کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والے تھے۔ میری طرح کا دوسرا کون تھا جس کے پیچھے کوئی اس اتنی بڑی جسارت سے واقف تک نہ تھا اور واقف ہو بھی جاتا تو میرے لیے تگ ودو کرنے والے رشتے دار مجھے مری ہوئی جان لینا کسی بھی کوشش سے بہتر سمجھتے۔ میرے لیے یہ تصور بھی روح فرسا تھا کہ میں اپنے گنے چنے متعلقین کو اطلاع دیتی کہ میں کہاں ہوں۔ کیا کارنامہ سرانجام دے رہی ہوں اور کس مصیبت میں پھنس چکی ہوں۔

ثمن دیدی، ان کے دوستوں اور واقف کاروں، میرے ساتھ آئے دوسرے لوگوں نے شیر علی اور اس کے ساتھیوں کا پتا چلانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر انہیں جیسے یا تو زمین کھا چکی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ ایک ایک کرکے میرے گروپ کے باقی لوگ دن رات کی کوششوں اور پیچھے سے ہلائی جانے والی ڈوروں کے سبب اس گرداب سے آزاد ہوتے جارہے تھے مگر میں کس سے کہتی اور کیا کرتی۔

کہاں کا فن، کہاں کا کلچر اور کہاں کی خدمت سب دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ میں جو گزشتہ چند دنوں میں خود کو دنیائے فن کا درخشاں ستارہ سمجھنے لگی تھی، پل کی پل میں خود اپنے آپ کو بے حد بے بس اور کمتر معلوم ہوئی۔ میں صدیوں سے چلی آرہی روایات، ماں باپ کی محبت شفقت، دعاؤں، ان کے لمس، ان کی خواہشات، ان کے خوابوں، ان کے اعتماد، مان، اپنی مٹی کی خوشبو، فضا کے رنگ اور مانوس اپنائیت لیے احساسات سے بغاوت کرکے اونچی اڑان کی کوشش میں پہلی ہی جست میں اپنے پر کٹا بیٹھی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ یہاں آنے سے پہلے کسی چھوٹی موٹی مشکل (اس قیامت کا تو کبھی تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔) کے بارے میں سوچتی تو تانیہ کے وجود میں مجھے ایک آسرے کا، ایک

دلاسے کا احساس ہوتا مگر اب جو تانیہ کو سوچنے بیٹھتی تو اسکی ذات کے بارے میں کڑی سے کڑی ملاتی زنجیر بنتی چلی جاتی۔

''اس کی نیت شروع ہی سے نیک نہیں تھی۔'' دل کو خیال گزرتا۔ ''وہ کالج میں میری مقبولیت سے' پڑھائی میں میرے کمال اور تعلیمی سلسلے میں میری کامیابیوں سے خار کھاتی رہی اور مجھے ڈاؤن ٹو ارتھ لانے کے لیے اس نے یہ سارے کا سارا کھیل کھیلا۔

مجھے اس کی باتیں' اپنے علاقے کی روایات سے بغاوت کی ترغیبات یاد آنے لگیں' جو اس نے اتنے نامحسوس طریقے سے دلائی تھیں کہ میرے گمان میں بھی کبھی اس وہم کا گزر نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھے اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''لیکن اگر اس بار چک سے واپسی پر میری ذہنی حالت اس بغاوت پر آمادہ نہ ہوتی تو وہ زبردستی تو مجھے یہاں نہیں لاسکتی تھی۔'' پھر دوسرا خیال آیا۔ ''مجھ پر یہ قیامت ٹوٹنا ہی تھی۔ اس کا محرک خواہ کچھ بھی ہوتا۔ یہ درست تھا کہ یہاں لانے میں تانیہ کی ترغیب کا دخل نہیں تھا۔ یہ سراسر میرا ذاتی فعل تھا۔ گو اس طرح چپ چپاتے یہاں سے تانیہ کے بھاگ جانے سے مجھ پر یہ عقدہ کھلا تھا کہ ان دنوں میں مجھے خصوصی اہمیت ملنے پر جب اسے میرے ساتھ اپنے مربیانہ تعلق میں کمی واقع ہوتی نظر آئی تو اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ صرف وہی جانتی تھی کہ میں کس طرح کیا کر کے یہاں پہنچی تھی' اور میرا واپس جانا تو پہلے ہی خطرے سے خالی نہ تھا۔ میرے واپس نہ جا سکنے پر میرے مستقبل کی حالت کیا ہو سکتی تھی وہی جانتی تھی کہ میرے لیے واپسی کی کوشش کرنے والا کوئی نہ تھا اور مجھے اس درپیش صورت حال میں اس کی مدد اور رہنمائی کی کس قدر ضرورت ہو سکتی تھی۔

اس نے مجھے ملنے والی اہمیت سے اٹھنے والی اپنے اندر حسد اور رقابت کی آگ کو خوب بجھایا تھا۔ میں اپنی حالت زار پر ساری عمر بھی روتی تو شاید کم ہوتا اس پر طرہ وہ سارے لوگ جو مجھے گزشتہ دنوں میں ''کوئن آف دی کلاسیکل ڈانس'' قرار دیتے تھے۔ وہ لوگ جو میرے قدموں تلے سرخ قالین بچھانے کو تیار تھے۔ جو فن ثقافت کے حوالے سے مستقبل اور ڈانس اکیڈمز کے قیام کے خواب دکھاتے تھے۔ ایک دم منظر سے یوں غائب ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں میں ان کے غائب ہو جانے پر ششدر تھی۔ ثمن دیدی سے ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولیں۔

''ارے تم کس کی باتوں میں آ گئیں عائشہ! یہ لوگ لفظوں ہی لفظوں میں زیرو کو ہیرو بنانے کے ماہر ہیں۔ انسان خود کو اتنا اہم سمجھنے لگتا ہے جیسے اس کے بغیر نظام کائنات چل ہی نہیں سکتا مگر جب ان لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ ان کے سامنے موجود لوگ پیٹرنز اور گائیڈز سے تہی ہیں ان کے سروں پر سے سونے کا ہاتھ اٹھ چکا ہے تو پھر یہ یوں ہی غائب ہوتے ہیں۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ بہت بڑے بڑے فنکاران کے ہاتھوں ان کے لفظوں کے طوطا مینا کی وجہ سے خوار ہوئے۔ میری

نصیحت ہے ایسے خوشامدی اور جھوٹے مکاروں کی باتوں میں کبھی نہ آنا۔ یہ عمر بھر تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے اور جب بھی تم پر کوئی مشکل وقت آئے گا' فصلی بٹیروں کی طرح اڑ جائیں گے۔''

وہ عمر بھر کی بات کر رہی تھیں' مجھے اس وقت پل پل مشکل اور ناممکن نظر آ رہا تھا۔ جب ہر طرف کمزور ہاتھ مار کر میں فارغ ہو چکی تھی تو ثمن دیدی جن کا احسان میزبانی تھا' جو وہ اس کرائسس میں بھی مجھے برداشت کر رہی تھیں نے وہ ازلی وابدی تلخ سوال مجھ سے کیا۔

''عائشہ! میں اتنے دن سے دیکھ رہی ہوں تم سایوں کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ اپنے پیرنٹس کو اطلاع کیوں نہیں دیتیں۔ وہ یقیناً تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ تمہارے سارے ساتھ والے ایک ایک کر کے چلے گئے۔ تم ابھی تک یہاں بیٹھی شیر علی اور اس کے ساتھیوں کی منتظر ہو' ان ہی کے پیچھے چکر لگا رہی ہو۔ تمہارا ویزا ختم ہونے میں اب چند ہی دن تو رہ گئے ہیں۔''

میں اس سوال پر پوری جان سے کانپ گئی۔ ''اب کیا جواب دوں گی۔'' میں نے سوچا مگر اس دیار غیر اور بے سروسامانی کی حالت میں مجھے کسی کو تو اپنا ہمراز بنانا تھا۔

مگر اس سے پہلے مجھے ایک کام کرنے کی سوجھی میں نے اس رات پاکستان تانیہ کے گھر فون کیا۔ اس کا یہ نمبر ڈس کنیکٹ ہو چکا تھا پھر میں نے اس ٹیلی فون نمبر پر فون کیا۔ جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کا کراچی والا گھر تھا وہاں سے معلوم ہوا تانیہ قدوائی ہندوستان میں مقیم ایک مسلمان صنعت کار گھرانے کے چشم و چراغ سے بیاہ کر پہلے بمبئی اور پھر نیویارک جا چکی تھی۔

یہ سب صرف پندرہ دن کے اندر اندر ہوا تھا' صرف پندرہ دن کے اندر۔ اتنے دن مجھ جیسے لوگوں کے ہوش میں آنے کے لیے ناکافی ہوتے ہیں مگر جس کمیونٹی سے تانیہ کا تعلق تھا' اس سے متعلق لوگ اتنے دنوں میں اپنی زندگیوں کے لینڈ مارکس پھلانگتے کہیں کے کہیں جا پہنچتے ہیں۔

اب مجھے مزید کوئی کوشش نہ کرنا تھی۔ سو اگلے روز میں نے چپکے سے اپنا سارا کا سارا احوال ثمن دیدی کو کہہ سنایا۔ وہ سن کر مسکرائیں اور بولیں۔

''عائشہ! اس بات کا اندازہ مجھے اسی روز ہو گیا تھا جب تم نے شیر علی اینڈ کمپنی کے فرار کے بعد دوسروں کی طرح اپنے وارثین کو اطلاع نہیں دی تھی۔ مجھے صورت حال کا درست اندازہ تو نہیں تھا مگر اس بات کا یقین ضرور تھا کہ پیچھے کہیں تمہارے ساتھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ایک بات بتاؤں عائشہ!

تمہارے جیسی حالات سے فرار حاصل کرنے والی لڑکیاں ہی اس قسم کے شیر علی کے دھوکے میں آتی ہیں۔ ورنہ کوئی محتاط' سمجھدار لڑکی اس افراتفری میں نہیں آتی۔ بلکہ آنے سے پہلے ایک بار مہاراج غلام حسین سے ضرور ملتی۔ ان کے نہ آنے کا جواز سنتی تو اپنے اگلے قدم کا فیصلہ سوچ سمجھ کر

کرتی- بالفرض ایرپورٹ ہی پر سہی' تمہیں پتا چلتا ہے کہ وہ نہیں جا رہے تو بھی ان سے فون پر فوری رابطہ کر کے وجہ معلوم کی جا سکتی تھی- یقیناً ان کو ان لوگوں کی دو نمبر حیثیت کا علم ہو چکا ہوگا جب ہی وہ نہیں آئے اور میری اطلاع کے مطابق انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت بھجوائی تھی کہ کوئی بھی ان لوگوں کے ساتھ نہ جائے مگر جب عقل پر پردہ پڑنا ہو تو سلیم صاحب جیسے بااعتماد لوگ بھی دھوکا دینے آن موجود ہوتے ہیں-''

''اب بتائیں کہ کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے ان کی طویل باتوں سے گھبرا کر بے صبری کے ساتھ کہا- کیونکہ مجھے اپنی ملامت اور اپنی عقل پر بھیجی جانے والی لعنت اچھی نہیں لگ رہی تھی-

''کرنا کیا ہے-'' وہ تجربہ کار' میچورڈ اور سمجھ دار عورت سنجیدگی سے بولی- ''تمہارے کالج اور ہوسٹل فون کر کے تمہاری اس وقت کی پوزیشن معلوم کرتے ہیں- اگر خیریت ہے' تو پھر تمہاری واپسی کا کوئی سلسلہ کرتے ہیں-''

میرا دل کھل اٹھا- میں جس غم میں مبتلا تھی- وہ ہلکا ہونے لگا- مجھے یقین تھا کہ ابھی کچھ نہ بگڑا ہو گا- میں ابا سے کہہ کر آئی تھی کہ مجھے کم سے کم دو ماہ تک ڈسٹرب نہ کیا جائے- یقیناً وہ میرے ایگزام ہو جانے تک کی مدت ختم ہو جانے کا انتظار کر رہے ہوں گے- میں دنیاوی معاملات میں کس قدر کمزور ثابت ہوئی تھی' راتوں رات بڑی فنکارہ بن جانے کے زعم میں مبتلا میں ایک ہی دھکے میں ماں باپ' ان کی خوشیوں بھری خواہشات اور علاقے کے روایتی تعصبات کو بخوشی گلے سے لگانے کو تیار تھی-

جن باتوں اور چیزوں کو دل ہی دل میں گالیاں دیتی رہی تھی' وہ یکا یک بڑی مانوس اور خوشگوار معلوم ہونے لگیں' اور اس وقت میں نے سوچا کہ انسان درحقیقت کتنا کمزور اور بزدل ہوتا ہے اور یہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ انسان تمام عمر جو فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ کبھی اسے نہیں ملتا چیزوں کی طرح انسان بھی بالآخر اپنے اصل کی طرف ہی لوٹتا ہے-

ثمن دیدی نے اپنے کسی پاکستانی شناسا سے کہہ کر لاہور میں مقیم ان کے رشتہ داروں کے ذریعے میرے کالج اور ہوسٹل کی صورت حال کا پتا لگوانے کی کوشش کی اور میں اتنے دن نئے خواب بننے میں مصروف رہی- ٹیمز کے پانی اور بگ بین کی آواز جو مجھے بڑی دلکش معلوم ہوتی تھی اسے چھوڑ چھاڑ اچانک ہی میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں گھنٹوں کا طویل فاصلہ منٹوں میں طے کر کے واپس پاکستان چلی جاؤں- مجھے اس اجنبی سرزمین سے اچانک اجنبیت اور وحشت محسوس ہونے لگی تھی اور میں دن کی ہر گھڑی میں اپنی لیے کسی اچھی خبر کی منتظر تھی- وہاں سے اچھا پیغام آئے گا- ثمن دیدی اور انڈین و پاکستانی کمیونٹی کے اچھے لوگ میرے لیے پیسے جمع کر کے مجھے واپس بھجوا دیں گے- میں جا کر کالج دوبارہ جوائن کروں گی- ٹیچرز سے کسی بھی بات کا بہانا کر کے دو ماہ

کی غیر حاضری کی معذرت کر لوں گی- امتحان دوں گی اور چپ واپس چلی جاؤں گی پھر بھلے ابا میری شادی اعجاز سے کریں یا اعجاز کے ڈیرے پر کھڑے کسی گھوڑے گائے سے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا-

پھر دس دنوں کے طویل وقفے کے بعد پاکستان سے اطلاع آئی- اس دور میں پاکستان سے چٹھی یا فون کا آنا آج کل کی برق رفتار سروسز کی نسبت ایک طویل اور انتظار کے جان لیوا مراحل سے گزرنے کے بعد ممکن ہوتا تھا- میرے لیے وہ اطلاع تو پھر بھی جلد آ گئی تھی- مجھے یاد ہے ثمن دیدی اپنے دوست کا فون سن کر آئیں تو ان کے چہرے پر کوئی خوشگواری نہ تھی- میں ان کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی-

''عائشہ! تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے-'' انہوں نے مجھے ذہنی طور پر تیار کیے بغیر کہنا شروع کیا- ''عزیز اللہ صاحب نے بتایا ہے کہ اس ماہ کے شروع میں تمہارے والد اور چچا لاہور خریداری کے لیے آئے تو تمہاری خبر گیری کے لیے ہوسٹل بھی گئے- وہاں انہیں تمہارے غائب ہونے کی خبر ملی- وہ تقریباً ڈیڑھ ہفتہ تک لاہور میں بیٹھے تمہیں ڈھونڈتے رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے کالج اسٹاف اور پرنسپل کو خاصا زچ کیے رکھا- اس کے بعد تمہارے چچا نے ہوسٹل سے تمہارا سامان اٹھایا اور وہ لوگ شاید واپس اپنے علاقے چلے گئے- ان کی اس کارروائی کے نتیجے میں کالج والوں نے تمہیں Detain کر دیا ہے اور اب کالج اور ہاسٹل سے تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا-''

میرے نئے خوابوں' خوش فہمیوں اور تصوراتی محلوں کی عمارت آن واحد میں دھڑام سے نیچے جا گری- مجھ پر ایک سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی- کیونکہ گزشتہ کئی باتوں کی طرح یہ بات بھی میری سوچ کے قطعی برعکس تھی- میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کم از کم ان دو مہینوں میں ابا اور چچا جو پچھلے چار سالوں میں کبھی صرف ملاقات کرنے کے لیے لاہور نہیں آئے تھے (ابا کی آمد صرف مجھے چھوڑنے اور لے جانے تک محدود رہی تھی-) اچانک مجھ سے ملنے کے لیے وہاں آ جائیں گے- میرا دل گھٹنے لگا- میں جہاں موجود تھی' وہاں بھی بے یار و مددگار' تن تنہا تھی- صرف یہ ہی نہیں' یہاں پر جگہ جگہ میری شناخت کے طلب گار موجود تھے اور میرے پاس اپنی شناخت کا کوئی سامان نہیں تھا-

اور پیچھے ابا اور چچا انور کی ایک آمد نے تمام امکانات ختم کر دیے تھے- میری آنکھوں کے سامنے وہ ممکنہ نقشہ پھرنے لگا' جب ان دونوں نے مجھے وہاں نہ پایا ہوگا' جب کالج انتظامیہ نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا ہوگا- اس کے بعد ابا کی کیا حالت ہوئی ہوگی- چچا انور اگر ابا کے ساتھ آنے والے چچا ہی تھے تو انہوں نے کیا کیا اور کیسے کیسے نہ جلتی پر تیل ڈالا ہوگا- میرے لیے یہ سوچنا ممکن نہیں تھا کہ ابا وہاں سے درست حالت میں واپس گئے ہوں گے-

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یوں غائب ہوجانے کا مفہوم پاکستان کے مہذب معاشرے میں کس رنگ میں لیا جاتا ہے- کجا اس غیر ترقی یافتہ' پس ماندہ' جہالت میں ڈوبے ہوئے علاقے میں' جہاں لڑکی کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنے والی آنکھیں بے شمار ہوتی ہیں- جہاں میرے علاقے سے باہر جانے اور تعلیم حاصل کرنے کے عمل کو بھی ایک طرح سے ''انتہائی غلط حرکت'' گردانا جاتا رہا تھا- جہاں میرے باپ نے صدیوں سے رائج رسم کو ایک انتہائی بڑی بغاوت کرتے ہوئے توڑا تھا اور اپنی اس حرکت کا کفارہ ان کو نہ چاہتے ہوئے بھی میری اعجاز کے ساتھ شادی طے کرنے کی شکل میں ادا کرنا پڑا تھا- وہاں میرے یوں غائب ہوجانے کی خبر چھپا کر رکھی بھی جاتی تو کتنی دیر تک- اکیلے ابا ہوتے تو بھی کوئی بات تھی' ساتھ میں وہ چچا- اس سے آگے میں جو بھی سوچتی کم تھا-

وہ نیازی پٹھانوں کا علاقہ تھا- جو بظاہر بڑے حلیم' سادہ اور درویش صفت رکھتے ہیں مگر ان کے غیظ وغضب کا سامنا کرنے سے پہاڑ بھی گھبراتے ہیں میری کیا بساط ہوسکتی تھی- جو بھی ہوا تھا' جو بھی ہوا ہوگا یہ طے تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی واپسی کے سارے راستے مسدود کر بیٹھی تھی اور صورت حال ایسی تھی کہ میرے پاس اپنے حالات پر رونے کا بھی ٹائم نہیں بچا تھا-

اب یہاں ثمن دیدی میری باقاعدہ پیٹرن بن گئیں- میرے زارزار رونے سے وہ بے حد متاثر تھیں- میری اندرونی ذہنی کیفیت کو وہ سمجھ رہی تھیں- پہلے پہل تو انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ مجھے واپس چلے جانا چاہیے-

''ماں باپ' اولاد کی غلطیوں کو معاف کر ہی دیتے ہیں- تم کون سا کسی کے عشق میں گرفتار ہوکر آشنا کے ساتھ فرار ہوئی تھیں- ہاں ان کی اجازت کے بغیر یہاں آنا غلط تھا- تم ان کے پاؤں پڑ کر ان سے معافی مانگ لینا-''

جس بات کو وہ آسان سمجھ رہی تھیں' وہ ان کے تصور سے بھی باہر ناممکن تھی- میں اپنے علاقے کی روایت سے بہت اچھی طرح واقف تھی' وہاں کہیں غائب ہوجانے کا ایک ہی مطلب تھا- آشنا کے ساتھ فرار- کون سا فن کون سی مہارت کون سا شوق یہ باتیں ان کی سمجھ سے بالا تھیں اور آشنا کے ساتھ فرار کی سزا موت سے کم نہ تھی- گو مجھ سے ماں باپ کی حکم عدولی' ان سے بغاوت اور ان کو دھوکا دینے کا جو فعل سرزد ہوا تھا اس کی سزا میں مجھے موت قبول ہونا چاہیے تھی مگر اس سے بڑا مسئلہ واپس جا کر اپنے باپ کے جھکے سر اور ماں کے بہتے آنسو دیکھنے کا تھا- مجھے پتا تھا وہ مجھے موت سے نہیں نواز سکتے تھے مگر مجھ سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھ سکتے تھے-

''پھر ایسا کرو' واپس جا کر کہیں نوکری کرلو- کسی طرح زندگی بنانے کی کوشش کرنا-'' دوسرا مشورہ یہ تھا-

''کہاں زندگی بنانے کی کوشش کروں؟'' میں نے ان سے الٹا سوال کیا- ''کس کے سہارے پاکستان میں زندگی بنانے کے لیے سہاروں' واسطوں اور سفارشوں کی ضرورت ہوتی ہے- وہاں

کے معاشرے میں مجھ جیسی لڑکی کو گنجائش پیدا کرنے کے لیے جو لوازمات درکار ہوں گے- وہ کہاں سے آئیں گے؟''

''پھر آخر کیا کیا جائے تمہارے لیے؟'' پھر انہوں نے مجھ سے ہی سوال کیا- جواب میں میرے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا-

''اچھا پھر ایک کام کر کے دیکھتے ہیں-'' پھر اچانک انہوں نے کہا- ''کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں یہاں asylum (پناہ) مل جائے- تمہارے لیے کیس بنا کر درخواست دیتے ہیں- شاید قسمت تمہارا ساتھ دے جائے- یہاں تو تمہیں بیک ورڈ پاکستانی معاشرے کی طرح قدم قدم پر رکاوٹوں اور پچھتاووں سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا نا-''

''یہاں رہنے کے لیے! میں یہاں رہوں؟'' میں نے حیرت سے کانپتی آواز کے ساتھ کہا-

''ہاں تو اور کیا- اس میں کیا حرج ہے' اور پھر اس کے علاوہ تمہارے لیے کوئی دوسرا امکان کہاں سے پیدا ہو-''

میری قسمت کہ مجھے ثمن دیدی جیسی میزبان مل گئی تھی- جنہوں نے اس قیامت خیز وقت میں میرے لیے بھاگ دوڑ کی- مجھے معلوم نہیں تھا کہ پاکستان ایمبیسی کہاں ہے' مجھے نہیں معلوم تھا کہ پناہ کی درخواست کہاں اور کیسے دی جاتی ہے- میرے درخواست پر میری صورت حال کے بارے میں نہ جانے کون سی داستان گھڑی گئی- غالباً میرے حالات' میرے علاقے کی پس ماندگی کے حوالے سے خدشات وغیرہ تحریر کیے گئے تھے- یہ وہ دور تھا جب برٹش نیشنلٹی کا حصول اتنا مشکل نہیں تھا جتنا کہ آج کل ہے- خصوصاً کسی قسم کی پناہ کی درخواست دی جاتی تو جلد مل جاتی تھی-

میں ذہنی غیر حاضری کے ساتھ ثمن دیدی کے ساتھ ساتھ پاؤں گھسیٹتی پھری- نہ جانے اس عرصے میں کیا کیا ہوا' مگر اس ساری دوڑ دھوپ اور سرگرمی کا نتیجہ یہ نکلا مجھے پناہ مل گئی- اب میں یہاں آزادی کے ساتھ رہ سکتی تھی- یہ غالباً اس سال کا ایشین کمیونٹی کے لیے اہم واقعہ تھا مگر اس سارے کا ایک اہم اور افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اس سلسلے کی زیادہ تر دوڑ دھوپ پاکستانیوں کے بجائے ثمن دیدی کی اپیل پر سامنے آئے انڈینز نے کی تھی- بعض اوقات تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں پاکستانی نہیں' انڈین ہوں-

یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے سوچنے کا وقت ہی نہ ملا کہ میں کہاں تھی اور اب کہاں ہوں- میں نے اپنے ساتھ کیا کیا ہے- ایک ایسا کام' بلکہ ایک ایسا بلنڈر جس نے مجھے اپنوں کے ساتھ ساتھ اپنی مٹی سے بھی اکھاڑ باہر پھینکا تھا-

کبھی کبھار جو سوچنے بیٹھتی تو خیال گزرتا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا- کبھی لگتا کہ شاہ صاحب ہمارے گھر آئے ہی اس لیے تھے کہ یہ سب میری زندگی میں ہونا تھا- کبھی ذہن میں آتا کہ شاہ

صاحب جو میرے ٹیلنٹ اور ہنر کو چمکانا اور اس کی روشنی سے جگ بھر کو منور کرنا چاہتے تھے‘ ان کے خواب کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی کس نے سوچا تھا- پھر خود اپنے حال کو دیکھتی- میں نے کیا کیا تھا- میرے من میں کیا آئی تھی جو ایک پرسکون زندگی کو چھوڑ کر میں نے اپنے لیے پرخار راستے کا انتخاب کرلیا تھا-

میں نے بھروسے کے سارے تعلق اور رشتے کس کی خاطر چھوڑے تھے- اگر زندگی میں کوئی مقصد ہوتا‘ کوئی ایسی چمکتی چیز سامنے نظر آتی جس کو پکڑنے کے لیے پچھلے سارے رنگوں سے پیچھا چھڑانا منطقی بھی نظر آتا- کبھی تانیہ سے دوستی کے واقعے پر لعنت بھیجنے کو دل چاہتا- وہی مجھے رقص اور فن کی دنیا میں لانے کا محرک بنی تھی- نہ میں مہاراج کے ہاں جاتی‘ نہ میرا ذہن اس طرف مائل ہوتا‘ نہ میرے عہد ٹوٹتے‘ نہ میں ابا اور اماں سے بغاوت کرنے کا سوچتی-

اعجاز سے شادی کے مسئلے پر شاید میرا ردعمل مختلف ہوتا- اگر میرے کان اور میرا ذہن تانیہ کے لیکچرز سے پٹا ہوا نہ ہوتا-

لیکن پھر جب ساری بات کو جانچ لیتی تو خیال گزرتا کہ یہ سب میرا اپنا ہی تو کیا دھرا تھا- میں اپنی حیثیت اور اپنے معیار سے اچھی بھلی آگاہ ہوتے ہوئے تانیہ سے دوستی کرنے بیٹھی ہی کیوں تھی- میری بربادی کی داستان کا آغاز تب ہی سے تو ہوا تھا جب میں نے اس کے ساتھ مشاعروں‘ ادبی محفلوں‘ لائبریریوں اور بک اسٹالوں پر جانا شروع کیا تھا- نہ میری یہ جھجک ٹوٹتی‘ نہ میں اپنے قائم کردہ دائرے سے باہر نکلتی- میرا ذوق وشوق اور خواہشات اس وقت ہی سے تو بڑھنے لگی تھیں-

’’پتا مارنا سیکھو‘ بیٹی! لڑکیوں کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ پتا مارنا سیکھ لیں-‘‘ کہیں سے اماں کی آواز آئی-

وہ ساری عمر ایک بات سکھاتی رہیں اور میں نے ان سے یہ ہی ایک بات نہ سیکھی- رات کی تنہائیوں میں اماں اور ابا کی شکلیں نظر آتیں- کہیں دور سے اماں کے بین سنائی دیتے جو وہ میری جواں مرگ پر کر رہی ہوتیں- کبھی دکھتا کہ کوئی ابا کو چارپائی پر ڈالے کاندھوں پر اٹھائے لیے جا رہا ہے- چچا انور‘ چچی رشیدہ اور اعجاز کی تمسخر اڑاتی شکلیں اور نظریں نظر آتیں چک کے لوگوں کی چوپالوں میں بیٹھنے والی گفتگو کانوں میں پڑتی- طرح طرح کی باتیں ابا کے بارے میں‘ میرے بارے میں‘ میرے غائب ہوجانے کے بارے میں-

میں دن رات خوف کے حصار میں ڈولتی پھرتی‘ مگر وہاں کون تھا جو میرا غم خوار بنتا‘ میرے ساتھ ہمدردی کرتا‘ مجھے تسلی دیتا- یہ تو ترقی یافتہ معاشرے کے مشینی ذہن کے لوگ تھے- پریکٹیکل مائنڈڈ اور اسٹریٹ فارورڈ- انہوں نے میری صورت حال پر میرے لیے جو کیا وہ بھی بہت تھا- اب کون اپنے اپنے کام چھوڑ کر میرے ساتھ ہمدردی کرتا اور تسلیاں دیتا-

میں اپنے غموں‘ دکھوں اور زندگی کے نوحوں میں مشغول تھی- جب ایک روز ثمن دیدی نے مجھے اس حالت زار سے باہر لا کر پھینکا-

’’جو ہوگیا عائشہ! وہ ایک لکھی پڑھی حقیقت ہے- اب حقیقت سے فرار تو ممکن نہیں- اب اس کو سمجھنا اور مقابلہ کرنا چاہیے- اس کو تسلیم کرلینے میں ہی تمہاری بہتری ہے‘ فی الحال تم کچھ کام کرو- ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد تم اس قابل ہوجاؤ کہ واپس جا کر اپنے گھر والوں اور صورت حال کا مقابلہ کرسکو-‘‘

میں نے ان کی کہی ایک ایک بات کو پہلی مرتبہ دھیان سے سنا-

’’پھر آپ کے خیال میں مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟‘‘ میں نے فوری طور پر اپنے ذہن کو اس نکتے پر فوکس کیا کہ مجھے حقیقت کا سامنا کرکے اسے قبول کرلینا چاہیے-

’’تم اب باہر نکلو‘ دیکھو یہاں تمہارے لیے کیا مواقع ہیں- میرے ساتھ جو لوگ ہیں‘ میں ان سے بات کرتی ہوں- میرا خیال ہے کہ اب تمہیں مشق اور ریاضت شروع کردینا چاہیے- یہاں اکثر چھوٹے موٹے فنکشن ہوتے رہتے ہیں- ان میں پرفارم کرکے تم روزگار کا مسئلہ حل کرسکتی ہو پھر تمہیں اپنے علیحدہ ٹھکانے کی بھی ضرورت ہوگی- اس کو تلاش کرو- یہاں پڑھی لکھی لڑکیوں کو اچھی جابز مل جاتی ہیں- تم بھی کوشش کرو‘ شاید تمہاری قسمت تمہارا ساتھ دے جائے-‘‘

میں نے ذرا توقف کے بعد اپنے سینے میں دبا سانس چھوڑا- یہ تو تھا- میں کب تک ان کے پاس یوں بوجھ بنی رہ سکتی تھی- ان کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا- اکثر کوئی نہ کوئی مہمان ان کے پاس ٹھہرا رہتا تھا- اس معاشرے میں زیادہ دیر مہمان نوازیاں نہیں چلتی تھیں- لمبے عرصے کے مہمان کو اپنا بریڈ اینڈ بٹر خود کمانا پڑتا تھا-

میں نے آنکھیں میچ کر دھیان کیا اور خود کو پورا یقین دلایا کہ اب زندگی کی ترجیحات قطعی بدل گئی ہیں- اب سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہونے والا تھا میں اپنے کیے کے ہاتھوں ایک ایسے بحر بیکراں میں جا گری تھی‘ جہاں اپنے بچاؤ کے لیے مجھے خود ہاتھ پاؤں مارنا تھے- اب میں نے جانا تھا کہ کالج اور گھر کی چار دیواری سے باہر پہلی بار زندگی میرے ساتھ ہاتھ ملانے آنے والی ہے- اور بعد کے حالات نے مجھ پر یہ بھی آشکار کیا کہ اس زندگی نے جو مجھ سے ہاتھ ملانے آئی ہے باکسنگ کے گلوز پہن رکھے ہیں اور میں نہیں جانتی تھی کہ میرا جبڑا کس قدر کمزور تھا-

سو میں نے جب اچھی طرح خود کو باور کرالیا کہ اب مجھے اٹھ کر فوری طور پر اپنے لیے مواقع اور امکانات کو تلاش کرنا ہے تو میں تم اپنی ’’کمائی‘‘ چند بچے کچھے پاؤنڈز بیگ میں ڈال کر بیگ کندھے پر لٹکایا اور اگلی صبح جب ثمن دیدی کام پر جاچکی تھیں فلیٹ سے باہر نکل آئی-

میں نے ایک روز یوں ہی گھومتے گھماتے ایسٹ اینڈ پر پیٹی کوٹ لین میں ایک سستا ہندوستانی

طعام خانہ دیکھا تھا- راستہ پوچھتے پچھاتے میں بالآخر وہاں پہنچ گئی- ریستوران کی مالکہ ایک بوڑھی ہندو عورت تھی- میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا مجھے وہاں کوئی کام مل سکتا ہے؟ اس نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے مجھ سے میرا بائیوڈیٹا دریافت کیا- اپنی تعلیمی استعداد بتانے کا کوئی فائدہ نہ تھا' کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہ تھا-

اس بوڑھی عورت نے میری شخصیت کا اچھی طرح 'پوسٹ مارٹم' کیا- میں یہاں کیوں آئی تھی- کیا خاوند سے ناچاقی یا طلاق ہوگئی تھی- یہاں کہاں رہ رہی تھی-

"ہندوستانی یا پاکستانی؟" اس نے آخر میں پوچھا-

"کچھ بھی سمجھ لو-" میں نے سکون سے کہا-

مجھے معلوم تھا کہ صرف رقص کی دنیا میرے لیے روزگار مہیا نہیں کرسکتی تھی- ایک آدھ کانسرٹ' وہ بھی مہینوں میں اور پھر جو وہاں پرنت نئے فنکار اتنے برسوں سے اپنا امیج بنانے میں مصروف تھے' ان کے سامنے میری کیا دال گلنی تھی- جبکہ میرا تو کوئی متعارف کرانے والا بھی نہیں تھا-

میں نے ایک پورے دن اور پوری رات کی کوشش سے خود کو ڈاؤن ٹو ارتھ کیا تھا- میرے لیے عافیت اسی میں تھی کہ فی الحال کسی ایسی چھوٹی موٹی جگہ پر کام کرکے خود کو حالات اور فضا سے مانوس کروں اور پھر اس کے بعد اگلا قدم اٹھاؤں- یہاں حیرت انگیز طور پر میرے اعصاب تیزی سے کام کرنے لگے تھے-

وہ ذہانت اور موقع فہمی جس کو بھانپ کر شاہ صاحب نے پیشن گوئی کی تھی کہ "یہ لڑکی بہت آگے جائے گی" یکایک جاگ اٹھی تھی- اسی لیے میرا دھیان فوری طور پر اس دیکھی ہوئی جگہ کی طرف گیا تھا-

اس لمبے چوڑے پوسٹ مارٹم کے بعد بہرحال اس نے مجھے چند پاؤنڈز رہائش اور طعام کے ساتھ نوکری دے دی- میرا کام گاہکوں کے آگے ٹریز رکھنا اور اٹھانا تھا- یہ معاملہ طے کرنے کے بعد میں شمن دیدی کے پاس واپس آئی اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی- انہوں نے دبی آواز میں مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا انتظام کیا تھا- میں نے ان کو بتایا کہ جو بھی تھا ٹھیک تھا-

اس طرح میں اپنی مہنگی شاپنگ سے بھرے بیگ اٹھائے ایسٹ اینڈ کے اس ہندوستانی طعام خانے میں پہنچی جو سرد تھا اور نیم تاریک بھی-

میری آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا- اگر میں شمن دیدی سے کہتی تو شاید وہ مجھے کسی بہتر جگہ پر بھی ایڈجسٹ کرواسکتی تھیں' مگر نہ جانے کیوں ان کی اس دن کی گفتگو کے بعد مجھے سب سے بہتر بات یہی محسوس ہوئی کہ میں اپنا راستہ خود تلاش کروں- دوسرے جو غلطی میں نے کی تھی' اس کے خمیازے کے طور پر میں نے خود کو اذیت دینے کا فیصلہ کرلیا تھا-

مجھے اس ہندوستانی طعام خانے میں کام کرتے ڈیڑھ ماہ ہوچلا تھا اور اس عرصے میں' میں نے

زندگی کو بہت قریب سے دیکھنا شروع کردیا تھا- اس ریستوران میں' میں ویٹرس تھی- درجنوں لوگ ایک دن میں یہاں آتے تھے- یہ زیادہ تر ایسٹ اینڈ کے باسی ہوتے تھے- یہ وہ لوگ تھے جو اس دیارِ غیر میں' اس مہنگے ترین ملک میں بھی ڈیلی وجیز پر کام کرتے تھے- عسرت کے مارے ہوئے لوگ خواہ ہندو تھے یا مسلم' ان کی ثقافت اور زبان تقریباً ایک سی تھی- وہ دال بھات' سبزی کھچوری کھاتے' چائے کے ایک کپ پر اپنے تجربات اور مصروفیات کا تذکرہ کرتے اور پھر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے- جو زیادہ تر وائٹ چیپل اور اسٹیپنی گرین کے وہ مکانات ہوتے جو بمباری سے تباہ ہوچکے تھے-

یہاں پر آنے والا ایک مستقل کسٹمر شیام رائے تھا' جو ایک ناکام کیمرہ مین تھا- کسی ہندوستانی فلم کی لندن میں ہونے والی شوٹنگ کے یونٹ کے ساتھ یہاں آیا تھا- اور یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا- یہاں اسے کہیں بھی قسمت نے یاور نہیں ہونے دیا تھا- اب یہ پکاڈلی کی ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا ٹورسٹس کی تصویریں بناتا تھا اور اسٹیپنی گرین کے ایک تباہ حال مکان کے کمرے میں رہتا تھا-

وہ کبھی کبھی مجھ سے اپنے فن' اور اس کی ناقدری کے متعلق باتیں کرتا اور پھر کہتا- "لندن کے متعلق بڑی بڑی باتیں کرنے والے' کبھی' میرا مکان آکر دیکھیں تو پتا چلے کہ لندن محض ٹیمز (Thames) کا غذی کنارا ہی نہیں-"

اور یہ حقیقت بھی تھی- جس کو میں نے ڈیڑھ ماہ میں دیکھا تھا- ان مفلوک الحال لوگوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ میں تو خود سے بھی گئے گزروں میں آکر پھنس گئی تھی- چند پونڈز جو مجھے سریکھا رائے دیتی تھی' میری گزراوقات کے لیے بہت کم تھے- اوپر سے اس کے ریستوران کا کھانا کوئی بہت اچھا نہیں ہوتا تھا- مجھے سرسوں کے تیل میں پکے کھانے کھا کھا کر کھانے سے ہی رغبت ختم ہوتی جارہی تھی-

اور جب میں اپنا بیگ اٹھائے ضرورت کی چند چیزیں خریدنے کے لیے پہلی بار پیٹ کوٹ لین کے ہاٹ پہنچی تو میں نے سوچا کہ کیا میرے اردگرد کے لوگ سوچ سکتے ہیں کہ محض ڈیڑھ ماہ قبل ان کے قریب کھڑی لڑکی البرٹ ہال میں ہزاروں تماشائیوں کی موجودگی میں "ہیر رانجھا" پیش کرتے ہوئے ہیر کا کردار ادا کرتی تھی' اور جب اس نے "سکل بن پھول رہی سرسوں" پرفارم کیا تھا تو لوگوں کا تالیاں پیٹ پیٹ کر برا حال ہوگیا تھا- مگر وہاں میری شکل اگر کسی کو مانوس لگی بھی ہوگی تو کوئی سوچ نہ سکتا ہوگا کہ پیٹی کوٹ لین کے اس ہاٹ سے خریداری کرنے والی یہ لڑکی خوابوں کی سرزمین" سے یوں نیچے دھکا دے کر گرائی گئی ہے-

جب چند انتہائی ضرورت کی چیزیں خریدنے کے بعد میری رقم ختم ہوگئی تو میرا دل اپنا سر پیٹ

لینے کو چاہنے لگا- مجھے عمر بھر تنگدستی کا تجربہ نہیں ہوا تھا- میں نے اپنے مزاج کے خلاف لوگوں کے سامنے مسکرا مسکرا کر پلیٹیں لگائی اور اٹھائی تھیں' اس وقت میرا دل ان پلیٹوں کو گاہکوں کے سر میں دے مارنے کو چاہنے لگتا تھا-

یہ سب میں صرف اس لیے برداشت کر رہی تھی کہ میرا مزاج کسی کا دست نگر ہونے کا بھی متحمل نہیں تھا- ورنہ کئی بار میرا دل چاہا کہ میں واپس ثمن دیدی کے پاس چلی جاؤں اور ان کے کسی واقف کار کے ذریعے کسی بہتر جگہ کام کرنے لگوں' مگر ثمن دیدی نے جو مجھے حقیقت کا مقابلہ کرنے اور اسے تسلیم کر لینے کا سبق دیا تھا' اس کے پس منظر میں بوریا بستر گول کرو کا کاشن میں نے بنا ان کے کہے ہی سمجھ لیا تھا اور ان کا رویہ تھا بھی درست- ایک سراسر ''گڈ فار نتھنگ'' قسم کی مہمان کو اپنے ہاں بے مقصد ٹھہرانے کا ان کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا- مشق اور ریاض ان کے ہاں اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ مجھے علم تھا کہ وہ اپنے ہوتے ہوئے مجھے کسی بہتر موقع سے متعارف کبھی نہیں کرائیں گی- میرے سلسلے میں جو کچھ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر انہوں نے کیا تھا' میرے خیال میں وہی ان کا بہت بڑا احسان تھا-

خیر' اس روز جب میں پیسے ختم ہو جانے اور پھر اپنی حالت زار پر خاصی رنجیدہ تھی ان دنوں میں جب اس نیم تاریک ریستوران کے نیم تاریک کمرے میں مختصر سے بستر پر لیٹے لیٹے تمام رات مجھے اماں' ابا اور دوسرے لوگوں کے بھوت آ آ کر خوب ہی ستاتے تھے- میں اس مختصر سے عرصہ میں ہی حد سے زیادہ شکست خوردہ ہو چکی تھی- میں نے خریداری سے فارغ ہو کر نزدیکی پب میں بیٹھ کر ایک کپ کافی پینے کا ارادہ کیا-

اس روز اس پب میں شیام رائے مجھے اتفاق سے مل گیا- وہ کونے کی ایک ٹیبل پر بیٹھا کسی ڈرنک کے نشے میں جھوم رہا تھا مگر اس نشے کے باوجود اس نے مجھے پہچان کر اپنی میز کی ایک کرسی پیش کی اور میرے لیے کافی کا آرڈر دیا' پھر وہ مجھ سے حسب عادت اپنی زندگی کی تلخیوں کا ذکر کرنے لگا- اس کمزور دن میں' میں نے بھی اپنا حال اس سے کہہ سنایا دراصل حالات نے مجھے اپنی گردش میں لپیٹ کر ایسی جگہ جا پٹخا تھا کہ میرا دل کسی کی ہمدردی چاہنے لگا تھا-

شیام رائے نے میری بات غور سے سنی اور میرے لیے بڑے دل سے اظہار افسوس کیا پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ اپنے کسی واقف کار کے پاس لے جانے کی پیشکش کی- جو کلاسیکل رقص کا ماہر تھا اور اس کے ایسے لوگوں سے تعلقات تھے جو یہاں چھوٹے موٹے فنکشن کراتے تھے-

''اس طرح تم کچھ بہتر لیونگ کما سکتی ہو-'' اس نے کہا- میں اپنی حالت زار سے اتنی تنگ تھی کہ اسی وقت اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا-

شیام رائے مجھے انڈر ٹیوب ٹرین پر بیٹھا کر لندن کے وسط میں لے آیا- جہاں سے ہم چیلسی کی

طرف روانہ ہوئے- چیلسی ہارٹ آف آرٹ اینڈ کلچر تھا' اور یہاں بڑے بڑے فنکاروں' موسیقاروں اور مصوروں کے فلیٹس تھے- شیام رائے کے دوست فخر الرحمان کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا- ان دنوں میں بنگالیوں کے پاکستانیوں کے بارے میں تعصّبات ہلکے پڑ رہے تھے- چنانچہ فخر الرحمان نے بھی میری حالت زار غور سے سن کر ہمدردی کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے ضرور کچھ کریں گے-

''محنت کرو' ریاضت کرو اگر چھوڑ دو گی تو اس میدان میں دو کوڑی کی بھی نہیں رہو گی-'' اس نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا-

میں وہاں سے بڑی پر امید واپس آئی تھی-

اس رات ریستوران کے معمول کے کام سے فارغ ہو کر میں نے چھوٹے ٹیپ ریکارڈر پر ایک کلاسیکل موسیقی کا کیسٹ لگایا اور دنوں بعد مشق شروع کی- اور تھوڑی دیر بعد ہی مجھ پر وجد کی وہ کیفیت طاری ہوئی جو مجھے کھینچ کر یہاں لے آئی تھی-

اگلی صبح مسز سریکھا نے میرے رات کے عمل پر ناک بھوں چڑھائی- اس کا کہنا تھا کہ ''دن بھر ایک سے ایک چپڑ قنات گاہک سے نبٹ نبٹ کر رات ہی تو سکون اور سونے کے لیے ملتی ہے' اس پر بھی تم نے اپنے بھاں بھاں کرتے گانے لگا دیے-'' میرا دل مٹھی میں آ گیا-

''محنت اور ریاضت نہیں کروں گی تو دو کوڑی کی نہیں رہوں گی-'' میں نے دل میں سوچا- اور میرا دل فوری طور پر اس نیم تاریک سیلن زدہ ماحول سے دور بھاگ جانے کو چاہنے لگا- مگر اس وقت یہ میری مجبوری تھی- میں کہیں اور جا بھی نہیں سکتی تھی اس رات میں نے تنہائی میں بیٹھ کر آنکھیں میچ کر تصور کیا- میرے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں-

''جانا ہے ہم کو دور' ندیا دھیرے بہونا-''

یہ وہ گیت تھا جس پر ایک بار مہاراج کے ساتھ فلیٹیز ہوٹل میں پرفارم کیا تھا اور داد و تحسین سمیٹی تھی- میں اس رات گھنٹوں خاموش آوازوں پر کان لگائے ان کی لے کے ساتھ رقصاں رہی اور پھر یہ میرا معمول بن گیا- کوئی سننے والا شاید میری اس بات پر یقین نہ کرے مگر ایسا بالکل ہوا تھا اور میں جانتی تھی کہ میرے قدم ایک غائبانہ آواز پر اٹھتے ہیں-

تقریباً دو ماہ کے بعد شیام رائے نے مجھے آ کر بتایا کہ فخر الرحمان نے مجھے بلایا- میں اس کے ساتھ دوبارہ فخر الرحمان کے فلیٹ پہنچی اور وہاں سے مجھے ایک ایسے شو میں پرفارم کرنے کی دعوت مل جسے انڈین سوسائٹی آرگنائز کر رہی تھی-

''آپ کو چاہیے کہ نذر الاسلام کی کسی نظم پر مشق کریں-''

فخر الرحمان نے ایک بنگلہ گیت کا ٹیپ آن کر کے مجھ سے کہا- اب یہ زبان میرے پلے سرے

ے ہی نہیں پڑی تھی مگر میں نے گیت کی لے کو دس مرتبہ سنا' الفاظ کا مفہوم فخر الرحمان سے پوچھا اور
پٹہ کمر کے گرد باندھ کر گھنگھرو پہن کھڑی ہوئی۔
''جھن جھن جھن۔'' میں نے ایک توڑا اٹھایا ''جھ جھنا جھن جھن۔'' دوسرا قدم گھوما۔
''واہ واہ بھئی' واہ واہ۔'' شیام رائے نے جو خود فن رقص کو بخوبی سمجھتا تھا' بے اختیار بولا۔ فخر
رحمان نے بنگلہ میں کچھ کہا۔ میرے پلے اس کے لفظ نہیں پڑے' میں حسب عادت ایک عالم بے
ود میں گھومتی' بازو پھیلاتی' پاؤں اٹھاتی رہی۔
یہ میری زندگی کا ایک ایسا وقت تھا جب میں دو بالکل اجنبیوں کے عین سامنے رقص کرتے ہوئے
حض اس لیے نہ جھجکی تھی کہ میرے لاشعور میں جاگزین رزق وروٹی کا مسئلہ مجھے مسلسل ایسا کرنے
پر اکسا رہا تھا۔ دس روز کی مسلسل محنت جو میں فخر الرحمان کے فلیٹ پر جا کر کرتی رہی' نے مجھے گیت
کے ساتھ طاق کر دیا۔ ان دس دن کی مسز سریکھا نے میری تنخواہ کٹوتی کر کے ادا کی۔
اس فنکشن میں ایک سے ایک بھارتی فن رقص کا ماہر فنکار شرکت کر رہا تھا۔ میں ان کے فن کے
مظاہرے دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں ڈولتی رہی۔
''میری کیا بساط ہوگی۔'' میں نے اپنی باری آنے سے پہلے بار بار سوچا۔
پھر خدا خدا کر کے میری باری آئی اور میں نے اس اجنبی زبان کے اجنبی گیت کی لے پر بازو
پھیلائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پرفارم کرتے ہوئے میرا دل ڈول رہا تھا مگر میں نے خود کو اسی رزق
روٹی کا دلاسا دیتے ہوئے بہلایا اور رقص میں دل لگائے رکھا
رقص کے اختتام پر تالیوں کی گونج سے میں نے اندازہ بھی نہیں کیا کہ میری پرفارمنس کیسی رہی تھی
اور گرین روم میں گھس گئی۔
البتہ بعد میں شیام رائے نے میرے لیے اکیلے میں خوب تالیاں بجائیں۔ اس فنکشن کا معاوضہ
باقیوں کا تو معلوم نہیں' مجھے کتنا عرصہ نہیں ملا۔
''فنکشن کے پیسے جمع ہوئیں گے تو معاوضہ کا ریشو نکالیں گے نا۔'' فخر الرحمان مجھے دلاسا دیتے
ہوئے کہتا رہا مگر اسی معاوضے کے لالچ میں' میں نے اس کے کہنے پر کئی اور چھوٹے چھوٹے ایونٹس
میں شرکت کی' جس کے معاوضے بھی وہ دینے کے وعدوں پر ہی مجھے ٹرخاتا رہا۔
ادھر روز روز کے ناغوں سے تنگ آ کر ایک روز مجھے اس انڈین ریستوران سے بھی چھٹی مل گئی۔
میں اپنی روز افزوں زبوں حالی پر بے چین ہو کر غور کرتی اسی پب میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ جب
شیام رائے نے مجھے وہاں دیکھا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ وہ میرے دکھ اور ذہنی کیفیت سے
واقف تھا۔
''غم بھول جاؤ عائشہ بی بی! لو یہ لو۔'' اس نے اپنی بند مٹھی میرے آگے کی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے اس کی کھلی ہتھیلی پر چمکتی چیز دیکھ کر کہا۔
''تمہیں سکون چاہیے۔ تمہیں اس سے کیا غرض کہ یہ کیا ہے۔ پی لو اور غم بھول جاؤ۔''
''مگر ہے کیا یہ؟'' میں نے اچنبے سے کہا اور ساتھ ہی اس کی ہتھیلی سے وہ چیز اٹھا کر پکڑ لی۔
''پی جاؤ' سکون مل جائے گا۔ شاباش۔ سکون چاہیے نا۔''
''ہاں۔'' میں نے سر ہلایا۔
''تو پھر پی جاؤ۔'' میں نے تمام عقل رکھتے ہوئے بھی بلا سوچے سمجھے اس سے وہ سوغات لی اور منہ میں رکھ لی۔ چند لمحوں میں' میں کسی اور دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں نہ کوئی غم تھا' نہ دکھ۔ سب اچھا تھا' خوبصورت اور خوش گوار۔ یوں زندگی میں پہلی بار میرا اس چیز سے تعارف ہوا جسے تب کا زمانہ ایل ایس ڈی کے نام سے یاد کرتا تھا۔

میرے ذہن میں اس بات کا وہم بھی نہیں رہا کہ گناہ گار بخشے جائیں گے' گناہ سے گریز کا سبق جو ہمارے ماں' باپ بچپن سے لاشعور میں ڈال دیتے ہیں اس کا تصور میرے ذہن میں بھی پوری طرح موجود تھا' مگر میرے اپنے خوابوں نے مجھے اس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا کہ اس روز شیام رائے سے جو سکون آفرین ایل ایس ڈی لے کر منہ میں ڈالی تو اس کے بعد پھر دل بار بار اسی خوبصورت اور پرسکون' رنگا رنگ منظر دکھاتی دنیا میں جانے کو چاہنے لگا' اس چیز نے مجھے زندگی کے ایک نئے موڑ سے ایک نئے راستے سے آشنا کیا۔ غم سے بے نیازی کا راستہ' دکھ' فکر اور معاشی تنگی سے آزاد دنیا کا راستہ میں ایک بار کے بعد اس کی عادی ہونے لگی' بار بار کی طلب نے مجھ سے وہ کام کروائے جن کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے وہ نیم تاریک ہندوستانی ریستوران چھوڑا تو ایک اور اس سے بھی گئے گزرے طعام خانے میں فرش مانجھنے کا کام شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ ایک بوڑھی عورت مسز براؤن کی آیا گیری کی جو معذور تھی اور جس کے تمام ذاتی امور مجھے ادا کرنے ہوتے تھے۔

میرے خیال میں یہ بڑی محنت تھی' مگر اس محنت کا عوضانہ میں نے اپنی رفتہ رفتہ عود کر آنے والی لاپرواطبیعت اور پرسکون دنیا کی تلاش میں اڑانا شروع کر رکھا تھا۔ میرا ٹھکانا کبھی اس گندے طعام خانے کی میزوں کے نیچے کا فرش ہوتا تو کبھی مسز براؤن کا چھوٹا اسٹور۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں چاہتی تو بہتر ملازمت کے حصول اور بہتر ٹھکانے کی تلاش کی جا سکتی تھی۔ مگر شیام رائے کے دکھائے راستے نے مجھے تلاش کی امنگ سے بے نیاز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ ناکامیاں تھیں جو میں نے پے در پے اپنے فن کی نمود کے سلسلے میں دیکھی تھیں۔

میں کبھی کبھار ہوش میں آ کر خود کو دیکھتی تو سوچتی کہ وہ میں تھی جو محض سات آٹھ ماہ پہلے اسی شہر رنگ و بو میں البرٹ ہال کے اسٹیج پر اسپاٹ لائٹ کے سائے تلے چمکتی دمکتی اپنے فن کا مظاہرہ

کررہی تھی اورلوگ انگشت بدنداں رہ گئے تھے- تعریفوں کے پل باندھے گئے تھے- کہاں گئے وہ لوگ جو مجھے برسوں سے فن رقص پر اجارہ داری قائم کیے ہوئے ناموں کے لیے خطرہ گردان رہے تھے- کہاں گئیں وہ شخصیتیں جو میرے لیے سرخ قالین بچھا رہی تھیں- ان میں سے کئی جب مجھے کبھی کسی راستے یا عمارت میں نظر آئیں تو میں نے ان کی نگاہوں میں خود کے لیے کبھی کوئی شناسائی کا تاثر نہیں دیکھا- جو پہچان لیتے وہ یوں نظریں چراتے جیسے کوئی آوارہ کتا نظر آ گیا ہو اور تو اور ایک بار لیسٹرا سکوائر پر شمن دیدی سے مڈبھیڑ ہوگئی' انہوں نے مجھے دیکھا اور نظریں چرالیں- میری فرعون بے ساماں جیسی شخصیت کو یہ رویہ بہت گراں گزرا مگر مجبوری اور مصلحت کے تحت دل کڑکڑا کے ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی-

''کیا حال ہے شمن دیدی؟''

جواب بہت مختصر اور روکھا ملا مگر میں ڈھیٹوں کی طرح مسکرائی-

''شمن دیدی! آپ آج کل کیا کر رہی ہیں-''

''جو بھی کر رہی ہوں کسی سے مطلب مگر آوارہ جھوٹے اور منافق لوگوں کو لیگل قرار دینے کا سلسلہ اب میں موقوف کر چکی ہوں-''

الفاظ کی برچھیاں میرے اندر تک اتریں مگر میں نے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے مزید ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا-

''مگر مجھے تو آپ کی مدد کی ضرورت ہے شمن دیدی-''

''عائشہ نیازی!'' اب کے مزید رکھائی کا مظاہرہ ہوا جو مخاطب کرنے کے انداز ہی سے عیاں تھا- ''اپنا حلیہ دیکھو-''

میں نے خود پر ایک نگاہ طائرانہ ڈالی- پیٹی کوٹ لین کے ہاٹ سے خریدی سیکنڈ ہینڈ اسکرٹ اور مسلا ہوا میلا بلاؤز' میری کارن لی اسٹریٹ سے کی ہوئی شاپنگ پر مسز سریکھا نے قبضہ کر لیا تھا- میلے بال اور بدبودار منہ-

''تم جس راستے پر چل نکلی' وہاں سے منزل تمہیں بہت جلد اور آپوں آپ مل جائے گی تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہی اور پھر ایسی ہی مدد درکار ہے تو اپنے پاکستانی کمیونٹی کے بڑوں سے رابطہ کرو' ہم ایسے فارغ نہیں کہ راندہ درگاہ لوگوں کو راستے دکھاتے اور مدد کرتے پھریں- یہاں تم جیسی درجنوں پھر رہی ہیں- ہم نے تم پر خاص احسان کیا- تمہیں گھر پر رکھا' تمہارے پیپرز بنوائے' کیا نہیں کیا- اگر تمہیں عزت دار زندگی کی خواہش ہوتی تو اس وقت مجھ سے کہتیں اب اپنی ہمت آزمانے نکل چکی ہو تو لگی رہو' کسی شیر علی اور فخر الرحمان کے بعد کہیں کوئی انسان تمہیں مل ہی جائے گا- مگر اس طرح فقیرانہ صدائیں لگانے سے تمہارا کچھ نہیں بنے گا' آئندہ مجھ پر کرم کرنا' مجھے یوں

سرِ راہ مخاطب نہیں کرنا-''

میری ایفل ٹاور جیسی بلند انا پر یہ گفتگو قہر بن کر گری اور میں اپنی ڈھٹائی پر خود کو لعن طعن کرتی الٹے قدموں مڑ گئی-

''ہاں' مجھ ایسی بے حس' خود مختار دھوکے باز بیٹی کے منہ پر زندگی اور لوگوں کو ایسے ہی طمانچے مارنے چاہئیں-''

میں نے بہت دیر بعد ذرا ذہن سنبھلنے پر خود کو پرسیکیوٹ کرنے کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے سوچا اور پھر اپنے چہرے پر پڑنے والے ایسے طمانچوں کو ریسیو کرنے کا فیصلہ کیا-

ایک روز شیام رائے نے مجھے غم روزگار سے نجات حاصل کرنے کے لیے سسٹر تھم اسٹریٹ میں واقع مسٹر پیٹر لیک مین کے مساج ہوم کو جوائن کرنے کا مشورہ دیا- اتنا وقت اس شہر سرد میں رہنے کے باعث مجھے مساج ہوم کے مفہوم سے تھوڑی بہت آشنائی تو تھی ہی مگر ایل ایس ڈی نوش جاں کر رکھنے کے باوجود مجھے اتنا معلوم تھا کہ بحیثیت ایک مسلمان لڑکی کے مجھے ایسی جگہ پر کام نہیں کرنا' سو پینی پینی کی محتاج ہونے کے باوجود شان بے نیازی سے انکار کر دیا-

مگر ایسی شام میری تقدیر نے مجھے بجو کی سی منحوس آنکھ سے دیکھا- میں پکاڈلی کی رونقیں دیکھنے تنہا بیٹھی تھی اور میرے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا- وہ ویک اینڈ تھا اور رات بھیگ رہی تھی- جب میرے عقب سے کسی نے مجھے آواز دی-

''آئی ول پے یوا سٹے ودی بے بی-''

میں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا-

"Ah! This Beutiful World"

نشے میں بدمست وہ شخص مجھے پکاڈلی میں پھرنے والی اسٹریٹ واکرز میں سے ایک سمجھا تھا- اس سے پیشتر کہ میں غصے میں آ کر کافی کا کپ پٹختی اور اسے ایک طمانچہ رسید کرتی وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھسیٹتا ہوا دور اندھیرے میں لے گیا' اندھیرا جو گناہوں کو جنم دیتا ہے-

آپ نے پڑھا مجتبیٰ حسین صاحب! آپ بھی پڑھ کر ایک سیکنڈ کے لیے ضرور سوچیں گے کہ جنوبی پنجاب کے ایک پس ماندہ چک کے خوشحال اور نیک طینت زمیندار سکندر نیازی کی بیٹی جس کا مستقبل روشن قرار دیا جاتا تھا' بلند خوابوں کو تعبیر دینے کے چکر میں کہاں سے کہاں پہنچی' کیا سے کیا ہو گئی- میں اپنے باپ کے گھر میں تھی اور وہ زندگی جو میرے باپ نے میرے لیے منتخب کی تھی اس میں میں ایک چھوٹی سی سلطنت کے تخت و تاج کی مالک ہوتی- لیکن میری اپنی منتخب کی ہوئی زندگی.... تخت و تاج اور تاخت و تاراج میں صرف ایک لفظ ہی کا تو فرق ہے- میری سیہ نصیبی نے میری تنگدستی غربت اور غریب الوطنی نے مجھے اسٹریٹ واکرز کی صف میں کھڑا کر دیا تھا-

شیام رائے کی لگائی نشے کی لت بڑھتی چلی جا رہی تھی' ایل ایس ڈی' کوکین اور اس کے بعد شراب میں نے گناہ و ثواب کے سارے چکروں کو بھلا دیا تھا- میری ناتجربہ کاری' غیر مستقل مزاجی کسی مخلص دوست اور راہنما کی عدم موجودگی اور حالات کی سختی نہ سہہ سکنے کی عادت نے مجھے بہت جلد اس کی باقاعدہ شہری بنا دیا-

پکاڈلی میں رونما ہونے والے اس واقعہ نے میرے دل پر جو اثر کیا اس کا بیان مشکل ہے-

مجھے دن رات اماں ابا کے چہرے نظر آتے تھے- شاہ صاحب کی تسبیح پھیرتی انگلیاں ابا کے ماتھے کی محراب' اماں کی مناجات کی آوازیں- مجھے اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی اور بارہا میرا دل خودکشی کر لینے کی طرف مائل ہوا- مگر بزدل انسان موت کے خوف سے بہادر انسان کی نسبت زیادہ مغلوب ہوتا ہے' مجھ ایسی بزدل اور کمزور لڑکی کے لیے خودکشی کا تصور اور اس کے منظرنامے کو کھینچنا تو آسان تھا مگر ایسا کر لینا مشکل بلکہ ناممکن تھا- میرے اردگرد ہر شخص اپنی ذات اور زندگی میں اپنی روزی روٹی کے چکر میں مشغول تھا- مجھ اجنبی نامانوس لڑکی کی پروا ایسے میں کس کو ہوتی- حالات کے دھارے اور تھپیڑے مجھے بےعیار و مددگار شخص کی طرح اپنی لہروں پر کبھی ادھر' کبھی ادھر پٹخ رہے تھے-

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب میں نے حالات سے تنگ آ کر اس معروف پب میں قدم رکھا اور سرخ شراب کا پہلا جام حلق سے اتارا- آج میں نے یاد کیا ہے تو خیال آیا ہے کہ اکثر انسان عیش و طرب کا راستہ اس وقت اختیار کرتے ہیں جب وہ خود کو بھول جانا چاہتے ہیں' لیکن میں نے لندن کے اس پب میں اس خیال سے پہلا قدم اس وقت رکھا جب مجھ پر اپنا آپ ظاہر ہونے لگا-

ان ہی دنوں میں نے شیام رائے کے بتائے مساج ہوم پر مسٹر پیٹر لیک مین سے رابطہ کیا- اس نے مجھے بخوشی جاب دے دی- اس مساج ہوم میں حسین و تیز طرار شوخ و شنگ لڑکیاں جن میں سے اکثر چینی یا تھائی نژاد تھیں کام کرتی تھیں- یہ کام میرے مزاج کے عین خلاف تھا- میرے لاشعوری تعصبات ابھرا ابھر کر میرے سامنے آتے' مگر میں نے افتادِ طبع اور پرانے تصورات کے ہیولوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود کو مکمل طور پر نشوں میں گم کر لیا- پھر ایک روز اسی گردش دوراں میں مجھ سے منظور سلطان چاٹگام والا آ ٹکرایا میں اسی پب میں بیٹھی تھی اور میں نے ایل ایس ڈی نوش جاں کر رکھی تھی- ایک شخص پینٹ کوٹ میں ملبوس میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھا-

''آپ عائشہ نیازی ہیں نا-''

''ایں'' میں نشے میں بھی چونک گئی- دنوں پیچھے خود کو یوں مخاطب ہوئے سنا تھا ورنہ تو اب میں مقامیوں کے لیے آشا' عشا یا بے بی تھی- اب تو خود کو بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میرا نام عائشہ نیازی

تھا-

''اور یجن ملتان' پاکستان-'' انکشاف کے ایک اور جھٹکے نے مجھے مکمل طور پر ہڑبڑا دیا- یہ اجنبی کون تھا جو میرے سیاق و سباق کے ساتھ مجھ سے واقف تھا-

''میں نے ایک بار آپ کو شیفلڈ میں پرفارم کرتے دیکھا تھا' پرفارمنگ آرٹ کیا ہے' یہ میں نے اس روز جانا تھا-''

''ہیں ہیں ہیں'' میں نے پوری آنکھیں کھول کر اس شخص کو دیکھا- مدت بعد کوئی ایسا ملا تھا جو مجھے اس حوالے سے بھی جانتا تھا' ورنہ تو لوگوں کو یقین دلاتے دلاتے ہی سانس پھولنے لگتا تھا کہ کبھی میں یہ تھی-

''شو کے بعد میں آپ کو تلاش کرتا رہا' مگر آپ نہیں ملیں' آج اچانک یہاں نظر آ گئیں ورنہ میرا خیال تھا کہ آپ واپس پاکستان جا چکی ہوں گی-''

ارے یہ اجنبیوں کی زمین پر وہ کون تھا جو اتنے عرصے بعد بھی میری ایک بار کی دیکھی شکل کو پہچان گیا تھا- میں نے خالی ذہن کے ساتھ سوچا-

''میرا نام منظور سلطان ہے-'' پھر اس نے اپنا تعارف کروایا- ''میں بنگلہ دیش سے آیا ہوں' چاٹگام کا رہنے والا ہوں' مصوری میرا پیشہ ہے تصویریں بناتا اور بیچتا ہوں- یہ ہی میرا ذریعہ معاش ہے' فن اور آرٹ کا دلدادہ ہوں' آپ سنائیں آپ آج کل کیا کر رہی ہیں؟''

یہ وہ دور تھا جب بنگالیوں پر بنگلہ زبان حاوی ہونے لگی تھی- لیکن اس شخص کی اردو کی شین قاف باقی بنگالیوں سے خاصی بہتر غالباً اس لیے تھی کہ وہ ڈھاکہ فال سے پہلے کافی دیر کراچی میں رہا تھا- اس اجنبی سرزمین پر اتنا وقت گزار لینے کے بعد اگر جگہ جگہ کا پانی پی لینے کے اثر کی وجہ سے میرا ذہن اب نفع نقصان کے کھاتے کیلکولیٹ کرنے لگا تھا- دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہ شخص کام کا ہو سکتا تھا-

میں نے دماغ پر چھائے نشے کو جھٹکا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی- میں نے خود پر گفتگو کا وہ طوق چڑھایا' جو میں نے اتنے عرصے میں اپنے ہاتھوں سے سیا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے ہی میں میری حاضر دماغی اور خوش گفتاری سے متاثر نظر آ رہا تھا-

وہ عرصہ دراز سے یہاں مقیم تھا اور یہاں کے چپے چپے' شخص شخص سے واقف تھا' شاید وہ مجھے کوئی ایسا موقع فراہم کروا سکے' جس کے ذریعے میں اپنے فن کی دنیا میں واپس چلی جاؤں' مجھے پیٹر لیک مین کے مساج ہوم سے نجات مل جائے- جہاں انسانی درندوں کی میزبانی کرتے مجھے اپنا آپ بھی جانور محسوس ہونے لگا تھا-

میں نے ایک دم اس کی انگلی پکڑ کر فن رقص کی دنیا کی تصوراتی سیر کرنا شروع کر دی-

ریڈ کارپٹس، روشنیاں، تالیاں، اخبارات کی شہ سرخیاں اور میں، مجھے یقین ہونے لگا کہ مجھ گناہ گار کو ایک ذلیل زندگی سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا فرشتہ بھیجا تھا جس نے مجھے ایک بار خوبصورت چمکتے دمکتے لباس، زیورات، میک اپ زدہ چہرے میں دیکھنے اور اب اس زبوں حالی میں دیکھنے کے باوجود پہچان لیا تھا- یقیناً اس شخص کے ذریعے میں کسی نہ کسی کنارے پر پہنچ جاؤں گی- میرے نیک ماں باپ کی دعائیں اب بھی میرے ساتھ تھیں، میں نے سرخوشی کے عالم میں اس شخص کو دیکھا جو میرے لیے میرے پسندیدہ مشروب کا آرڈر دے رہا تھا-

☆☆

منظور چاٹگام والا جس کو اس کے حلقہ احباب منجور سلطان کہتے تھے آہستہ آہستہ واقعی میرا نجات دہندہ ثابت ہونے پر تل گیا- یہ وہ دن تھے جب میں اپنی دن بدن بڑھتی ضروریات سے مجبور ہو کر سنجیدگی کے ساتھ پکاڈلی میں سرِشام سج سنور کر بیٹھنے کا سوچ رہی تھی- جب اخلاقیات کی حدود خواہ اپنی منشاء کے بغیر ہی سہی ایک بار عبور کر لیں تو پھر جیسے بار بار کا تصور گناہ معدوم ہونے لگا- مجھے زندگی کو مین ٹین کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت تھی اور پیسہ ناک کی سیدھ چلنے پر، ہاتھ نہیں آ رہا تھا- منظور سلطان نے ایسے میں مجھے ایک نئی راہ سجھائی-

''جب میں نے تم کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا عائشہ نیازی! تو میں نے سوچا کہ ایک زرخیز ثقافت کی عکاس اس شبیہہ کو کینوس پر ضرور اتارنا چاہیے تاکہ وہ لوگ جو حسن کے اس شاہکار کو دیکھنے کی سعادت سے محروم رہ گئے تھے وہ بھی دیکھ سکیں- میں نے اب انڈیا کے ایک ایکسپورٹر کو گھیرا ہے- وہ اس پورٹریٹ کو اسپانسر کرنے پر تیار ہے عائشہ تمہاری چاندی ہو سکتی ہے-''

لو جی زندگی کی ایک نئی جہت کا آغاز ہوا- بیش قیمت پوشاک اور زیورات ایکسپورٹر صاحب نے منگوائے، معروف ماہر حسن نے میک اپ کیا اور ہفتوں کی سٹنگز کے بعد منظور سلطان کے ماہر ہاتھوں نے ایک شبیہہ کینوس پر اتاری- کتھک کا ایک تمثیلی توڑا پیش کرتی ڈانسنگ فیری- سنا ہے یہ پورٹریٹ اب بھی ان ایکسپورٹر صاحب جو آج کل انڈیا کی نمبرون مارکیٹنگ بلز میں شمار ہوتے ہیں ممبئی میں واقع کاسل کے مہمان خانے کی نشست گاہ کی دیوار پر آویزاں ہے- اس پورٹریٹ کا ایک ریپلیکا منظور سلطان نے نیشنل جیوگرافک والوں کو بھجوایا کہ وہ ایسے نادر روزگار شاہکاروں کو اپنے ٹائٹل پیج پر رونق افروز ہونے کی سعادت بخشتے ہیں، مگر بار بار کی انکوائری کے باوجود وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا- نہ ہی وہ ریپلیکا آج تک شائع ہوا خیر اس شاہکار ''دی ڈانسنگ فیری'' کا جو عوضانہ منظور سلطان کو ملا وہ خاصا معقول تھا اور اس کو ہم نے آدھا آدھا تقسیم کیا- کچھ عرصہ کے لیے مالی حالت مستحکم ہونے کی امید بندھی- اب منظور سلطان نے میری زندگی کی پس پردہ جہتوں میں سے ایک اور کو ان فلوڈ کرنے کی کوشش کی-

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں عائشہ نیازی؟''

''شادی، مائے، مائے نو کوئسچن-'' میں نے سرخ وائن کے نشے میں ڈوبی آواز میں انگلیاں نچاتے ہوئے تازہ تازہ درآمد شدہ امریکن لہجے میں کہا-

میرے اس جواب سے وہ قدرے مایوس ہوا- مگر اس نے دوبارہ اس بات کا ذکر نہیں کیا- ادھر کچھ عرصے پہلے منظور سلطان کے ایک شناسا کلکتہ کے رہنے والے گویے جو کلاسیکل موسیقی میں طبع آزمائی کرتے تھے، نے ایک چھوٹی سی گیدرنگ میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا-

''آشا بی بی! کیوں نہیں آپ اپنے گلے کے سر سے شناسائی حاصل کرتیں، آپ کی آواز گفتگو میں اتنی سریلی ہے اوپر سے اردو کی شین قاف بہت عمدہ، الفاظ کا اتار چڑھاؤ زیر زبر کیا کہنے، تھوڑی محنت اور ریاضت اچھی راہنمائی کسی سُر کے مزاج سے واقف شخص کی شاگردی تم کو لتا اور آشا کے ہم پلہ بنا سکتی ہے، یہ نور جی ہاں جو ہیں ان کے ساتھ کی گائیکہ بن جاؤ گی تم-''

اتنے عرصے کی جہاں خواری نے اس وقت تک میری عقل کو ٹھکانے پر لا کر کھڑا کر رکھا تھا، اب یہ اوروں کے دکھائے سرخ قالین اور اونچی پروازیں- مجھے ایک دم کسی نئے تصوراتی محل میں نہیں لے جا سکتی تھیں-

''لیکن ماسٹر صاحب! میرا میدان تو کلاسیکل رقص ہے، گلوکاری کی تو الف بے سے میں واقف نہیں، اب اتنی عمر میں آ کر محنت اور ریاضت میرے کس کام کی-''

''نہ جی نا-'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا- ''سر کا دیوتا تو گلے میں زندہ اور موجود ہوتا ہے، اسے چھیڑنے اور جگانے کی دیر ہے بس ایک بار چھڑ گیا تو پھر چھڑ گیا بس-''

مگر میں تجربوں کے ان گنت مگرمچھوں کی شکار ہو چکی تھی مزید کسی نئے تجربے میں پڑنے کا خطرہ مول لینا میرے بس کا روگ نہیں تھا- میں نے اس وقت تک پیٹر لیک مین کے مساج ہوم اور وقتاً فوقتاً منظور سلطان کی ماڈل بننے پر اکتفا کیا- ان دونوں کاموں سے میں اتنے کما لیتی تھی کہ جس سے میں ایسٹ اینڈ میں موجود اپنے ایک کمرے کا کرایہ اور زندگی کی چھوٹی موٹی ضروریات پوری کر ہی لیتی تھی-

مگر ایک روز جب میں شافیسری ایونیو کے ایک کیفے کے باہر بیٹھی ایروز کے مجسمے کو افسردگی سے دیکھ رہی تھی، میرے کانوں میں ایک چہکتی آواز آئی-

''عیشاں! یہ تو اپنی عیشاں لگتی ہے-''

میرے نیچے کرسی کی ٹانگیں ڈگمگا گئیں اور سارے کا سارا منظر میری نظروں کے سامنے ایک چکر کی شکل میں گھوم گیا- میں نے اپنا منوں وزنی سر بمشکل اٹھا کر اوپر دیکھا، ایک بلاشبہ مانوس شکل غالباً سالوں پیچھے نظر آئی مجھ پر کچھ دیر قبل چڑھائی وائن کا اثر بلاشبہ تھا، مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ میں

اجنبی صورتوں کے بکھرے ہجوم میں وہ آشنا شکل نہ پہچان سکتی- میرے جسم میں چیونٹیاں سی چلنے لگیں- یہ بھی تھا کہ عرصے بعد 'عیشاں' کے نام سے پکارے جانے پر کانوں میں گھنٹیاں سی بجی تھیں اور یہ بھی تھا کہ اس وقت تک میں اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھی کہ مجھے پہچانے جانے اور مانوس آوازوں کے ساعت سے ٹکرانے کی کوئی خواہش نہ رہی تھی- میں نے ماضی کے متعلق' مانوس شکلوں' آوازوں' قصوں اور تاریخوں سے ذاتی اور خودساختہ کنارہ کشی اختیار کرلی تھی- میں اس وقت حال میں جینا چاہتی تھی اب مجھے غیر متعلق ہوکر جینے میں ہی سکون ملنے لگا تھا- اب یہ کون مانوس شخصیت تھی جس نے مجھے ماضی سے وابستہ نام سے پکارا تھا- میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا-

''میں زرینہ ہوں عیشاں!'' وہ میرے سامنے بیٹھ گئی-

زرینہ عرف جیناں اس پس ماندہ چک کی ایک باسی' میرے بچپن کی ساتھی جس نے قصبے کے اسکول سے میرے ساتھ پانچ جماعتیں پڑھی تھیں اور جس سے مجھے اس لیے ہمیشہ چڑ رہی تھی کہ وہ اور اس کی فیملی چچی رشیدہ کے کیمپ سے تعلق رکھتی تھیں- اب یہاں شافیسری ایونیو کی چمکیلی سڑکوں پر وہ بھلا کیا کررہی تھی- یہ ایک انقلابی واقعہ تھا جس کا ماضی بعید میں گمان بھی ممکن نہ تھا-

''گمان تو یہ بھی ممکن نہ تھا کہ تم یہاں موجود ہوگی-'' پھر فوراً میں نے خود کی درستگی کرتے ہوئے سوچا-

''عیشاں! تم یہاں ہو' وہاں سارے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے-'' اس نے میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر میز کی چمکیلی سطح پر دھرا میرا بازو ہلا کر کہا ایک دم دل چاہا مکر جاؤں' انجان بن جاؤں' پہچاننے سے انکار کردوں- مگر پھر دل ایک دم پیچھے کا احوال جاننے کے لیے بے چین ہوگیا- تجسس' تجسس- بعد میں' میں نے خود کو ملامت کرتے ہوئے سوچا اگر انسانی زندگی میں سے اس ایک لفظ کا عنصر نکال دیا جائے تو انسانی زندگیاں سکون پذیر ہوجائیں-

''چاچا سکندر تو تمہارے نہ ملنے کے اگلے ہفتے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے' چاچی پاگل ہوگئی- گلی گلی تمہیں ڈھونڈتی پھرتی تھی خالہ رحمت نے دیوار سے ٹکر مارلی تمہارے نہ ملنے کا سن کر دماغ پر ایسی چوٹ آئی کہ دنوں میں چٹ پٹ ہوگئی' ساری زمین مکان جائیداد ڈھور ڈنگر پر چاچے انور نے قبضہ کرلیا' نہ کوئی پوچھنے والا رہا نہ منع کرنے والا- گھر کا گھر تباہ ہوگیا-''

زرینہ کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا اور میں یوں سن رہی تھی جیسے اس سارے واقعے کا مجھے پہلے سے علم تھا' صرف قصے کو الفاظ ملنے والی بات تھی' میرا ذہن ماؤف تھا مگر ایک بات میرے دماغ میں بار بار آرہی تھی-

''عائشہ نیازی اور زرینہ دونوں کا اس شہر جدید میں موجود ہونا ایک اچنبھے کی بات ہے- مگر مجھ سے زیادہ زرینہ کا یہاں پہنچنا باعث حیرت ہے- اس کے خاوند کے رشتہ دار یہاں رہتے تھے-

شادی کے بعد انہوں نے دونوں کو یہاں بلالیا اور اب زرینہ اور اس کا میاں گلاسکو میں اپنی گروسری شاپ چلارہے تھے- ساتھ ساتھ اس کا میاں مسلم کمیونٹی کو حلال گوشت سپلائی کرتا تھا- کتنا طویل فاصلہ تھا ملتان کے اس نواحی پسماندہ چک اور اس شہر سرد کے درمیان مگر میرے اور زرینہ کے اس فاصلے کو طے کرنے کی تاریخ کتنی جدا جدا ہے-

وہ باعزت اور لیگل طریقے سے یہاں پہنچی یوں کہ آگے استقبال کرنے والے بہتیرے اور پیچھے دعا کے ساتھ خدا حافظ کہنے والے بہت سے ہیں اور میں- پھر مجھے خیال آیا ''یوں کہ فصلی بٹیروں نے استقبال کیا اور گناہ کے اندھیروں میں دھکیل دیا اور پیچھے-'' چھن سے میرے اندر کچھ ٹوٹا میرے پیچھے کیا تھا دعائیں' بین' سسکیاں اور سنگ' باپ کی قبر اور فاترالعقل ماں' اجاڑ گھر اور سنسان گلیاں-'' اب میرے ادراک میں وہ ردعمل اترا جو زرینہ کی سنائی خبروں پر ہونا چاہیے تھا-

میں نے دیکھا زرینہ اللہ حافظ کہہ کر اپنے خاوند کے ساتھ چلتی کہیں دور جارہی تھی اور میں تنہا بیٹھی سوچ رہی تھی کہ میرے ہاتھوں کیا ہوچکا تھا-

''ابا کا قتل' خالہ رحمت کا قتل اور اماں اب تک تو وہ بھی یقیناً-'' میرے دل نے دھاڑیں مارنا شروع کیں اور خاموش آنسو میری آنکھوں سے پھسلنے لگے- وہ ہائیڈ پارک نہیں تھا جہاں میں بیٹھی تھی' یہاں میں اپنے جذبات کا آزادانہ اظہار کرتی تو مہذب انگریز مجھے یقیناً کسی Asylum (پناہ گاہ) میں چھوڑ آتے مگر وہاں سے واپس اپنے کمرے تک آتے آتے میرا حوصلہ دم توڑ چکا تھا- میں نے اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر چیخ چیخ کر رونا شروع کیا- مجھے اپنے ہاتھ خون سے لتھڑے ہوئے محسوس ہورہے تھے اور اپنے کپڑوں پر سرخ چھینٹے نظر آرہے تھے- بچپن سے لے کر اس وقت تک کا ایک ایک لمحہ یاد آرہا تھا جب میں نے ان لوگوں کو اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا تھا-

میرا باپ نیک' ایماندار' راست باز' شریف اور میری ماں خاموش' سادہ اور گرم جوش محبت کرنے والی عورت- آخر انہوں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کی سزا انہیں میری صورت میں ملی تھی' وہ جو میری پیدائش پر شکرگزار تھے اکلوتی اولاد پر قانع تھے- میرے ایک ایک قدم پر بسم اللہ اور ایک ایک کامیابی پر الحمدللہ کہنے والے تھے' کیا کبھی ان کے ذہن میں واہمہ بھی آیا ہوگا کہ ان کی اکلوتی اولاد کی تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی' میرے حلق سے چیخیں بے اختیار نکل رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو پھسلتے جارہے تھے- میرے حلق میں انی کی طرح زرینہ کی آنکھوں اور لہجے میں اپنے لیے نفرت اور حقارت اڑی ہوئی تھی- اس نے ٹھیک مجھے اس لعن طعن سے نوازا تھا' جس کی میں مستحق تھی' پھر اس کے وہ الفاظ-

''وہ جائیداد جو تمہارا باپ بچاتا پھرتا تھا' اب ان لوگوں کے قبضے میں ہے جن کی وجہ سے تم نے

اپنے ماں، باپ کی زندگیاں تباہ کر دیں، اعجاز کی شادی اب بھی ایک پڑھی لکھی لڑکی سے ہو چکی ہے اور اس نے گھر بار، چک کا مدرسہ اور زمینوں کا حساب کتاب سنبھال رکھا ہے، اعجاز کی شکل وصورت پہچانی نہیں جاتی، کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ یہ وہی ان پڑھ، جاہل، آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ کیا یہ کارنامہ تم انجام نہیں دے سکتی تھیں، تم تو خود کو بڑی چیز سمجھتی تھیں۔''

اب میں اس کو کیا سمجھاتی کہ اس بڑی چیز سمجھنے کے زعم نے ہی تو مجھے گناہ کی ایک ایسی دلدل میں دھکیلا تھا، جس سے نکلنے کی صورت باقی نہیں تھی۔

''اور اب تو نکلوں بھی تو کس کے لیے جانا ہے تو کدھر جانا ہے۔'' میں نے دو دن خود اذیتی میں گزارنے کے بعد سوچا اور پھر اپنی زندگی سے اپنی ذات سے اپنے ماں، باپ اور خالہ رحمت کے قتل کا بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں خود سے انتقام لینا چاہتی تھی۔

مگر اس شام منظور سلطان نے میرے دو دن غائب رہنے اور آنکھیں ناک سوجے ہوئے ہونے کی وجہ پوچھی تو میں چپ رہی۔ پھر وہ زمانے کی سرد مہری پر بحث کرنے لگا اس کا خیال تھا کہ میں اور وہ ایسے فنکار تھے جو زمانے اور لوگوں کی ناقدری کا شکار تھے۔ ایک سے ایک عطائی فنکار شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا جا رہا ہے اور ہم ہیں کہ پئی پئی کو ترستے ہیں۔ البرٹ ہال میں ناہید صدیقی کا کنسرٹ ہوا اور اس کی اکیڈمی کی لڑکیاں بھی تھیں۔ سب میڈیا کر اور ایویں سی اور ہم ہیں کہ نالی کے کیڑوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔

''یہ سچ ہے کہ دنیا ہمیشہ ان ہی لوگوں کو ان مواقع سے محروم رکھتی ہے، جو سب سے زیادہ اہل اور مستحق ہوتے ہیں۔'' میں نے آنکھوں میں آنے والی نامعلوم سی نمی کو پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ ایک تاریخی جملہ تھا۔

''کیوں نہ ہم دنیا سے مواقع چھین لیں۔'' منظور سلطان نے یکدم اونچی آواز میں کہا۔

''بلکہ ہم اپنے لیے مواقع خود کری ایٹ کریں گے، ہم اپنا اسٹوڈیو بنائیں گے، اپنا مساج ہوم، اپنی آرٹ اکیڈمی، عائشہ نیازی ہم دونوں ہی حالات کے مارے ہوئے اور لوگوں کے دھتکارے ہوئے ہیں کیوں نہ ہم اپنے زور بازو پر اس اسٹیج تک پہنچ جائیں جہاں ہم لوگوں کو دھتکار سکیں۔ میں اسٹوڈیو میں کام کروں گا، تم لوگوں کو کلاسیکل رقص سکھانا، پیسہ ہاتھ آیا تو اپنا مساج ہوم کھول لیں گے، اپنی ایسکورٹ سروس شروع کریں گے۔''

میرے ذہن میں ساری گفتگو میں سے صرف ایک ہی جملہ بیٹھا ''تم لوگوں کو کلاسیکل رقص سکھانا'' کلاسیکل رقص کے ہی جنون نے تو میرے ماں باپ کو مار دیا میں اب اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ''میرے ماں باپ اور ان جیسے قدامت پسند لوگ، اس کو برا کام جانتے تھے۔'' نجانے کیوں یہ الفاظ میرے منہ سے پھسل گئے۔

''ارے عائشہ نیازی!'' منظور سلطان ہنسا۔ ''ایک بوڑھی دنیا اور بوسیدہ معاشرے کے تخلیق کردہ امیج تمہارے ذہن میں ایک دم اتنے پختہ ہو گئے کہ تم ان کا اظہار کرنے لگیں۔''

''لیکن یہ تو درست ہے نا منظور سلطان کہ ہمارے معاشرے میں اور ہمارے مذہب میں ان چیزوں کی ممانعت ہے۔'' میں اپنے تازہ ترین فیصلے کے تحت گفتگو فرما رہی تھی۔

''ممانعت ہے'' وہ دل کھول کر ہنسا ''یہ تصورات اتنے قدیم ہیں کہ ان پر بحث کرنا بھی لاحاصل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ اسلام میں تو عورتوں کی حیثیت بہت ادنیٰ ہے، مسلمان عورت کا درجہ کمتر ہے، ہمارے مولاناؤں اور مڈل ایسٹ سے آئی خبروں سے تقویت لیے ہوئے تصورات۔ ان لوگوں نے ہی رقص کو گناہ قرار دے رکھا ہے انہوں نے ہی ایک زمانے میں غریب اینگلو انڈین طبقے کو محض اس لیے اچھوت قرار دے رکھا تھا کہ ان کی لڑکیاں کیبرے ناچتی تھیں۔ بھلا ان سے کوئی پوچھتا کیا دوسرے فرقوں میں پیشہ ور عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔''

اس نے طویل گفتگو میں قدرے توقف کیا۔ ''بس قصہ کوتاہ یہ ہے عائشہ نیازی کہ ملاؤں کی بات پر مت جاؤ، وہ تو ایکسپلائیٹیشن اور دوسروں کو غلط قرار دینے کے فن کے ماہر ہوتے ہیں۔''

''مگر یہ حقیقت ہے کہ میرا باپ میرے اسی غم میں مر گیا اور میری ماں نے اسی تصور سے حواس کھوئے کہ اس کی بیٹی ڈانسر بننے کی خاطر گھر سے بھاگ گئی۔''

میں نے بے اختیار اپنے متعلق ایک انکشاف کیا۔ جبکہ اس سے پہلے میں نے منظور سلطان کو اپنا فیملی بیک گراؤنڈ انتہائی کلچرڈ اور لبرل بتایا تھا۔

''تمہارا باپ تمہاری گمشدگی کے غم میں مرا۔'' اس نے تصحیح کی۔ یوں گویا وہ ساری تاریخ سے واقف تھا اور تمہاری ماں بھی اسی غم میں پاگل ہو گئی۔ لیکن عائشہ نیازی ایسے لوگ تو آج کل تاریخ کے لیفٹ اوورز کہلائے جانے چاہئیں۔ اب کیا اس بات کے غم میں عمر ضائع کرنے کا خیال ہے۔ بھلا اب کون سا زمانہ ہے کسی کے غم میں مرنے اور پاگل ہونے کا۔''

جتنا زیادہ میں ذہنی انتشار کا شکار تھی، ایسے میں منظور سلطان کی باتوں نے میرے ذہن پر خاطر خواہ اثر کیا اور میں نے سوچا کہ شاید وقت اور واقعات کے تسلسل کو اسی طرح چلنا تھا۔ مگر پھر اماں ابا کے انجام کا تصور کر کے آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ اب دنیا سے مجھے کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ میں بہت بری ہوں۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''عائشہ نیازی! جو کچھ تم ہو، تم ہو، تمہیں تمہارے آباؤ اجداد کی خوبیوں اور کمزوریوں ہی نے مل کر بنایا ہے۔'' منظور سلطان نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مگر اب تمہیں چاہیے کہ تنہا رہنے کے بجائے شادی کر لو۔ دیکھو میں بھی تنہا ہوں، تنہائی ہی وہ

زہر ہے جو ہماری صلاحیتوں کو چاٹ رہا ہے- ہمیں ایک دوسرے کا دلاسا' تسلی اور سہارا بن جانا چاہیے' مجھ سے شادی کروگی عائشہ نیازی؟"

شادی اور ایک مرد کا تصور تمام عمر ہی' میرے لیے کچھ اتنا باعث کشش نہیں رہا تھا- کچھ اتنا کیا کبھی بھی باعث کشش نہیں رہا تھا- مگر یہ عمر کا وہ حصہ تھا اور حالات کے بہاؤ کی وہ اسٹیج تھی جہاں مجھے واقعی کسی ساتھی کی تمنا ہونے لگی تھی- ساتھی' جو خواہ دوست کے روپ میں غمخوار ہوتا' خواہ شوہر کے روپ میں پارٹنر- میں نے اس مختصر زندگی میں اتنے جوئے کھیلے تھے کہ یکدم میرے دماغ نے سوچا کہ ایک اور جوا کھیل لینے میں کیا حرج ہے- ایک ایسا شخص جو معاشی' سود و زیاں کا حصہ دار بھی ہو اور معاشرے میں یہ کل حیثیت دلوانے میں مددگار بھی-

میرے دل سے گزری باتوں کی دھول کو منظور سلطان کی گفتگو ہی نے جھاڑا تھا- خصوصاً اس بات نے کہ مجھے میرے آباؤ اجداد کی خوبیوں اور خامیوں نے مل کر بنایا تھا- میرے شعور پر چھائی گناہ گاری کی کیفیت قدرے چھٹنے لگی تھی- اب میں نے یہ سوچ کر کہ خدائے لم یزل نے میرے گناہوں کے باوجود مجھے اپنی انتہائی کرم فرمائی کرتے ہوئے ایک موقع اور فراہم کیا ہے' خود سے انتقام لینے کے فیصلے کو ڈراپ کیا اور منظور سلطان چاٹگام والا سے شادی کر لینے کا فیصلہ کرلیا-

یہ شادی بے حد سادگی سے ہوئی- منظور سلطان کی ایک واقف کار خاتون خالدہ اختر کے فلیٹ پر دو تین احباب اور ایک مولوی صاحب آئے' ان سب کو منظور سلطان ہی لایا تھا- میرا ایسا کوئی شناسا وہاں موجود نہیں تھا جسے میں اس خاص موقع پر دعوت دیتی- اس وقت تک شیام رائے واپس بھارت جاچکا تھا- نکاح کے بعد منظور سلطان مجھے ریجنٹ اسٹریٹ کے ایک مکان کے کمرے میں لے آیا جو اس نے بتایا تھا کہ اس نے اپنا جمع جتھا لگا کر کرائے پر لیا تھا- یہ بھورا سہ منزلہ مکان مجھے بہت پسند آیا جس کی بالکنیوں.... میں لگے جرینیم کے گملے دور سے دکھائی دیتے تھے اور کچھ عرصہ قبل تک میں ان کو حسرت سے دیکھا کرتی تھی-

یہ شادی میرے لیے پہلا مثبت پوائنٹ اسی شکل میں لائی تھی- وہ جگہ جس کو میں حسرت سے دیکھا کرتی تھی اب میں وہاں کی مقیم تھی- منظور سلطان ایک اچھا شوہر ثابت ہو رہا تھا- مگر شادی کے چند دنوں بعد ہی اس نے مجھ سے ایک فرمائش کی اور وہ یہ میں عائشہ کے بجائے آشا کہلوانے لگوں-

"آشا منظور سلطان چاٹگام والا تم ساڑھی باندھا کرو' ماتھے پر چھوٹی بندیا لگالیا کرو تو بزنس کے پوائنٹ آف ویو سے بہت زبردست پلس ہو جائے گا- یہاں پر انڈین مائتھالوجی کے پرستار زیادہ ہیں' انڈین کلچر خوب زور و شور سے پنپ رہا ہے- تمہارے خالص ایشین لک اور ہندوستانی کنیا کا سا یہ روپ ہمیں ہمارے کام میں فائدہ دے گا- اس میں تمہارا کیا جائے گا- حلیے کی تھوڑی سی تبدیلی سے ایمان تو خطرے میں نہیں پڑ جاتا-"

میں کچھ بولی تو نہیں البتہ سوچا کہ کون سا ایمان باقی رہ گیا ہے' جس کے خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہے' اب تو سب جائز ہے کچھ بھی غلط نہیں ہے میں نے بھی بلاؤز اسکرٹ اتار کر ساڑھی باندھنا اور ماتھے پر تلک لگانا شروع کر دیا- بالوں کا جوڑا باندھنا چھپا اور کیسر کے پھول لپیٹنے شروع کر دیے؟- میرے اس حلیے نے اس ڈانس اکیڈمی اور مساج ہوم کی طرف انگریزوں کو بھی راغب کرنا شروع کیا جو میں نے اور منظور سلطان نے شروع کیا تھا- مساج ہوم کی آڑ میں یہ جگہ آہستہ آہستہ قحبہ خانے میں بدلنے لگی- میں دیکھ رہی تھی' محسوس کر رہی تھی مگر اس میں پیسہ آ رہا تھا' سو میں نے آنکھیں بند کرلیں- اس لیے کہ ڈانس اکیڈمی شروع ہی میں فیل ہوگئی- میرے بازو' میرے پاؤں اور میرا فن میرا ساتھ دینے سے یوں قاصر ہوا کہ جب بھی میں نے سر اور تال پر حرکت کی کوشش کی چھم سے میرے تصور میں خون کے چھینٹے اور اماں ابا کے چہرے اتر آتے اور میں ساکت ہو جاتی میری انتہائی کوشش کے باوجود میرا جسم حرکت کرنے کی سکت چھوڑ جاتا- میں پہلے اپنی اس کیفیت پر حیران ہوئی' مگر رفتہ رفتہ میرے فہم میں یہ بات اتر آئی کہ ایسا یقیناً کسی کی بددعا کے نتیجے میں ہوا تھا-

سو میں نے ڈانس اکیڈمی بند کر کے پوری توجہ مساج ہوم پر دینا شروع کر دی اور اس میں ایسے ایسے ہوشربا کارنامے سر انجام دلوائے کہ اب خود سوچنے بیٹھتی ہوں تو سوچ جواب دے جاتی ہے اور دل بیٹھ جاتا ہے- جنس کے بھوکے درندے اور خوبصورت خدوخال کی حسین پریاں ہمارے مساج ہوم کا دائرہ ان نقاط کے گرد گھومتا تھا- ادھر منظور سلطان نے اپنے اسٹوڈیو میں نیوڈ بنانے کا آغاز کیا اور بہت جلد پیسہ ہم پر مہربان ہوگیا' متمول اور قابل فخر ہونے کا جو خواب عرصہ دراز قبل میں نے دیکھا تھا' جب سے میں نے اس شہر میں مستقل قیام کا ارادہ کیا تھا' اپنے اردگرد بکھری دنیا کے قابل رشک ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر اپنی غریب الوطنی اور زبوں حالی' محنت و تنگدستی کا خیال کرتے ہوئے حسرت میرے دل میں اترتی تھی- اس کے خاتمے کا وقت اس وقت آیا تھا' اتنا عرصہ مارے مارے پھرنے اور محتاجی کی زندگی گزارنے کے بعد قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی تو کس رنگ میں- یہ سوچنے کی زحمت میں نے دانستہ طور پر کبھی نہ کی تھی-

اب لندن کے نائٹ کلب' ڈسکوز اور کیسینوز ہمارے لیے کوئی دور افتادہ جگہ نہیں رہی تھیں' وقت نے بے رحم وقت نے ہم دونوں ہی کو ان چیزوں کا عادی اور رسیا بنا دیا تھا اخلاقیات کی وہ کون سی آخری حد نہیں تھی' جس پر میں نہ گری تھی اب سوچ رہی ہوں تو لگتا ہے برائی کی آخری انتہا تک صرف میں ہی میں تھی- مجھے یاد ہے کہ میں نے اس وقت بھی ایک بار اپنے کرتوتوں اور حالات پر غور کیا تھا- مگر میرے سامنے اس غور و فکر کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ مجھے جس جس چیز کی لت پڑ چکی تھی اسے پورا کرنے کے لیے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اور پھر میں نے سوچا تھا کہ جب انسان اپنے آپ

ود یکھنے لگے تو گناہ اسے اپنے گلے کا طوق محسوس ہونے لگتے ہیں اور خواہش کے باوجود جب وہ س طوق سے چھٹکارا پانے میں ناکام ہوجاتا ہے تو پھر وہ اس گناہ کے راستے پر محض اس لیے آگے ڑھتا جاتا ہے کہ اسے پیچھے دیکھنا فضول اور بے معنی لگتا ہے۔

میں نے بھی پیچھے نہ دیکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ان دنوں اپنی خوشحالی کے باعث ہم معززین کہلائے جانے لگے تھے۔ میں نے مساج ہوم پر ایک لڑکی کو انچارج بنایا اور خود اپنی خوشحالی اور فرصت سے فائدہ اٹھانے کے لیے کلکتہ کے استاد صاحب کے مشورے پر اپنے گلے میں موجود سر کو چھیڑ کر جگانے کی غرض سے بیکر اسٹریٹ کے ایک اسکول آف میوزک میں داخلہ لے لیا۔ وہ سب چیزیں اور آسائشات جن کو میں نے اتنے سال حسرت سے دیکھا تھا اب میری دسترس میں تھیں اور مجھے زندگی جینے میں مزا آنے لگا تھا۔

لیکن ڈھائی سال کے بعد زندگی نے ایک مرتبہ پھر مجھے بجوکی سی منحوس آنکھ سے دیکھا اور مجھے وہاں لاکر کھڑا کردیا جہاں سے میں نے اس ڈھائی سالہ دور کا آغاز کیا تھا۔ ایک روز جب گئی رات منظور سلطان کسی کام سے مانچسٹر گیا ہوا تھا میں صبح اپنے معمول کے مطابق مساج ہوم گئی، میرے سامنے کا منظر نیا تھا۔ مساج ہوم کے بورڈز اور اندر کا انٹریر ختم ہوچکا تھا۔ اب وہ خالی عمارت تھی جہاں ایک شخص ڈینٹسٹ کلینک کا سامان جما رہا تھا۔ میں نے برافروختہ ہوکر اس سے اس سارے منظر کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ مساج ہوم کا سامان اور شہرت بک کر کہیں اور شفٹ ہوچکی ہے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے غصے سے کہا اور دوسری اسٹریٹ میں بنے منظور سلطان کے اسٹوڈیو کی طرف چل دی۔

اس اسٹوڈیو کا نام ''چاٹگام آرٹ اسٹوڈیو تھا۔'' اس کے ماتھے سے بھی یہ نام مٹ چکا تھا اور ایک سکھ اپنا برش سنبھالے کینوس پر رنگ بکھیرنے میں مصروف نظر آیا۔

''میں نے یہ اسٹوڈیو منظور سلطان سے خریدا ہے پچھلے ہفتے ہماری ڈیل ہوئی وہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے پاس جا رہا ہے جو قاہرہ میں رہتے ہیں، کیوں بہن جی خیر تو ہے نا؟''

سردار نے مجھے بتاتے ہوئے جب مجھے کرسی پر ڈھتے دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔ میں اپنے اسکول آف میوزک میں مصروف رہی۔ ادھر منظور سلطان اسٹوڈیو اور مساج ہوم بیچ کر ڈھائی سال کی بنائی دولت لے کر نجانے کہاں چمپت ہوچکا تھا۔ میں نے صورت حال کو جان لینے کے بعد منظور سلطان کے شناساؤں سے رابطے کرنے شروع کیے، کسی کو بھی اس کے بارے میں علم نہیں تھا۔

میرے حواس مختل ہونے لگے۔ میں کیا کروں کہاں جاؤں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں! وہ پہلے سے شادی شدہ تو تھا، اس نے تمہیں نہیں بتایا؟'' پھر خالدہ انور نے مجھے بتایا وہ

میرے حواس باختگی پر حیران تھی۔

''مگر اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا، اگر وہ شادی شدہ تھا تو پھر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟'' میں نے روہانسی ہوکر پوچھا۔

عجیب بات تھی کہ اتنے لمبے عرصے میں جگہ جگہ کا پانی پینے، تجربات کے سمندر میں تیرتے پھرنے اور پھر اب اتنی کروک قسم کی زندگی گزارنے کے باوجود منظور سلطان کے یوں غائب ہوجانے پر مجھے اپنا آپ گمشدہ بچے جیسا بے سہارا محسوس ہو رہا تھا؟

''تم سے شادی۔'' خالدہ انور نے چونک کر کہا۔ ''شادی کیسی کیا یہ محدود مدت کا ایگریمنٹ نہیں تھا۔''

''محدود مدت کا ایگریمنٹ۔'' میں نے زیر لب دہرایا اور بیوقوفوں کی سی شکل کے ساتھ اسے دیکھا۔

''تم تو ایسے بول رہی ہو جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو۔ جب یہاں میرے فلیٹ پر تمہارے نکاح کا ڈرامہ ہوا تھا، اس سے پہلے ہی منظور سلطان نے مجھے بتایا تھا کہ یہ محض ایگریمنٹ ہے جو تمہارے اور اس کے درمیان ہوا تھا، کام کرنے اور کمانے کا ایگریمنٹ، اس نے تو مجھے بتایا تھا کہ کیونکہ تم ذرا معاشرتی طور پر بزدل واقع ہوئی ہو اس لیے اس ایگریمنٹ کو ذرا لیگلی ٹکر کرنے کے لیے نکاح نکاح کھیلنے پر بضد ہو، لہٰذا ہمارا ایک ساتھی داڑی لگا کر آ گیا اور باقی گواہ بن گئے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ سب نقلی تھا اور دھوکا۔ کہاں جا کر تم لوگوں نے نکاح رجسٹر کروایا تھا کچھ یاد ہے۔''

میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے، نکاح نکاح کا کھیل، نقلی اور دھوکا جب کہ مجھے تو اس نے بتایا تھا کہ وہ اسلامک سینٹر جا کر اپنے ایک شناسا مفتی کو نکاح پڑھانے کے لیے لا رہا ہے اور پھر ایک اسٹیمپ شدہ کاغذ مجھے دکھا کر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ نکاح کو رجسٹر کروا آیا تھا۔ گو مجھ احمق الذی نے اس پر بھروسے اور اندھے اعتماد کی وجہ سے کبھی وہ کاغذ دیکھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

''بلکہ تمہارے شادی شدہ دور میں وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرے ساتھ رہنے والی عورت بخوشی لیگلی پروسٹیٹیوشن پر رضامند ہے اور تمام مسلمانوں کو راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو اسی طریقے سے عبور کرنا چاہیے۔'' خالدہ انور نے مزید انکشاف کیا۔

''قانونی عصمت فروشی۔'' وہ اس تعلق کو یہ نام دیتا رہا اور میں نے ڈھائی سال ایک باوفا عورت ثابت ہونے میں لگا دیے۔ اس کے مفادات اور ترجیحات کو فوقیت دیتے ہوئے جیسے جیسے وہ کہتا گیا میں کرتی گئی۔ اس لیے کہ مجھے معاشرے میں قانونی حیثیت سے رہنا درکار تھا۔ باعزت طریقے کے ساتھ، آپ نے دیکھا مجتبیٰ حسن صاحب کہ باعزت اور قانونی زندگی گزارنے کے لیے گناہ کے دلدل میں پاؤں ٹکانے پر میرا انجام کیا ہوا۔ میں اندر تک بہت اندر تک اس دلدل میں کھینچ

لی گئی۔ میں کیتکی کا وہ پھول تھی مجتبیٰ حسین صاحب جس نے سانپوں کو اپنی جانب کھینچا تھا اور رفتہ رفتہ زندگی کے سانپ مجھے نگل گئے تھے۔ اس ناقابل فراموش المناک واقعے پر میرا نروس بریک ڈاؤن ہوجانا لازمی امر تھا۔

میں نے مہینوں ہاسپٹل کے بیڈ پر پڑے چھتوں کو گھورتے نکال دیے۔ یکے بعد دیگرے میں زندگی کے ساتھ کھیلے سارے جوئے ہار گئی۔ گناہ کے کیچڑ سے میرے ہاتھ پاؤں منہ جسم سب لت پت تھے قحبہ خانے چلاتے شراب پیتے نشہ کرتے ڈسکوز نائٹ کلبز اور کیسینوز میں جاتے ہوئے بھی میرے ذہن کے کسی ایک گوشے میں یہ بات تسلی کی شکل میں موجود تھی کہ میں ایک مسلمان مرد کے ساتھ شرعی اور نکاحی بیوی کی حیثیت میں رہ رہی تھی۔ جب یہ انکشاف ہوا کہ شرع اور نکاح کے جھوٹے سائے تلے میں ایک ایسی بیسوا کی سی زندگی گزارتی رہی تھی جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی تو پھر میرا دل خود پر تیل چھڑک کر آگ لگا دینے کو چاہنے لگا۔ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کے بعد میرا مکمل ارادہ تھا کہ ٹیمز میں جا کر چھلانگ لگا دوں۔ مگر پہروں ٹیمز کے کنارے چکر لگانے میں گزر گئے چھلانگ لگانے کی ہمت میرے اندر کی کمزور اور بزدل عورت ایک بار بھی نہ کر سکی۔

میں عائشہ نیازی سکندر نیازی کی بیٹی قانونی عصمت فروشی کرتی رہی تھی۔ میرے جلتے ذہن نے سوچا۔ میں شراب اور نشے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ نائٹ کلبز میں نجانے کس کس کے ساتھ ناچتی رہی تھی۔ کیسینوز میں جوئے کھیلتی رہی تھی۔ میرا لباس اور میرا رہن سہن سرتاپا وہ تھا جس سے میرے خدا نے منع کیا تھا۔ میں گناہ میں اٹھتی بیٹھتی اور گناہ کی کمائی کھاتی رہی تھی اور میرا باپ سکندر نیازی پانچ وقت لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتا تھا ''حی علی الفلاح'' میں نے ٹیمز کے پانیوں کو صبح کی روشنی میں، دوپہر کی ہلکی دھوپ اور شام کے دھندلکے میں دیکھا اور اپنی زندگی کا بھرپور جائزہ لیا میرا آج میرے کیے کا اجر تھا اور میرا دل چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

فاعتبرو یا اولی الابصار، فاعتبرو یا اولی الابصار

قید تنہائی

پھر ریجنٹ اسٹریٹ کے فلیٹ پر واپس آ کر میں نے اسکاچ وہسکی کے حسبِ عادت دو جام بھرے اور پھر دونوں کو ٹکرایا۔ اس دنیا کے شاہ صاحبوں کے نام چچا انوروں کے نام، تانیہ قدوائیوں کے نام، شیر علیوں کے نام، ثمن دیدیوں کے نام، شیام راؤں کے نام، فخر رحمانوں ...کے نام، پیٹر لیک مینوں کے نام، منظور سلطانوں کے نام۔'' میں نے زندگی کے ہر موڑ کے محرکین کے نام با آواز بلند لیے اور دونوں جام چڑھا کر انہیں دیوار پر مارا اور پھر با آواز بلند مدت بعد گنگنایا۔

نہ تھی اپنے حال کی جب خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی برائیوں پر جب نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

میرے مونس شاہ صاحب اکثر کام کرتے ہوئے یہ الفاظ گنگنایا کرتے تھے اور میں کہا کرتی تھی۔ ''شاہ صاحب آپ اور برائیاں لاحول ولا قوۃ۔'' اور وہ سر ہلاتے ہوئے کہتے ''تم نہیں سمجھو گی بٹیا! تم نہیں سمجھو گی۔''

وہ اس وقت کہاں جانتے ہوں گے کہ بٹیا کو جب سمجھ آئے گی اس وقت تک دنیا کیسی اوپر کی نیچے ہو چکی ہوگی۔ مدت بعد مجھے شاہ صاحب یاد آئے۔ وہ کہاں کرتے تھے اور کیا کر رہے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا زرینہ نے بتایا تھا کہ جب میں گمشدہ ہوگئی اور ابا کا ہارٹ فیل ہوگیا تو شاہ صاحب کی آمد پر اماں نے پردے کی پروا بھی نہ کی اور ان کو گریبان سے پکڑ کر کوسنے لگیں۔ اماں کے نزدیک ان کو یہ دن شاہ صاحب کے کارن دیکھنا پڑا تھا۔ جواب میں شاہ صاحب نے کچھ بھی نہیں کہا تھا بس چپ چاپ آنسو بہاتے رہے تھے۔

''یہ بچی ذہین اور متجسس ہے، اس کے تجسس کو کسی مثبت کام میں لگاؤ، ورنہ یہ خود بھی ضائع ہوجائے گی اور مجھے ڈر ہے کہ کچھ اور بھی ضائع نہ کردے۔''

شاہ صاحب نے میری تعلیم سے متعلق ابا کو تحریک دیتے ہوئے کہا تھا کیا اس وقت وہ سوچ سکتے تھے کہ میرے تجسس کو کسی مثبت کام کی طرف لگانے سے ہی سب کچھ ضائع ہوجانے والا ہے۔

''ہم قدر شناس لوگ ہیں سکندر! ہمیں اس جوہر کی قدر کرنی چاہیے۔ اس کی تراش خراش اس کو قیمتی اور انمول بنادے گی۔''

یہ بھی شاہ صاحب نے کہا تھا۔ اس جوہر کی قدر شناسی اور تراش خراش کیا کیا تباہیاں لانے والی تھی۔ یہ وہ جانتے ہوتے تو کیا ایسا مشورہ ابا کو دیتے، پھر میں نے دھیان کرنے اس بات کا سرا پکڑنے کی کوشش کی کہ اس سارے قصے کی بنیادی وجہ کیا ہوسکتی تھی۔ کیا میرا ٹیلنٹ، میری ذہانت، میرا تجسس، میرا علم میرا گناہ تھا یا اس کو ہضم نہ کرنا میرا گناہ تھا۔

یقیناً سب واقعات کی وجہ تسمیہ میری کم ظرفی تھی۔ میری کم ظرفی ہی نے مجھ سے اس عمل کی ماں، باپ سے پوشیدگی کروائی تھی جو مجھے معلوم تھا کہ ان کو پسند نہیں آئے گا۔ میں نے رقص کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ میں کس کس سے بغاوت کر رہی ہوں اور اس ایک چھوٹے پیانے کی بغاوت نے مجھے کہاں لا کھڑا کر دیا یہ میں نہیں جانتی تھی۔

میرا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہونے والا تھا۔ بلکہ کیا ہونا چاہیے تھا۔ یہ سوچنے میں میں نے کئی دن گزار دیے۔ یہ حادثہ اب تک کے گزرے واقعات میں سے سب سے برا اور سخت تھا، مگر اتنا ضرور تھا کہ اس عرصہ میں میں نے یہاں ایسے لوگوں سے واقفیت ضرور حاصل کرلی تھی جواب میرے

معاون و مددگار ثابت ہو سکتے تھے- اب ایک روز مجھے برٹش میوزیم کے اردو سیکشن میں احتشام الدین صاحب ملے جو کبھی کبھار منظور سلطان کے اسٹوڈیو پر آیا کرتے تھے- وہ کچھ کچھ میرے حالات سے واقفیت رکھتے تھے- میں نے باقی ساری باتیں چھپا کر صرف منظور سلطان کے دھوکا دے کر بھاگ جانے کا قصہ انہیں سنایا-

''تو آپ رقص کیوں نہیں شروع کر دیتیں- آپ جیسی فرسٹ ریٹ پرفارمنگ آرٹسٹ کو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھنا چاہیے-'' انہوں نے مجھے مشورہ دیا-

''نہیں اب میرے دل میں رقص کی امنگ نہیں رہی-'' میں نے اپنے لہجے کی مضبوطی پر خود بھی حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا- ''اس فن کے شوق میں میں نے بہت دھکے کھائے ہیں مگر مواقع نہیں ملے اگر دنیا اسی بات میں خوش ہے کہ ایک فرسٹ ریٹ پرفارمنگ آرٹسٹ کی زندگی بیکار گزر جائے تو پھر یوں ہی سہی-''

''تو پھر ایسا کیجیے گلوکاری میں محنت کیجیے' ریاض کیجیے- پھر آپ کو کوئی راستہ بتاتے ہیں-'' انہوں نے کہا-

میں چاہتی تو ایک بار پھر سے اچھے سے نام اور کام کی آڑ میں قحبہ خانہ چلا سکتی تھی کیونکہ اس کام میں مجھے مہارت حاصل ہو چکی تھی- منظور سلطان ایسکورٹ سروس کے نام پر قحبہ خانے کی ایک جدید شکل کا خاکہ تیار کر چکا تھا جو میرے پاس موجود تھا- مگر اب میں نے اپنے دل سے یہ خیال نکال دیا تھا- مجھے اس سب سے گھن آنے لگی تھی- سو میں نے احتشام الدین کے مشورے پر عمل کرنے کا سوچا اور کلکتے والے استاد جی کے پاس پہنچی- وہ شاید ٹھیک کہتے تھے میرے گلے میں سر ضرور موجود تھا- انہوں نے اسے چھیڑا اور جگایا کچھ اسکول آف میوزک کی تربیت بھی کام آئی اور یوں رفتہ رفتہ میرے گلے اور سانس کا اتار چڑھاؤ ٹھیک ہونے لگا- احتشام الدین نے پہلے پہل مجھے کمیونٹی کے چھوٹی موٹی نجی فنکشنز میں متعارف کروایا اور پھر مجھے بی بی سی کی اردو سروس کے ایک پروڈیوسر سے ملوایا- یہاں میں نے انہیں گا کر سنایا اور انہوں نے مجھے بچوں کے پروگرام میں کہانی اور گانے کے لیے سلیکٹ کر لیا-

اس کے علاوہ میں نے ایک شاپنگ سینٹر میں سیل گرل کی جاب بھی کر لی اور یوں میری گزر اوقات ٹھیک ہی ہونے لگی- ریجنٹ اسٹریٹ کے اس سہ منزلہ بھورے مکان سے نکل کر میں ایک چھوٹے فلیٹ میں اٹھ آئی اور ایک قانع زندگی گزارنے لگی- یہاں مجھے یاد آیا کہ آپ کے دیرینہ رفیق عزیز احمد صاحب کو میں نے سب سے پہلے یہاں اس وقت دیکھا جب میں شیام رائے کے ساتھ فخر الدین کے پاس گئی تھی- یہ بھی فخر الدین کے پاس بیٹھے تھے اور میں نے انہیں دیکھ کر بیرونی کمرے میں ہی بیٹھنے کو ترجیح دی تھی- میں نے انہیں ایک نظر میں ہی پہچان لیا تھا اور انہیں

دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر کسی بھی شناسا شخص سے زیادہ شرم آئی تھی' زرینہ کے سامنے ایکسپوز ہونے سے بھی زیادہ' اس کے بعد ایک بار میں نے انہیں ویسٹ اینڈ کے ایک تھیٹر میں پلے دیکھتے ہوئے دیکھا تھا اور میں ڈرامہ آدھا دیکھ کر ہی واپس آ گئی تھی-

اس کے بعد باہر نکل کر نجانے کیوں میں لاشعوری طور پر ان کے نظر آنے سے خائف رہی- نجانے کیوں میرے دل میں یہ تصور جاگزیں تھا کہ یہ شخص کم از کم ایسا تھا جس کے ذہن میں میرا ایک اچھا شریفانہ تصور جاگزیں تھا- میں اس شخص کے سامنے اس امیج کو کھونا نہیں چاہتی تھی-

میری عزیز احمد سے تیسری مڈبھیڑ راؤنڈز اسکوائر میں پاکستان ہاؤس کے انفارمیشن کے شعبے میں ان دنوں ہوئی جب میں مساج ہوم چلا رہی تھی اور اب کے یہ ٹکراؤ آمنے سامنے ہوا تھا- مجھے یقین تھا کہ میرے بدلے ہوئے ہندوانہ آؤٹ لک اور نام آشا چاٹگام والا' کی وجہ سے عزیز احمد مجھے قطعی نہیں پہچانتے ہوں گے' پھر وہ مجھے اوپر تلے آکسفورڈ سرکس اور پھر لنڈن کو آپریٹو سوسائٹی میں نظر آئے مگر یقیناً انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا- ورنہ آپ کے حوالے سے میں اگر ان کے حافظے میں محفوظ تھی تو وہ مجھے پہچاننے پر ضرور مخاطب کرتے-

اب بی بی سی کی بیرونی نشریات کے دفتر میں وہ اکثر نظر آنے لگے- ان ہی کی وجہ سے میں نے اپنا حلیہ اور نام تبدیل نہیں کیا' بلکہ دانستہ طور پر اپنا انداز گفتگو بھی بدل لیا- اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ ہمارا احساس بھی ہمیں کیسے کیسے چکمے دیتا ہے- میں اپنی دانست میں اور لوگوں کے ساتھ ساتھ عزیز احمد سے بھی اپنی شناخت چھپاتی رہی- یہ جانے بغیر کہ اور لوگوں کے ساتھ ساتھ میں عزیز احمد کے سامنے بھی بری طرح ایکسپوز ہوں-

خیر! یہ تذکرہ تو یونہی درمیان میں آ گیا- پھر یوں ہوا کہ میں نے بی بی سی پر باقاعدگی سے کام کرنا شروع کر دیا- نجانے میں اچھا گاتی تھی یا برا بہرحال میرے لیے روزی کا' باعزت روزی کا کچھ سبب بنا تھا- ریجنٹ اسٹریٹ کے وکٹورین اسٹائل کا مکان چھوڑنے کا مجھ کو قلق تھا- قسمت مجھے وہاں سے اٹھا کر ایک بار پھر ایسٹ اینڈ لے آئی تھی-

میں روزانہ ٹیوب ٹرین پر بیٹھتی جو مجھے آکسفورڈ اسٹریٹ لے جا کر اگل دیتی- وہاں سے میں بی بی سی پہنچ جاتی- وہاں سے فارغ ہو کر آکسفورڈ اسٹریٹ کے اس شاپنگ سینٹر پر میری شفٹ کا آغاز ہو جاتا- شام ڈھلے ٹیوب ٹرین سے واپسی ہوتی یہ ایک خاموشی سے چلتا ہوا تسلسل تھا- جس میں مجھے سکون محسوس ہونے لگا تھا- گھر آ کر میں ریاض کرتی' کھانا بناتی' کھاتی اور سوجاتی- کسی بھی قسم کی سوشل زندگی اب میں نے تج دی تھی-

اس روٹین کے ساتھ چلتے چلتے مجھے کچھ عرصہ گزرا تھا جب میں نے ایک شخص کو ان ہی وقتوں پر اسی ٹیوب ٹرین پر ایسٹپنی گرین سے آکسفورڈ اسٹریٹ تک کا فاصلہ طے کرتے اور واپس آتے

دیکھا- پہلے پہل تو میں نے اس بات کوخصوصیت سے نوٹ نہیں کیا-مگر جب یہ معمول تسلسل سے قائم ہوا تو میں قدرے چونکی- وہ شخص کون تھا جسے ان ہی وقتوں پر وہاں ہی جانا' آنا ہوتا ہے- وہ کہاں کام کرتا تھا- یہ میں نہ جان پائی- اپنی بھرپور اصلاح کے پروگرام کو تو خیر میں ایک انچ سے آگے نہ بڑھا پائی تھی' مگر دیگر حرکات سے زیادہ میرا ازلی وابدی تجسس اپنی جگہ قائم تھا-

''کون ہوسکتا ہے' کہاں جاتا ہے' کہاں رہتا ہے؟''

قسم کے سوالات سے میں خود کو بہرحال نہ بچا سکی تھی- پھر میں نے اپنی کروک ہو چکی صفات کے بل پر نامحسوس طریقے سے اس کا جائزہ لینا شروع کیا- وہ اکثر کالے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ہوتا- اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور وہ سفر کے دوران اکثر کوئی چھوٹا سا کتابچہ نما کتاب پڑھ رہا ہوتا وہ شکل سے انگریز لگتا تھا مگر اس کی اکثر جھکی نگاہیں انگریزیت کی روح کے منافی ہوتیں-

پھر ایک شام میں نے دانستہ طور پر اس وقت کے بجائے تاخیر سے واپس جانے کا ارادہ کیا- میں پکاڈلی کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھی وہاں کی رونقیں دیکھ رہی تھی- جب میں نے اچانک اس شخص کو ہرے راما ہرے کرشنا گاتے ایک گروپ کے قریب کھڑے دیکھا- مساج ہوم کے ان گنت تجربوں نے مجھے لوگوں کے چہرے ان کے پس منظر اور مزاج پڑھنے کا فن عطا کیا تھا-مگر میں اس شخص کے بارے میں کافی کوشش کے باوجود کوئی خاص قیافہ لگانے میں ناکام رہی تھی-

وہ شخص میری نظروں کے سامنے کچھ دیر اس گروپ کو راگ الاپتے دیکھتا رہا اور پھر کہیں ہجوم میں غائب ہوگیا- میں دیر تک وہاں بیٹھی رہی-مگر میری نظریں اسے کھوجتی رہیں- اب اس عمر اور اس قدر تجربات کے باوجود یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اس کو کسی احمقانہ وجہ سے تلاش کر رہی تھی-مگر میں جانتی تھی کوئی نہ کوئی وجہ ایسی ضرور تھی جس کے لیے میں نے اس کو دیکھنا اور تلاش کرنا شروع کر دیا تھا-مگر وہ مجھے اس بھیڑ میں پھر نظر نہیں آیا-

رات گئے جب میں واپسی کی نیت سے ٹیوب پر سوار ہوئی تو بے اختیار میرے منہ سے حیرت زدہ آہ نکلی میں نے شکر ادا کیا کہ اس شخص کو اسی ٹیوب میں بیٹھے دیکھ کر میں نے با آواز بلند حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا- میں نے اس روز اسے بالارادہ غور سے دیکھا- مگر وہ سر اور نظریں جھکائے اپنا کتابچہ پڑھنے میں مصروف رہا-

اس قدر غیر معمولی واقعے کے بعد یہ روٹین پھر یوں ہی چلتی رہی- مگر ایک روز جب سردی عروج پر تھی اور ہلکی بارش جاری تھی- میں واپسی کے لیے ٹائم سے پہلے اٹھ آئی تھی اور چھاتا اوڑھے زیر زمین ٹیوب اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی- وہ اچانک کہیں سے نکلا اور میرے سامنے میرے شولڈر بیگ سے گرا چھوٹا ریزگاری والا پرس لہرایا-

''میڈم' یہ آپ کا ہے گر گیا تھا-'' اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا اور مجھے ششدر کر دیا-

''شکریہ-'' میں نے اپنی حیرت کو اپنے اندر قید کرتے ہوئے کہا-

اس روز ٹیوب میں بہت کم مسافر تھے اور وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا-

''آپ روزانہ کہاں جاتے ہیں؟'' میں اپنے اندر کے تجسس کو دبا نہ سکی اور بزبان انگریزی دریافت کرنے لگی-

''کسی جگہ پر نہیں بس وہاں ہی-'' اس نے اسی ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا-

''کیا مطلب' کیا آپ وہاں کہیں کام کرتے ہیں؟'' میں نے جواب پر حیران ہوتے ہوئے کہا-

''نہیں-'' مختصر جواب ملا-

''تو پھر کیا کرنے جاتے ہیں؟'' پھر وہی تجسس جو بڑھ بڑھ کر قد آور ہو چکا تھا-

''آپ کے لیے جاتے ہیں-'' اس نے بہت سکون کے ساتھ کہا-

''کیا مطلب' میرے لیے؟'' میرا دل سوکھے پتے کی طرح لرزا-

''جی ہاں' آپ کے لیے-''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ کو بلایا گیا ہے اور آپ کو لے جانے کی ذمہ داری مجھے دی گئی ہے-''

''مجھے بلایا گیا ہے' کیا مطلب' کہاں بلایا گیا ہے؟'' میں نے سوکھتے حلق کو تھوک نگل کر تر کرتے ہوئے پوچھا-

''وہ وہاں رہتے ہیں' بریڈ فورڈ میں' انہوں نے آپ کو بلایا ہے' بلکہ انہیں آپ کو بلانے کے لیے کہا گیا ہے' میری ڈیوٹی ہے آپ کو لے جانے کی' کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟''

میری سمجھ میں خاک نہیں آیا کہ وہ مجھے کہاں لے جانے کے لیے آیا تھا اور کیا کہہ رہا تھا-مگر وہ نہ جانے کیا تھا جو میرے اندر کھینچ لگا رہا تھا اور اکسا رہا تھا کہ آنکھ بند کر کے اس کے ساتھ چلی جاؤں-

''انہیں علم ہے کہ آپ ضرور آئیں گی' یہ اتنے دن کی روٹین آپ کو متوجہ کرنے کے لیے جاری تھی- اب جانے کا ٹائم آ گیا ہے- آپ گھر جا کر پیک کیجیے- ہم کل صبح چلیں گے-'' ایسٹ اینڈ پہنچ کراترتے ہوئے اس نے کہا اور خود پھر کہیں غائب ہوگیا-

کیا زندگی اب کسی نئے تجربے سے دو چار ہونے جا رہی ہے؟'' گھر واپس آ کر میں نے سوچا-''ہرگز نہیں!'' پھر میں نے فیصلہ کن انداز میں دل سے کہا-''کوئی نیا تجربہ نہیں' کسی نئے شخص پر بھروسا نہیں- زندگی کو چلنے دیا جائے جیسے یہ چل رہی ہے-''

اور پھر اپنے کاموں میں مشغول ہوئی- یہ اور بات کہ دل دیر تک اس بات میں اٹکا رہا اور کان

کسی کی آمد کی آواز کے منتظر- میں نے اپنی اس داستان میں نجانے کتنی بار ذکر کیا ہے-مجتبیٰ حسین صاحب! کہ تجسس انسان کی فطرت کا سب سے کمزور پہلو ہے اگر یہ نہ ہوتا تو نجانے کتنے لوگ کون کون سے حادثوں سے محفوظ رہ سکتے تھے-سو میرا متجسس ذہن اندر ہی اندر گتھیاں سلجھاتا رہا- وہ شخص کون تھا- اس کی سنائی داستان کا کیا مطلب تھا- کون مجھے بلا سکتا تھا- کیا واقعی کسی نے اس کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی-

''نہیں!'' پھر میر ذہن اس بات کی نفی کرتا- میں جانتی تھی کہ اس مصروف' لاپروا' سرد ملک میں کسی میں دلچسپی لینے کے طریقہ کار اور تھے-کوئی یوں پیچھا لے کر کسی کو اپنی جانب متوجہ نہیں کیا کرتا تھا- یہ تو یہاں کے لوگوں کے بقول پراسرار مشرق کے چونچلے تھے مگر اس شخص کے رویے اور لہجے کے اعتماد نے مجھے تصویر کا دوسرا رخ سوچنے پر بھی مجبور کیا تھا اتنا عرصہ اس ملک کے تقریباً تمام ہی گھاٹوں کا پانی پی رکھا تھا- گینگسٹرز- اور انڈر ورلڈ مافیا کے طور طریقوں سے بھی بخوبی واقف ہو چکی تھی-کون جانے منظور سلطان کے چلائے کسی اوچھے ڈبل کراس کی زد میں آ جاؤں- خود تو وہ کہیں اڑنچھو ہو چکا تھا- میرا دل مسلسل خوف' اندیشوں' تجسس اور فکر کی آندھیوں کی زد میں تھا-

وہ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب بیرونی دروازے کا ہینڈل بجنے کی ہلکی ہلکی آواز نے مجھے بے چین نیند سے جگا دیا- میں نے ہڑبڑا کر لحاف اپنے اوپر سے اتار کر پھینکا اور بھاگتے قدموں سے بیرونی دروازے تک پہنچی اور آنے والے کا نام دریافت کیا-

''دروازہ کھولیے عائشہ نیازی! چلنا ہے-'' وہی ٹھہری ہوئی دھیمی آواز آئی-

میں شش و پنج میں مبتلا دروازے کی ہیئت کو نیم روشنی میں تکتی رہی-''کھولوں نہ کھولوں-'' ذہن میں ایک جنگ چھڑ گئی-

''عائشہ نیازی! آپ کو چلنا ہے' دروازہ کھولیے-''

''ہا! آ-'' میرے حلق میں ایک سسکی نے دم توڑا- یہ کون تھا جو مجھے اس نام سے مخاطب کر رہا تھا-مگر اتنا وقت گزر جانے کے بعد اب میرے ذہن و دل میں اتنی مضبوطی تو ضرور آ چکی تھی کہ میں نے بات بے بات چونکنا چھوڑ دیا تھا- اس اجنبی سرزمین پر ایک بار میں منظور سلطان کے یوں اس طرح خود کو مخاطب کرنے پر چونکی تھی اور اس چونکنے کے سانپ نے جس بری طرح میری زندگی کو ڈسا تھا' اس کا زہر اب تک زندگی کے رگ و پے میں تیرتا پھر رہا تھا- میں نے دل کو مضبوط کیا اور اپنی آنکھوں میں آئی بے نام نمی کو خشک کیا-

''تم کون ہو؟'' میری آواز بھاری تھی اور لہجہ خوفزدہ-

''میں کوئی نہیں ہوں عائشہ نیازی! مگر انہوں نے تمہیں بلایا ہے' میں تو صرف تم کو ان تک پہنچانے کے لیے یہاں موجود ہوں- دروازہ کھولو عائشہ نیازی!'' وہ گمبھیر آواز اور ٹوٹی پھوٹی

اردو- میں یقیناً آنے والے کو اندر آنے دینا نہیں چاہتی تھی مگر نجانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھ سے دروازہ کھلوایا- وہ شدید سردی کے دن تھے- باہر دھند کے اڑتے مرغولوں میں وہ سرتاپا گرم لباس میں ملفوف کھڑا ٹھٹھر رہا تھا-

''آپ اب تک تیار نہیں ہوئیں؟'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوال کیا-

''مگر کیوں تیار ہوں میں؟'' میں نے جھنجھلا کر کہا- جبکہ میرے ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں جیسے کوئی بتی روشن ہوئی تھی جانے کے لیے مجھے کون سا لباس پہننا ہے- میں نے سوچ لیا تھا-

''آپ جلدی کیجئے- بریڈفورڈ کے لیے ہمیں جس ٹیوب ٹرین پر جانا ہے اس کا ٹائم ہوا چاہتا ہے-''

اس نے اندر آ کر میری بات کا جواب دیے بغیر کہا- اس کی آنکھوں کی چمک نے مجھے گویا ٹرانس کی کیفیت میں ڈال دیا اور میں کسی مکینیکل گڑیا کی طرح اپنے کمرے کی طرف مڑی اور دروازہ بند کر کے لباس تبدیل کرنے لگی- یہ ٹرانس میں چلے جانے کا دوسرا تجربہ تھا جو مجھ پر گزرا تھا- ایک وہ جو مہاراج کے ہاں رقص کے دائروں اور سرکی لے پر گزرا تھا اور ایک یہ تھا جس نے میری تمام حسیات کو خوابیدہ کر دیا تھا- میں نے جھٹ پٹ کپڑے بدلے' بال بنائے اور شولڈر بیگ اٹھا کر باہر آ گئی-

''واللہ' آج میرا یقین مزید پختہ ہو گیا-'' وہ مجھے دیکھ کر بہ زبان انگریزی زیر لب بڑبڑایا-

''واللہ!'' میرے دماغ میں کچھ اور کلک ہوا- اب یہ کوئی راسکل بھی ہو سکتا تھا- سرزمین عرب سے متعلق انڈر ورلڈ کا کوئی پٹھا-مگر میری انسانی ہوش مند سوچ پر پھر ٹرانس کا پردہ پڑا اور میں اسی مکینیکل ڈول کے سے انداز میں اس کے پیچھے چل دی-

بریڈفورڈ تک کے سارے راستے میں وہ خاموشی سے سر جھکائے وہی کتابچہ پڑھتا رہا اور میں سونے جاگنے کی کیفیت میں آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی- دماغ کا وہ گوشہ جس میں کوئی بتی روشن ہوئی تھی اب بھی احتجاج کر رہا تھا-''میں اس کے ساتھ کیوں اٹھ کر چلی آئی تھی- اب نجانے کیا ہونے والا تھا- یقیناً جو بھی ہونے والا تھا' بہت برا ہونے والا تھا- اب تک برا ہی برا ہوتا چلا آیا تھا- لہٰذا آئندہ بھی یقیناً ایسا ہی ہو گا-'' پھر دماغ کا وہ روشن گوشہ چلایا-

''بھاگ جاؤ-'' مگر ہاتھوں' پاؤں اور باقی جسم کی تمام سکت کا کنٹرول دماغ کے پاس نہیں رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی مرضی سے آنکھ بھی نہیں جھپک سکتی تھی- بریڈفورڈ پہنچ کر جب ہم انڈر گراؤنڈ سے باہر آئے تو دن نکلنے کے باوجود کہر کے اندھیرے نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا- میرے راہنما نے مجھے لے جا کر ایک گاڑی میں بٹھایا-

''یہ ہمیں لینے کے لیے آئے ہیں-'' اس نے مختصراً بنایا کیا دیکھتی ہوں کہ ایک افریقی نژاد شخص چھوٹی چھوٹی داڑھی اور سرخ سرخ آنکھوں والا اسی طرح سرتاپا گرم کپڑوں میں ملفوف ڈرائیونگ

سیٹ پر بیٹھا سامنے دیکھ رہا تھا- میرا دل خوفزدہ ہو کر چیخیں مارنے لگا اور دماغ کا وہ گوشہ ایک مرتبہ پھر چلایا- ''بھاگ جاؤ'' مگر پھر وہی عجب بے بسی کا عالم- میں نے اپنے بے جان وجود کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھکیلا اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی- دھند کے بادل کو چیرتی بالآخر یہ گاڑی ایک سفید عمارت کے سامنے جا کر رکی جس کا کالا گیٹ گاڑی کی آواز پر کھل گیا- سامنے ایک وسیع کورٹ یارڈ تھا جس کے کنارے فاصلے فاصلے پر سفید سنگی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں- میرے راہنما نے سیڑھیوں سے اوپر سفید سنگی گول ستونوں والے طویل برآمدوں تک میری راہنمائی کی- طویل برآمدہ عبور کرتے کرتے یکدم وہ ایک کمرے کے سامنے جا رکا اور جوتے اتار کر مجھے بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا-

''اللہ اللہ- اب یہ گینگسٹرز- اپنے بگ باسز کے سامنے جانے سے پہلے جوتے بھی اتارا کرتے ہیں-'' میں نے دل میں سوچا اور اپنے جوتوں کے فیتے کھولنے لگی-

اندر روشنی تھی اور کمرے میں خوبصورت میٹنگ تھی- چند گاؤ تکیے اور کتابوں کی الماریاں' ایک نظر دیکھنے پر کمرہ خالی نظر آیا مگر دوسری مرتبہ دیکھنے پر کسی ذی روح کی موجودگی کا گمان ہوا-

''آیئے' عائشہ نیازی! سامنے آیئے-'' اس کونے سے آواز آئی جہاں کسی کے موجود ہونے کا گمان ہو رہا تھا-

''آداب کہیے-'' میرے راہنما نے عقب سے سرگوشی کی-

''آداب' سلام آپ کے سکھانے اور بتانے کی چیز نہیں ہیں ابوحسین- آپ کا کام ختم ہوا- اب آپ جایئے اور مہمان خانے کی خبر لیجیے-'' کسی نے جھکا سر اٹھایا اور میرے راہنما سے کہا- وہ میرے عقب سے ہلا اور باہر نکل گیا-

''تشریف رکھیے-'' انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں گھٹنوں کے بل دوزانو ہو کر بیٹھ گئی- نجانے وہ کیا سحر تھا جس نے میرے گلے میں جھولتا سیاہ اسکارف میرے سر پر اوڑھا دیا اور سیاہ لانگ اسکرٹ کو میری ٹانگوں پر سیدھا کر دیا- وہ میری اس حرکت پر زیر لب مسکرائے-

''کیا آپ گھبرا رہی ہیں؟'' انہوں نے سوال کیا-

''نن..... نہیں-'' میں نے اپنے خشک لب تر کرتے ہوئے کہا-

''نفی اور اثبات کی جنگ میں سے مثبت کی فتح کی کوشش اچھی ہوتی ہے- مگر یہاں پر پسپائی اختیار کر لینے والے کا تمسخر اڑانے کی روایت نہیں ہے- آپ گھبرا رہی ہیں' یہ حقیقت ہے- اس حقیقت کی نفی کرنے سے آپ کے دل کی گھبراہٹ دور تو نہیں ہو سکے گی-''

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بس نظر اٹھا کر انہیں دیکھتی رہی-

''بات گھبرانے کی ہے بھی' یوں کسی کو بغیر کچھ بتائے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے آیا

جائے تو گھبراہٹ تو لازم ہے- ہم یوں کیا نہیں کرتے' مگر بات اتنی ہے کہ آپ کے لیے اتنی بار گریہ زاری کے ساتھ سفارش کی گئی ہے کہ ہم اس بات پر مجبور ہو گئے کہ آپ کو یہاں بلا کر آپ سے بات کی جائے-''

''میرے لیے سفارش! گریہ وزاری کے ساتھ-'' دماغ کا روشن گوشہ بڑبڑایا- ''یہ ہو کیا رہا ہے اور یہ ہیں کون؟'' اب کے میں نے غور سے انہیں دیکھا- ان کا چہرہ سرخ وسفید تھا- چہرے پر سرخی مائل گھنی داڑھی تھی اور وہ سفید لباس میں تھے- اس پر انہوں نے براؤن اونی چادر جسے پاکستان میں دھسہ کہا جاتا ہے' لپیٹ رکھی تھی- ان کے سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں تسبیح- عرصے کے بعد میں نے کسی کے ہاتھ میں سبز امام والی تسبیح دیکھی تھی- ویسے تو لندن کی سڑکوں پر اکثر ہندو وشیٔ جاپانی بھکشو اور چینی پروہت تسبیحاں پکڑے ممبوجمبو کرتے پھرتے رہتے تھے مگر اتنی خالص اسلامی سیٹنگ میں تسبیح پکڑے شخص کو نجانے کتنے برسوں بعد دیکھا تھا-

''مگر مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟'' میں نے لرزتی آواز میں دریافت کیا-

''آپ کو ابھی میں نے بتایا ہے کہ آپ کے لیے رو رو کر استدعا کی گئی ہے-'' انہوں نے اپنی بات دہرائی- ''ہمیں ایک عرصے سے ایک صاحب سرخ وسفید' دراز قامت' سر پر جناح کیپ' چہرے پر خشخشی داڑھی والے خواب میں آ کر آپ کے متعلق اشارے دے رہے تھے- التجا کر رہے تھے- حضرت صاحب! یہ بچی راستے سے بھٹک گئی ہے' گم ہو چکی ہے' اسے راستہ نہیں مل رہا- نہ کوئی راستہ دکھانے والا باقی رہا ہے' نہ کوئی دست گیر ہے' اس کی راہنمائی فرمایئے- دست گیری فرمایئے-'' پھر ہمیں حکم ہوا کہ اس بچی کے لیے مسجد نبویؐ میں دعا کی گئی ہے اور اس کی راہنمائی کے لیے آپ کی ڈیوٹی اس لیے لگائی جاتی ہے کہ دعا کرانے والے کی دعا قبول کر لی گئی ہے- اس بچی کی دست گیری کیجیے-'' وہ کہہ رہے تھے اور میرا دل ساکت ہونے لگا تھا زبان گنگ اور ذہن ماؤف-

''یہ کیا الف لیلیٰ سنا رہے ہیں-'' میرے دماغ کے اس روشن گوشے نے سوال کیا- ''اور یہ صاحب کون ہیں' یہ عمارت کیا ہے یہ میں کس نئے چکر میں پھنس گئی ہوں-'' مجھے سارے کا سارا منظر اور معاملہ پر اسرار اور جادو بھرا لگا- پرانی کہانیاں یاد آنے لگیں-

ابھی کچھ دیر پہلے ایک خاتون سرتاپا کپڑوں میں ملفوف' سر پر بڑی چادر اوڑھے' نظریں جھکائے میرے سامنے چائے اور لوازمات کی کشتی رکھ کر کہیں غائب ہو گئی تھیں- ''یہ سینڈوچ یقیناً نشہ آور ہوں گے-'' میرے پیٹ میں دوڑتے چوہوں نے مجھے ہاتھ بڑھا کر ٹرے کی طرف لپکنے پر مجبور کیا تو دماغ کی روشن کھڑکی نے تنبیہہ کی-

''کھا لیجیے بی بی! اس میں کوئی نشہ یا زہر نہیں ہے-'' نگاہیں جھکا کر بیٹھے شخص نے موقع پر میرے

دل کے چور کو پکڑتے ہوئے یکدم کہا- میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں- ''ان کو کیسے معلوم کہ میں کیا خیال کر رہی ہوں-''

''یہ اسرار کی باتیں ہیں جو آپ کو فی الحال سمجھ میں نہیں آئیں گی- آپ اپنے پیٹ کی بھوک مٹائیے' اتنے میں ہم ذرا اپنے نوافل ادا کرلیں-''

انہوں نے دیوار پر لٹکتے قبلہ نما کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا- عرصے بعد یہ ماحول دیکھا تھا- جاء نماز' تسبیح' اردو بولتا بزرگ شخص' مسجد نبویؐ اور خانہ کعبہ کے منی ایچرز' مانوس خوشبو جو عبادت گاہوں سے' خانقاہوں سے اٹھتی ہے-'' سب ذہن کے وہم اور ٹریپ کرنے کے طریقے-'' میرے تعقل پسند دل نے سوچا اور میں نے فی الوقت ہر طرف سے صرف نظر کر کے صرف کھانے پر توجہ مبذول کر لی-

مجھے اتنی شدت کی بھوک شاید تمام عمر نہ لگی ہو جتنی اس روز محسوس ہوئی تھی- پھر میں نے گرم چائے کے دو کپ پیے اور اس سارے کام میں مجھے آدھا گھنٹہ لگا- کھانے سے فارغ ہو کر میں نے تسلی سے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا جو غالباً نوافل ادا کر چکنے کے بعد تسبیح میں مشغول تھا- اب میرے تعقل پسند ذہن کے سوتے دوبارہ کھلنا شروع ہو گئے- یہاں یورپ میں مختلف گروہ جو خود کو کبھی وشی' کبھی صوفی' کبھی گرو اور پروہت کے نام سے بلواتے تھے بری طرح سرگرم عمل تھے- کرامات اور معجزوں کے ذریعے کمزور ذہن لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے اور اپنے حلقے میں شامل کر کے شانتی شانتی اللہ اللہ کے ورد کرتے پھرتے تھے-

ان کے ٹھکانے' ان کے آشرم کم و بیش اسی قسم کے ہوا کرتے تھے- یہ بھی یقیناً ایسی ہی کوئی چیز ہیں- اپنے چیلوں کے ذریعے مجھے یہاں اٹھوا لائے اور اب کراماتی زبان بول کر مجھے برین واش کرنے والے ہیں اور میں ٹھہری ماڈرن سائنس کی پیروکار' بذات خود عقل کل- میں اب جس اسٹیج ہوں- ایسوں ویسوں کے ہاتھوں کہاں برین واش ہوتی ہوں- ان سے کہیں بڑے بڑے بزرگوار ہمارے مساج ہوم کے کسٹمرز رہ چکے ہیں- مجھ سے زیادہ ایسوں کے اندر باہر سے کون واقف ہو گا- میں دل ہی دل میں اپنی دانش مندانہ سوچوں پر خوش ہو رہی تھی- مگر مجھے حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ دل ہی دل میں خوش میں ہو رہی تھی' مسکراہٹ تسبیح پھیرتے ان بزرگوار کے چہرے پر کیوں بکھرتی جا رہی تھی-

''جی تو عائشہ بی بی! آپ نے چائے پی لی-'' خاصے توقف کے بعد اس شخص نے سر اٹھا کر دریافت کیا- میں نے آواز نکالے بغیر اثبات میں سر ہلایا-

''اب غالباً آپ واپس جانا چاہیں گی؟'' اب کے سوال پوچھا گیا-

''مگر اس سے پہلے یہ بات کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا؟''

''آپ کو بتایا تو ہے کہ آپ کے لیے مسجد نبویؐ میں دعا کی گئی ہے-''

''میرے لیے کون دعا کر سکتا ہے- کون کرے گا دعا؟'' میں نے بلند آواز میں کہا- ''میرا کوئی نہیں ہے جو میرے لیے ایسی دعائیں کرے' آپ مجھے الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں-''

''ایک بات تو یہ ہے کہ جن کا کوئی نہیں ہوتا' ان کا ہی تو خدا ہوتا ہے-'' وہ شخص مسکرا کر بولا- ''دوسری بات یہ کہ میں آپ کو الجھانے کی کوشش نہیں کر رہا حالانکہ ہمارے عہد میں ہر انسان ہی الجھا ہوا ہے مگر آپ کے لیے خوشخبری کی بات یہ ہے کہ آپ کو الجھنوں سے نکالنے' آپ کی بگڑتی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اشارہ آیا ہے' حکم ہوا ہے کہ آپ کو انگلی پکڑ کر آپ کو سیدھے اور سچے راستے پر لے جایا جائے- سیدھا راستہ جو خدا کا راستہ ہے- جو عالم روحانی کی طرف لے جاتا ہے- اس دنیا سے الگ ایک دنیا ہے جو آپ کو پکار رہی ہے جو آپ کی منزل ہے- ہم تو صرف نشاندہی کرنے والے ہیں- آپ خوش قسمت ہیں عائشہ بی بی! کہ آپ کے لیے بشارت ہوئی ہے-''

''بشارت' ہونہہ!'' میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا- ''خوش قسمت اور میں' خوشخبری اور میں...... آپ بھول جائیے کہ میں اس وہم میں آؤں گی اور آپ کی باتوں کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کی سعادت حاصل کر لوں گی- میرا قصہ کچھ اور ہے- مجھے اب خود سے علم ہے کہ سیدھا راستہ کون سا ہے اور میری منزل کیا ہے- آپ نے ناحق مجھ پر اتنی محنت کی اور اپنے اس چیلے چانٹے کا وقت برباد کیا- میں اب واپس جانا چاہوں گی- آپ کو چاہیے اپنا آبجیکٹ (Object) کسی اور کو بنائیے-'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا-

''آپ کو پہلی مرتبہ یہاں لانے کا مقصد صرف آپ کو یہاں تک کا راستہ دکھانا تھا- آگے آپ خود دیکھ لیں کہ کیا ہو سکتا ہے کیا نہیں ہو سکتا- ابوحسین آپ کو واپس چھوڑ آئے گا-''

میں تن فن کرتی باہر نکلی' سبز ستونوں اور قالین بچھی غلام گردشوں کے درمیان سے گزرتی میں اسی غصے کی کیفیت میں بھری ہوئی تھی- ابوحسین میرے پیچھے بھاگا آ رہا تھا-

''میں خود جا سکتی ہوں-'' میں نے ایک جگہ رک کر گردن پیچھے موڑ کر کہا-

''درست' مگر یہ حضرت صاحب کا حکم ہے' جس سے روگردانی میرے لیے ممکن نہیں- مجھے آپ کو واپس چھوڑ کر آنا ہے-''

''یہ آپ کی مرضی ہے' مسٹر! ورنہ میں راستہ بھولی ہوئی ہستی نہیں ہوں-'' میں نے تنک کر کہا اور باہر نکلی- وہ افریقی نژاد بندر نما شخص اب بھی اسی گاڑی کے اسٹیئرنگ سے چمٹا سرخ سرخ آنکھیں پھاڑے یوں بیٹھا تھا جیسے کسی ہارر مووی کا کوئی سین فلمبند کرانے کے لیے آیا ہو-

''ایک بات ہے عائشہ بی بی!'' بریڈفورڈ سے واپس لندن کے راستے میں اس شخص جس کو ابوحسین کے نام سے پکارا گیا تھا بولا- ''حضرت صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ آئیں گی' میں اتنے

دن آپ کے گرد چکر کاٹتا دل میں کئی بار سوچتا کون یوں جا سکتا ہے مگر پھر میری ان گناہ گار آنکھوں ہی نے دیکھا کہ آپ گئیں نہ صرف یہ کہ آپ گئیں بلکہ آپ کے جانے اور واپس آنے کا جو نقشہ حضرت صاحب نے بذات خود آپ کے آنے سے قبل بیان فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔''

''اب تم اس شخص کی لائن آگے چلاؤ۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''تمہارے ذہن میں جو بھی بات آتی ہے اس کو سوچو۔ مگر ایک بار یہ بھی ضرور سوچنا کہ جن صاحب کی شکل وصورت کا نقشہ حضرت صاحب نے بیان فرمایا ہے کیا وہ تمہارے احاطہ فہم میں شبیہہ بن کر ابھرتا ہے یا نہیں؟'' مجھے میرے فلیٹ کے بیرونی دروازے پر خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے کہا مگر میں ان سنی کرتی اندر آ گئی۔

''ناحق ایک دن برباد ہوا۔ اب ضیاء صاحب نجانے کتنا ناراض ہوں گے۔'' میں نے خفگی سے سوچتے ہوئے بچوں کے پروگرام کے پروڈیوسر کو یاد کیا۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بریڈفورڈ سے واپسی پر میرا ذہن بہت دن تک اچھا رہا۔ میں جیسے اپنا کوئی سرا وہاں چھوڑ آئی تھی اور اس سرے کو گویا کوئی پیچھے سے ہولے ہولے کبھی کبھار جھٹکا دے رہا تھا۔ میں اکثر بری طرح ہڑبڑا جاتی۔ کچھ دن بعد تک میں اپنے اس ذہنی خلجان سے بے چین اور مضطرب ہو چکی تھی۔

''خدا' عالم روحانی' دعا' گریہ وزاری' قبولیت' بشارت۔'' میرے کانوں میں بریڈفورڈ والے حضرت صاحب کی گفتگو کے الفاظ گونجتے۔

''شاید کوئی خدا ہو' شاید کوئی عالم روحانی ہے۔'' میں نے ایک روز سوچا۔ ''مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ سب ذہن کی الجھنیں ہیں' گتھیوں میں گتھیاں اور پرسکون آنے والے دنوں کے خواب ایسا شخص دیکھتا ہے جس کا امید پرست دماغ اسے سبز باغ دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا دماغ امید پرست نہیں ہے۔ نہ ہی اب تجربے کی اس عمر میں کوئی سبز باغ دیکھنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

یہ باتیں سوچتے سوچتے مجھے ایک دم پھر جھٹکا سا لگا اور اس بار جھنجھلا کر میں نے الماری سے سرخ وائن نکال کر ایک پیگ بنایا۔

''عالم روحانی' خدا' میٹا فزکس' ہونہہ!'' میں نے اس پیگ کو انگلیوں سے اٹھا کر نظروں کے سامنے کرتے ہوئے آواز بلند کہا۔

''او کے' پیر صاحب آف بریڈفورڈ شریف' میں آپ کی نصیحت پر عمل کرتی ہوں' چنانچہ مشاہدہ حق وباطل کے بادہ وساغر میں کاک ٹیل نوش جان فرمائی جاتی ہے۔''

''عیشاں!'' یکدم مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے ایک سخت ہاتھ مار کر میرے ہاتھ سے وہ جام جھٹکے سے دور پھینک دیا۔ میں نے چونک کر ایک نظر چور چور ہوتے گوبلٹ اور رینگ رینگ کر بہتے سرخ محلول پر ڈالی اور پھر کسی غیبی ہستی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ ٹھک سے میری

کتابوں والی شیلف سے ایک پرانی ڈائری نیچے آ گری۔ اس ڈائری کے ٹائیٹل کور کے اندر دبی ایک شکستہ تصویر لڑھکتی ہوئی عین میری نظروں کے سامنے آ رکی۔ یہ اماں کی تصویر تھی جو کالج کے زمانے میں' میں نے اس ڈائری کے ٹائٹل کور کے اندر گھسیڑ ی تھی۔

یہ ڈائری میرے اس شولڈر بیگ میں میرے ساتھ ہی آئی تھی جو میں پاکستان سے یہاں لائی تھی۔ شروع میں تو میں نے اسے یونہی فضول جانا مگر پھر خود پر پڑنے والی یکے بعد دیگرے مصیبتوں میں' میں نے اسے پرانی یادگردان کر جان سے چمٹا لیا۔ گو اس سارے عرصے میں ایک بار اس کو کھول کر دیکھنا تو کجا اس کی دھول تک نہ جھاڑی تھی اور یہ یاد تک نہ رہا تھا کہ اس کے اندر اماں کی تصویر پوشیدہ تھی۔ یہ کیسا موقع تھا کہ میرے ہاتھ سے وہ جام چھوٹا جس کے لیے میں نے توہین آمیز کلمات کہے اور پھر میں نے ہاتھ مار کر گرا دینے والی ہستی کو تلاشا تو اماں کی وہ تصویر نجانے کیسے یکدم نظروں کے سامنے آ گئی۔

میرا پہلے سے گھبرایا ہوا دل مزید گھبرا گیا۔ میں نے اٹھ کر وہ شکستہ تصویر اٹھائی جو اماں نے حج پر جانے کی درخواست دینے کی غرض سے بہت پہلے ایک بار کھنچوائی تھی۔ مدتوں بعد وہ چہرہ دیکھا تھا جس کے نقوش میں نرمی تھی' سادگی تھی اور جن آنکھوں میں سکون اور قناعت تھی۔ میرا گناہ آلود وجود' میرے گناہ آلود ہاتھ اس قابل کہاں تھے کہ اس تصویر کو پکڑتے اور اٹھا کر سینے سے لگا لیتے۔ اس رات میری بے سکون نیند بار بار ٹوٹی۔ مجھے ہیولے اور تصویریں نظر آتی رہیں۔ چہروں پر ڈیتھ ماسک پہنے موت کے فرشتے میری کرنیوں کے بھوت اور گناہوں کے جن چیخ چیخ کر خوفناک آوازیں نکالتے ہوئے مجھے ڈراتے رہے اور گھٹی گھٹی چیخیں میرے حلق میں دم توڑتی رہیں۔ کبھی میرے پردہ وہم میں کفن پہنے اشک بہاتے ابا ابھرتے اور کبھی موت کا ماسک پہنے خالہ رحمت کے منہ سے نکلتی بددعاؤں اور کوسنوں کی ڈائنیں خوفناک قہقہے لگاتی' لپلپاتی زبانیں نکالتی میری جانب بڑھتیں۔

پھر اچانک میرے اس پردہ وہم پر ایک اور شبیہہ ابھری' سرخ وسفید چہرہ' سرخی مائل خشخشی داڑھی اور سفید لباس' ہاتھ اٹھا اٹھا کر اشک بہاتے ہوئے آستانہ نبویؐ میں کھڑے دعا مانگتے شخص کا چہرہ' یہ چہرہ میرے مونس' میرے غم خوار شاہ صاحب کا چہرہ تھا۔ میرے حواس یکدم جاگ گئے اور میں نے آنکھیں کھول کر اپنے وجود کو اٹھایا۔ جیسے کوئی گتھی سلجھ گئی تھی' جیسے کچھ گرہیں نکل گئی تھیں' ان گزرتے سالوں میں بار بار میرے ذہن میں خیال آیا کہ اپنے گھر میں اکلوتی اہمیت ہونے کی وجہ سے جب کبھی میں بچپن میں چک کے کسی کونے سے واپسی میں دیر کر دیتی تو اسے میری گمشدگی گمان کر کے ابا کی آواز مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر ابھرتی۔

''ایک بچی جس نے فلاں فلاں رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

اب ایک عرصہ گزر چکا مجھے گم ہوئے مجھے کوئی تلاش نہیں کرتا۔ کوئی میرے لیے کہیں اعلان

نہیں کرواتا۔

اب اتنے سال بعد انکشاف ہوا تھا کہ نجانے کب سے میری یہ بزرگ، مجھے محبوب رکھنے والی یہ ہستیاں کہاں کہاں میری ذات کے لیے دعائیں کرتی رہی ہوں گی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے ٹرانس کی حالت میں چلے جانے اور ابوحسین کی پیروی میں ''آستانہ عالیہ بریڈفورڈ شریف'' تک پہنچ جانے کی وجہ بھی سمجھ میں آنے لگی تھی اور جس وقت یہ سمجھ میں آئی تھی میں پوری طرح جاگ چکی تھی۔ جاگتا تو مجتبیٰ حسین صاحب بظاہر ہر کوئی ہے، مگر اندر کا جاگنا اور بات ہوتی ہے اور میں یکا یک جاگ چکی تھی۔

اگلی صبح ہی کچھ ضروری سامان باندھ کر عازم بریڈفورڈ ہوئی اور سیدھی آستانہ عالیہ پہنچی۔

رات سہاگ کی آئی
دے دو ری سکھیو بدھائی
پورا بھیورے مورا سپنا
خواجہ جی آئے مورے انگنا

میں اپنے تصورات کے ہیولوں میں گم تھی، جب اچانک قوالوں کی منڈلی نے اپنا ٹریک بدل لیا۔ جب میں اپنی گمشدہ زندگی کے ماتم سے باہر نکلی تو میری سماعت سے آواز ٹکرائی۔

پورا بھیورے مورا سپنا
خواجہ جی آئے مورے انگنا

لوگ، آوازیں، مجمع، کمرا، فرش، قالین، دیواریں سب گھوم گھوم کر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ میرے پیش منظر کی تمام موجود چیزیں ایک گول دائرہ بن گئیں اور میں جیسے اس ایک زناٹے دار تیز رفتار گول دائرے میں بیٹھی اوپر نیچے ہورہی تھی۔ یہ ٹپیکل سیٹنگ...... یہ مرشد، یہ پیرو کاروں کا ہجوم، قوالوں کی منڈلی اور ان کے منہ سے نکلتے یہ لفظ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میرے حافظے میں ایسے لاتعداد منظر اور بے شمار آوازیں محفوظ تھیں، ابا کے گھر پر ہونے والے سالانہ ختم شریف کے منظر، ابا کے مرشد کے آستانے کے منظر قوالی کی آواز اور اس آواز کی لے اور الفاظ پر سرور کا علم، اور پھر ہوش وخرد سے بیگانہ وجد کا عالم۔

''ہاں، ہاں۔'' میرے دماغ کے کئی گوشے روشن ہوکر پکارے۔ ہاں، ہاں، یہ اصل ہے یہ اصل تھا، یہ اصل رہے گا۔ ہاں، ہاں، یہ وہ تھا جو دراصل میری روح کو پکارتا تھا، مگر اس پکار پر لبیک کہتی میں اس راستے پر جانکلی تھی، جس کی سمت دوسری تھی۔ میں سمت کے تعین میں ناکام ہوتی تھی۔ اس پکار کے پیچھے ایک راستہ دنیا کی طرف جاتا تھا، اور دوسرا راستہ ابدیت کی طرف میری کوتاہ بینی مجھے شارٹ کٹ کی طرف لے گئی۔ میں دنیا کو لبیک کہہ بیٹھی تھی۔

مجھے خود پر گزری، بے خودی کی کیفیات یاد آئیں، مجھے مہاراج کے ہاں اپنے پر گزری بیگانہ واری کی وہ پہلی کیفیت یاد آئی جس میں مبتلا ہوکر میں حاضرین محفل، اپنی عمر اور پوزیشن کو بھی بھلا بیٹھی تھی اور اس سے بھی بہت پہلے۔

منم عثمان ہارونی کہ بار شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے ومن برادری رقصم

وہ میرا ہاتھ اٹھا کر گول دائروں میں گھومنا اور پھر شاہ صاحب کے ریڈیو پر شیخ عثمان ہارونی کا یہ صوفیانہ کلام سنتے ہوئے خود پر چھائی کیفیت۔ پکار تو یہ تھی یقیناً یہ تھی یہی وہ تھا جو میری روح سے اٹھتا تھا مگر اس پکار کا جواب دینے کے لیے مجھے کوئی راہنما نہ ملا تھا۔ میں نے اپنی راہنمائی خود کی اور دنیا کی بھول بھلیوں اور لہو ولعب میں پھنس کر رہ گئی۔

رات سہاگ کی آئی
دے دو ری سکھیو بدھائی

ایک بار پھر لفظ میری سماعت سے ٹکرائے میرے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا مگر پھر ایک دم میرے سارے اعضاء ساکت ہوگئے۔ اس کے بدلے آنسو جیسے میری پور پور اور آنکھوں سے اکٹھے بہہ نکلے۔ میرے جسم کا ارتعاش رک گیا۔

اب مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے میں کسی لق ودق صحرا میں تنہا کھڑی تھی، آنسوؤں کا سیلاب تھا جس کے پیچھے مجھے ہر طرف سراب ہی سراب نظر آرہے تھے۔ میری سسکیاں آہوں میں بدلیں اور آہیں، چیخوں کی شکل اختیار کرگئیں۔ وہ مجمع اور کمرے میں موجود ہر دوسری چیز غائب ہوچکی تھی صرف میں ہی میں تھی اور میری چیخ وپکار تھی، پھر رفتہ رفتہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے اردگرد لوگوں کی گفتگو کی بھنبھناہٹ جو مجھے اس سارے کے بناوجود کہیں آتی سنائی دے رہی تھی ختم ہوگئی اور میں درحقیقت تنہا رہ گئی تھی۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ کمرہ خالی تھا صرف حضرت صاحب اپنے مخصوص نیچے تخت پر موجود تھے اور میں تھی گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ میرا دامن آنسوؤں سے تر ہوچکا تھا اور میرا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

''آپ کے لیے تو کچھ بھی نیا نہیں ہونا چاہیے، آپ کا تعلق تو ملتان سے ہے جو علمائے ظاہر و باطن کی سرزمین ہے عائشہ بی بی۔'' پھر کمرے کے سکوت میں حضرت صاحب کی گمبھیر آواز گونجی۔

''علمائے ظاہر و باطن کی سرزمین نے مجھ ایسے ناکارہ لوگ بھی پیدا کیے ہیں۔'' میں نے گھٹتی چیخوں کے شور میں کہا۔

''لوگ، انسان ہجوم ناکارہ نہیں ہوتے، بس ذہن کی سوچ انہیں ناکارہ بے وجود راستوں پر لے جاتی ہے۔ لوگوں، انسانوں اور ہجوموں کو ناکارہ قرار دینے سے تو براہ راست خدائے بزرگ و برتر پر

تہمت بندھ جاتی ہے عائشہ بی بی۔''

یکا یک میرا ذہن تقدیر کی بحث میں بھٹک گیا۔ جب سب طے ہے' انسانوں کی تقدیروں کا فیصلہ ہو چکا تو پھر گناہ وثواب کے چکر کیا معنی۔

''انسان کی تقدیر بے شک طے شدہ ہے۔'' حضرت صاحب نے میری سوچ کو پڑھتے ہوئے کہا۔

''مگر خدا تعالیٰ نے برے اور بھلے کو کھول کر بیان کر دیا اور پھر انسان کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کی عظیم طاقت عطا فرماتے ہوئے دماغ سے سرفراز فرمایا' انسان اور دیگر جاندار اشیاء میں یہ ہی تو فرق ہے۔''

''پھر یہ سب کیا ہے' گناہ ثواب کے چکر' بھٹکا ہوا مسافر اور برائی کی کیچڑ یہ سب انسان کا مقدر نہ چاہتے ہوئے بھی کیوں بن جاتے ہیں۔'' میں ایک بار پھر ٹرانس سے نکل کر وجوہات پر دلیلیں دینے لگی۔

''کبھی کبھار ایک قدم غلط پڑتا ہے' پھر راستہ بدل جاتا ہے اور پھر انسان جب ایک بار بھٹک جاتا ہے تو پہلے تو اس کا عمل نادانستہ ہوسکتا ہے بعد میں وہ دانستہ اس کیچڑ میں پاؤں ڈالتا اور چلتا جاتا ہے۔''

''اس کیچڑ سے نکلنے کا راستہ کیا ہے' طریقہ کیا ہے؟۔'' میں نے اب کے بلبلا کر کہا۔

''توبہ اور صرف توبہ۔'' وہ سکون سے بولے۔

''توبہ کا طریقہ کیا ہے؟''

''سچے دل سے عہد' خدا کے راستے پر چلنے کا عہد' یہ عہد انسان کو خدا کے راستے پر چلا دیتا ہے' عبادت کی طرف مائل کرتا ہے' مگر عبادت' ایک بات یاد رکھنا کہ توبہ کے بغیر عبادت تشنہ ہے۔ اسی لیے تو خدا کے راستے پر چلنے کا متمنی ہر شخص توبہ کی دعا کرتا ہے۔ خواہ وہ کوئی عاصی ہو یا زاہد یا پھر خدا کا دوست ہی کیوں نہ ہو۔''

''عاصی کی توبہ تو سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے کہا ''زاہد اور خدا کا دوست توبہ کا متمنی کیوں ہوتا ہے۔''

''عاصی اپنے عصیاں سے توبہ کرتا ہے' زاہد اپنے زہد سے خدا کا دوست اپنے مقامات وکرامات سے توبہ کرتا ہے' زاہد کا زہد اور خدا کے دوست کی کرامات ومقامات اس کے دل میں غرور بھی پیدا کر سکتے ہیں اس کے دل میں خود کے خلقت کی نسبت بلند درجہ پر ہونے کا احساس تفاخر بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ اسی لیے زاہد اور خدا کا سچا دوست ہمیشہ کی توبہ میں مبتلا رہتے ہیں۔'' میرے دماغ کے وہ سوتے کھلنے لگے جو عرصہ دراز سے بند تھے۔ کچھ کو میں نے خود بند کیا کچھ از خود بند ہوتے چلے گئے تھے۔ مجھ پر اپنا آپ ظاہر ہونے لگا۔

''ہاں' پہلے اسی راستے پر چلنے کی کوشش کیجئے۔'' وہ ایک بار پھر میری کیفیت بھانپ کر بولے۔

''خود شناسی کے بغیر خدا شناسی کا عمل ناممکن ہے۔ یہ آئینہ ہی ہوتا ہے جو آنکھوں کو باطن میں اترنے کا راستہ بتاتا ہے۔''

میں نے کچھ دیر کے لیے سکتے کے عالم میں ان کو دیکھا۔ پہلی بار میں نے انہیں غور سے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں جو تاثر تھا جو چیز مجھے نظر آئی تھی اس کی تاب میں زیادہ دیر نہ لا سکی تھی۔ ان کے چہرے کی طرف بھی مجھ سے زیادہ دیر تک دیکھا نہیں گیا۔

''میں بہت گناہ گار ہوں پیر صاحب!'' میں نے یکدم ہاتھ جوڑ کرہا۔

''بی بی! ایک بات تو یہ کہ میں کوئی پیر نہیں ہوں نہ ہی مجھے کوئی پیر جانتا ہے۔ جس طرح لوگ جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیے میڈیکل سائنس کے اسپیشلسٹ کے پاس جاتے ہیں' اسی طرح روحانی تکالیف کے بھی ڈاکٹرز ہوتے ہیں' ان کا کام روح کے دکھ دور کرنا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے خلق خدا کی ان بیماریوں کی فیلڈ میں ریاضت کا مقام عطا فرمایا ہے...... اسپیشلائزیشن کی ڈگری جانے کب عطا ہو' مگر خلق خدا اگر کچھ جان کر ادھر آ جاتی ہے تو اپنے علم کے مطابق علاج مہیا کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں' دوسری بات کرم کرنے کا سوال ہے تو بی بی کرامت کے لیے تو concentrate (ارتکاز) کرنا پڑتا ہے concentration (ارتکاز) کا عمل خود شناسی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ آپ خود شناسی کے عمل سے گزرنے کی کوشش کیجیے۔

میں ان سے اجازت لے کر اٹھ آئی۔ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے خود پر گزری کیفیات کا تجزیہ کیا اور مجھے پہلی مرتبہ ان میں کوئی پیراڈوکس نظر نہیں آیا پھر مجھے یاد آیا کہ ایک بار کسی فراڈیے پیر کے بارے میں اخبار میں خبر پڑھ کر منظور سلطان نے کہا تھا کہ ''یہ سائنس اور تعقل کا زمانہ ہے۔ یہ ایک عالمگیر سازش ہے کہ تھرڈ ورلڈ کے لوگوں کو پھر مذہب پرستی اور اوہام کے جال میں گرفتار کر دیا جائے۔''

میں بلاشبہ اخلاقی' روحانی اور ذہنی پستی کے آخری مقام تک گر چکی تھی مگر وہ میرا سیاہ کار ہی سہی دل تھا جو روحانی طاقتوں کے ان مظاہروں کی گواہی دے رہا تھا جو مجھ پر بریڈفورڈ میں گزرے تھے یا جن کو میں نے ننگی آنکھ سے خود دیکھا تھا۔

روحانی طاقت! میرے ایک شناسا ولیم براؤن نے ایک بار بحث کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ چیز ہے جو دراصل ٹیلی پیتھی کی ایک شاخ ہے' اور جس کی ماڈرن ریسرچ E.S.A ہے۔ دراصل ماڈرن سائنس انسانی ذہن کی بہت سی Untapped قوتوں کو دریافت نہیں کر سکی۔ اگلے سو سالوں میں ساری حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔'' اسی وقت میں نے اس بات کی بھرپور تائید کی تھی۔

مگر میں اب جن کیفیات سے گزری تھی۔ ان کو واہمہ قرار دینے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عالم روحانی میں کچھ روحیں خالص میرے لیے کام کر رہی تھیں۔ بریڈفورڈ سے واپس آ کر میں نے برسوں بعد وضو کیا۔ اسکارف لپیٹا اور سربسجدہ ہو گئی۔

''آپ کے لیے خوشخبری ہے' آپ کے لیے خصوصی دعا کی گئی ہے۔'' حضرت صاحب کی بات بار بار یاد آتی رہی اور میں نے خود محسوس کیا کہ میں ذہنی ابتری کی حالت سے باہر نکلنے لگی تھی۔

''آپ کی زندگی کی اس شاہراہ کو اسی روز متعین کر دیا گیا تھا' جس روز آپ نے خود کو پرسیکیوٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا' اس وقت آپ خود آگاہی کی شاہراہ سے گزرنے لگی تھیں۔ پھر آپ دنیا کے سمندر میں تیرنے لگیں' مگر پہلی بار جب آپ کی راہوں کی متعین کر دیا گیا تھا تو پھر لاکھوں لہو ولعب کے باوجود آپ کو کنارے سے لگ کر ادھر کو بہنا تھا۔'' حضرت صاحب نے اگلی بار میری کہانی سن کر کہا۔

''جب پہلی مرتبہ ہمیں آپ کے بارے میں اشارا ملا تو ہم دنگ رہ گئے۔ یہ کون بچی تھی جس کے لیے ہمیں یہاں پر راہنما بنایا گیا تھا۔ ویسے تو جن کو ضرورت ہوتی ہے وہ خود بخود یہاں آ جاتے ہیں۔ پھر اشارا ملا کہ کسی کو آپ کی ڈیوٹی پر متعین کیا جائے تو ہم آپ کی قسمت پر حیران ہوئے پھر بتایا گیا کہ آپ کے لیے خصوصی دعا کی گئی ہے۔ ہمیں آپ کی خوش قسمتی پر رشک آیا۔''

''خوش قسمتی!'' میں دکھ سے بولی' ''حضرت صاحب میرے لیے دعا کیجیے' میں بے حد بدقسمت ہوں میں نے ایک ایک کر کے اپنے پیاروں کو دھوکا دیا۔ اپنے اوپر غلاظت ملی اور پھر اسی غلاظت کا حصہ بن گئی۔ مجھے اپنے وجود سے گھن آتی ہے حضرت صاحب! میرے لیے دعائے خیر کیجیے۔ میری زندگی سنور جائے۔'' عرصے بعد اماں کی کہی باتیں میری زبان پر آئیں۔

''جب آپ کو بتایا جا رہا ہے کہ آپ کے لیے دعائیں کرنے والے بہت ہیں تو پھر آپ اس بات کو بار بار کیوں دہراتی ہیں۔''

''مگر میں کیا کروں' میں Concentrate (ارتکاز) کرنے کی کوشش کرتی ہوں' بار بار میرا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ حضرت صاحب! دنیا کی کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''دنیا میں دل لگانے کی کیا ضرورت ہے بی بی! دل تو بذات خود ایک دنیا ہے۔'' انہوں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ میرا دل پتے کی طرح لرزا۔ کس قدر پتے کی بات تھی۔ اس بات نے مجھے ایک نئے ٹریک پر ڈالا۔ دل کی دنیا دریافت کر لینے کے ٹریک پر۔

''باقی واہمات شیاطین ہیں جو آپ کی Concentration (ارتکاز) سے بہکاتے ہیں۔ ان کو رد کر دیجیے' نظر انداز کر دیجیے۔ آہستہ آہستہ آپ ان پر فتح یاب ہو جائیں گی۔''

یوں مجتبیٰ حسین صاحب! میری زندگی کا ایک نیا دور بلکہ آخری دور شروع ہوا۔ مجھ پر توجہ کے

درجے گزرنے لگے اور میں نے دنیا سے دل چھڑا کر دل کی دنیا میں بسنا شروع کر دیا' وقت نے میری Concentration (ارتکاز) اور خود شناسی کے لیے کوشش کا از خود مثبت جواب دینا شروع کر دیا اور جوں جوں میں نے اندر کی دنیا کا مشاہدہ کیا توں توں مجھ پر اپنا آپ منکشف ہوتا گیا۔ اس پر حضرت صاحب کی برموقع باتیں۔

ایک بار مشہور میگزین میں پیراماؤنٹ موویز میں کام کرنے والے کسی خاص کتے کی تصویر دیکھتے ہوئے حضرت صاحب نے فرمایا۔

''کتا شب زندہ دار ہے۔ صابر ہے' محبت شعار ہے۔ یہ صفات انسان میں پیدا ہو جائیں تو وہ ولی ہو جائے۔'' میرا دل کانپا' گویا میں اس کتے سے بھی بدتر ہوں۔ میرا دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے اور زور سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ مگر ایک میرا پرائیویٹ جہنم تھا۔ ذاتی تہہ خانہ جسے نجی کائنات بھی کہا جا سکتا ہے اور وہ اس لیے زیادہ تکلیف دہ تھے کہ ان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملتا تھا۔

حضرت صاحب کے پاس میں نے ایک نئی دنیا دریافت کی۔ دکھوں کی ماری' گناہوں کے گڑھوں میں گری دنیا میں حیران ہوتی تھی کہ لوگ یہاں خود بخود کھنچے چلے آتے تھے۔

''فیض خدا کے بندوں کا وصف ہے' خلقِ خدا کو یہ خود بخود پہنچتا ہے۔'' ایک بار مجھے متذبذب دیکھ کر حضرت صاحب نے یہ گتھی سلجھانے کی بھی کوشش کی۔

''مگر انسانی دماغ بہر حال ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس دماغ کو بلکہ بہت سارے ذہنوں کو قائل اور مطمئن کس طرح کیا جا سکتا ہے'' میں نے دل میں سوچا۔

''آپ بار بار محض اس لیے الجھتی ہیں کیونکہ آپ میٹافزکس کو فزکس میں الجھانے لگتی ہیں۔'' حضرت صاحب نے فرمایا۔

''آپ کو دنیا سے غافل ہو جانا چاہیے۔'' پھر بہت دن بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''مگر ہمارا مذہب اس کی تلقین نہیں کرتا' دنیا کے اندر رہتے ہوئے دنیا سے غافل ہو جانا بھی ایک ریاضت ہے' آپ نے جو کیا' اس میں ایک نادانستہ قدم آپ کو دانستہ کی بھول بھلیوں میں لے گیا اس کا کفارہ تو آپ کو ادا کرنا ہی ہے۔ آپ کا کفارہ یہی ہے دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے غافل ہو جائیے۔ آپ اپنے کام پر جائیے' یوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ دل کی دنیا کیسے کیسے حسین منظروں سے آباد ہے۔ جب آپ کی یہ ریاضت پوری ہو جائے گی تو پھر توبہ کا دروازہ خود بخود کھل جائے گا۔''

میں نے ایک نظر انہیں دیکھا اور میری سمجھ میں آ گیا کہ اب آگے کا ایک خاص عرصہ مجھے کفارہ ادا کرنا ہوگا' راستے اور منزل کی نشاندہی ہو چکی تھی' روشنی کی لکیر بھی اسی راستے پر دور کہیں نظر آ رہی تھی۔ اب بیچ میں کفارے کے سمندر کو عبور کرنا میری سزا تھی۔ میں نے اس کفارے کو ادا کر لینے کا

فیصلہ کیا- حضرت صاحب کے گرد بکھرے گلاب کے پھولوں میں سے چند اٹھائے' جو ان کے عقیدت مندوں نے نذر کیے تھے' وہ مسکرا کر بولے- ''مثال چہرہ پیغمبراں' گلاب کے پھول- گلاب صوفیاء کے نزدیک حسنِ ازل کی نشانی ہیں- اس نے خود انتخاب کیا-''

☆☆

یوں مجتبیٰ حسین صاحب! اس وقت تک کی کہانی ہے-

حضرت صاحب نے فرمایا تھا کہ اس راستے پر چلتے ہوئے میرے سامنے بہت سی پرکشش رکاوٹیں آئیں گی' دنیا نئے نئے رنگ بدل کر اپنی جانب بلائے گی اور میں نے دیکھا کہ ایسا بارہا ہوا- مگر میں رد کرتے ہوئے من کی دنیا میں جیتی رہی- مگر پھر اچانک دنیا ایک بہت ہی خوبصورت لبادہ اوڑھ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی- میں لاکھ بھی آنکھیں میچوں' دھیان ہٹاؤں' یہ دنیا کئی روز سے اچھل اچھل کر میرے سامنے آ جاتی ہے- اس بار یہ دنیا مجتبیٰ حسین صاحب اس بار یہ دنیا آپ ہیں- آپ نے جب سے مجھے اپنی کہانی سنائی ہے- میرے اندر کی عورت چلا چلا کر کہہ رہی ہے-

''تم خوش قسمت ہو عائشہ! ایک شخص نے اپنی زندگی! اپنی پوری کی پوری زندگی تمہاری نذر کر دی' اپنی جوانی تمہاری تلاش اور انتظار میں گزار دی-''

مجھے رہ رہ کر آپ کے الفاظ یاد آتے ہیں- وہ زمانہ جب آپ بک سیلر تھے- آپ نے مجھے دیکھا اور میرا ظاہر' میرا رکھ رکھاؤ اور مہذبانہ انداز' زمانے سے الگ چال چلن' میری انفرادیت' آپ کو اس عائشہ نیازی نے اپنا دیوانہ بنایا' جس کو وقت اور انسانوں نے یہ یقین دلایا تھا کہ اس رنگ ڈھنگ میں اسے کبھی کوئی اچھا موقع فراہم نہیں ہو سکتا- وہ عائشہ نیازی جو یہ سمجھتی تھی کہ وہ دوڑتے زمانے کے ساتھ پیدل چلتے چلتے کبھی بھی اپنے دل کا کوئی شوق پورا نہ کر سکے گی' میرا دنیا دار دل مجھ سے کہتا ہے آنکھ بند کر کے عائشہ اس شخص کے ساتھ چلی جا- تیری زندگی سنور جائے گی مگر کچھ اور ہے جو مجھ سے بہت دن سے یہ خط جو ایک انسانی داستان ہے لکھوا رہا ہے اور اسے لکھتے ہوئے مجھ پر کیا کیا کیفیات گزری ہیں کیا کیا قیامتیں گزری ہیں' ان کا اندازہ میرے اور میرے خدا کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا- مگر یہ ضروری تھا بہت ضروری تھا- اس سے پہلے کہ دنیا ایک بار پھر مجھے اپنی جانب کھینچ لیتی- یہ بہت ضروری تھا کہ اپنی زندگی جس سے نظریں ملائے اور جسے یاد کیے اب تو خود بھی عرصہ دراز گزر چکا اس کو خود بھی یاد کروں اور اس نئی دنیا کا بھی اس سے تعارف کراؤں' پھر اس سارے کا تجزیہ کروں- میرے لیے اب کیا فیصلہ ہونا چاہیے- آپ نے بھی پڑھا ہو گا میں نے اس داستان کے آغاز میں زندگی کے پوشیدہ ڈھانچے نکال کر جھاڑنے پونچھنے سے پہلے خود کو ضمیر کی عدالت میں کھڑا کیا تھا- اس میں اپنا مقدمہ پیش کیا تھا' یہاں پر مدعی' گواہ' منصف اور ملزم سب کے سب میری اپنی ذات تھی-

مجتبیٰ حسین صاحب! میں نے ساری داستان من و عن سنائی اور خود بھی اسے یاد کیا- میں نے اس بار زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلی بار ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کیا- میں جانتی ہوں کہ میری داستان سننے اور پڑھنے والوں کے لیے نئی نہیں ہے- ایسے بے شمار کیسز ہر طرف ہمارے معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں- چھوٹی جگہوں کی لڑکیاں جب بڑے شہروں میں کسی غرض سے جاتی ہیں تو اکثر کے ساتھ ایسی ہی کہانیاں پیش آتی ہیں- کوئی آشنا کے ساتھ فرار حاصل کرتی ہے' کوئی فلم ریڈیو کے راج میں پڑ جاتی ہے' کوئی کسی اور چکر میں پڑ کر زندگی برباد کر لیتی ہے-

مگر اپنے تجزیے کے دوران جب میں نے زندگی کے مقدمے میں اپنے ملزم کو تلاش کیا تو یقین جانیے کہ وہ کہیں نظر نہیں آیا-

کس کو الزام دوں؟ اپنے سوشل سیٹ اپ کو؟ نہیں ہرگز نہیں' یہ سوشل سیٹ اپ تو مجھے مقدر میں اللہ کی رضا کے ساتھ ملا تھا-

ابا کو؟ یہ بھی نہیں' ابا بیچارے تو خود سوسائٹی کے پیراڈوکس کا شکار ہو گئے ایک طرف اولاد کی فطری محبت اور دوسری طرف معاشرتی ناہمواریاں- پھر کس کو؟

شاہ صاحب کو؟ یہ بھی نہیں اس لیے کہ شاہ صاحب کی ترغیب میں نیک نیتی تھی- ایک زندگی کو بنانے اور کچھ پا لینے کی خواہش' ایک مقصد تھا- ان کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی کہ نیک نیتی سے اٹھایا قدم کس منزل کو لے جائے گا-

اس کہانی کے ملزم چچا انور اور اعجاز بھی نہیں ہیں- اس لیے کہ یہ کردار تو ہماری معاشرتی داستانوں کا حصہ بہر حال ہوا ہی کرتے ہیں-

پھر کون؟ تانیہ قدوائی! میرے دل نے اسے ملزم ٹھہرانے سے بھی انکار کر دیا ہے کیونکہ تانیہ قدوائی اگر بہکاوا تھی تو اس میں آنے والی ذات تو میری تھی-

''خدا تعالیٰ نے سب برا بھلا کھول کھول کر بیان کر دیا اور پھر انسان کو عقل سلیم سے نوازا- فیصلہ کرنے کی طاقت سے نوازا-''

اس لیے تانیہ قدوائی ملزم نہیں اور پھر اس کے بعد میں آنے والے لوگ تو ہرگز ہی نہیں' کیونکہ ان کو تو اسی تسلسل سے آ کر اس داستان کا حصہ بننا تھا- ایک نادانستہ قدم کے نتیجے میں دانستہ قدم' و سب تو میرے دانستہ اقدام تھے- پھر ملزم کون ہے- میں نے بار بار اپنے سیاہ کار دل سے پوچھ ہے- پھر ایک چیز سامنے آئی ہے اور وہ یہ کہ اصل ملزم تو میں خود ہوں- اپنے خیالات اور اپنی حدو سے واقف میں ان راستوں کی طرف کیوں بڑھی جو میں جانتی تھی کہ میرے لیے نہیں ہیں' میں نے اس منزل کے حصول کا خواب کیوں دیکھا جو میری منزل نہیں تھی-

یقیناً اس داستان کو پڑھنے اور سننے والے اس کو پڑھ کر سن کر مجھے ہی ملزم گردانیں گے- میں خو

بھی ایک مدت تک ایسا ہی سمجھتی رہی جب ہی تو میں نے خود کو ایک عرصہ پریسکیوٹ کرنے میں گزارا- مگر ایک راز کا پردہ مجھ پر حضرت صاحب کے سامنے افشا ہوا میں اس ایک لمحے میں جان گئی کہ اصل حقیقت وہ تھی جو مجھے اپنی طرف بلاتی تھی- صرف میں حقیقت اور مجاز میں تفریق کو پہچان نہ سکی تھی- اگر مجاز کی طرف بڑھتے ہوئے کوئی اللہ کا بندہ میری راہنمائی کرنے والا ہوتا- اگر ہمارے معاشرے کی بند روایات میں کسی کی بیٹی کو اپنے باپ یا بھائی یا کسی دانشور' مرشد سے اس بات کو اس کیفیت کو ڈسکس کرنے کی گنجائش ہوتی' اگر لڑکیوں کو شروع ہی سے پتا مارنے کی تلقین نہ کی جاتی ہوتی' اگر بچیوں کو پیراڈوکیسکل (Paradoxical) زندگیاں گزارنے پر مجبور نہ کیا جاتا ہوتا تو شاید کم سے کم کوئی عائشہ نیازی جو کسی مجتبیٰ حسین کی آرزوئے اولین تھی کم سے کم وہ لڑکی اس راستے کی طرف نہ بڑھتی جو اس کا نہیں تھا- ایک نادانستہ قدم اسے حقیقت کے بجائے مجاز کی طرف لے گیا اور پھر وہ ہوتا گیا جس کے لیے ایک بھی مہذب لفظ باوجود شدید کوشش کے استعمال نہیں کیا جا سکتا-

مجھے یقین ہے مجتبیٰ حسین صاحب! آپ نے جس عائشہ نیازی کو ''ثبوتِ حق'' سمجھا تھا اور جس کو ''سرابِ مسلسل'' گردانا تھا اس کے بارے میں یہ سب پڑھ کر آپ کو شدید دکھ ہوا ہوگا- میں آپ کے جذبے کی شدت اور حقیقت سے واقف ہوں اور مجھے یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ آپ اپنے جذبے کی صداقت کے صدقے شاید میرے گناہ کے پاتال میں گرے وجود کو اب بھی قبول کر لیں گے- مگر دوسری طرف یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ میں خود کو اپنے گناہ آلود وجود کو آپ کے اور آپ کے عظیم جذبے کے قابل ہرگز نہیں گردان سکتی-

میری زندگی گناہ اور شر سے عبارت ہے میرے حال کو بے بسی' ناامیدی' دکھ' رنج اور تنہائی کے چوہے رفتہ رفتہ کتر رہے ہیں اور پچھتاووں کی دیمک ہے جو نامحسوس طریقے سے مجھے چاٹ رہی ہے- یہ ادھ کتری' دیمک زدہ زندگی آپ کے کس کام آ سکتی ہے' مجتبیٰ حسین صاحب! اور پھر اب تو میں ایک عرصہ سے حالت کفارہ میں ہوں- دنیا سے دل اٹھا کر دل میں دنیا بسا لینے کے پروسیس سے گزر رہی ہوں- نائٹ کلب اور کیسینوز سے نکل کر اگر میں خانقاہ میں پہنچ ہی گئی ہوں تو میرا خیال ہے کہ مجھے یہیں پڑے رہنا چاہیے- پھر مجھے تو معجزاتی طور پر گندے جوہڑ سے نکال کر کسی نیک روح کی دعا کے صدقے خانقاہ میں لایا گیا ہے-

مجتبیٰ حسین صاحب! یہ ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے- ہم سب تمام عمر مختلف پاپرز کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں' ایک وقت میں سب سے بڑا پاپر ہمارا نفس ہوتا ہے- میں نے اس پاپر کے پیچھے چلتے ایک عمر گزار دی- میرے ہاتھ پچھتاوؤں اور رنج وغم کے سوا کچھ نہیں آیا- میں نے ایک گناہ آلود زندگی سے نکلنے کی خاطر خود کو قانون اور شرع کی پناہ دینا چاہی اور آشا چاٹگام والا بن گئی مگر

میرے گناہوں کی سزا کا عمل شروع ہو چکا تھا- منظور سلطان والا فیز میرے کفارے کا ایک حصہ تھا- جس نے میرے سوئے ضمیر کو جگا دیا-

اس کے بعد میرا پاپر بدل گیا اب جس پاپر کے پیچھے میں چلی ہوں آپ سے ملاقات کے بعد میں نے جانا کہ وہ میرا ضمیر تھا- جب ہی پریسکیوشن کے عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے خود کو ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر دیا ہے- ایک بار اس زمانے میں جب آپ ایک بک سیلر تھے' آپ سے گالزوردی کی ''دی جسٹس'' کا ذکر ہوا تھا- اس کتاب کا جج ملزم کو ''سولٹری کنفائنمنٹ'' (Solitary Confinement) کی سزا دیتا ہے- اس وقت میں اس انجام کو پڑھ کر زار زار روئی تھی- اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب میں خود ضمیر کی عدالت میں ملزم بن کر کھڑی ہوں گی اور میرا مصنف مجھے ''سولٹری کنفائنمنٹ (Solitary Confinement) (قید تنہائی) کی سزا سنائے گا-

سو مجتبیٰ حسین صاحب! میں آپ کے جذبوں اور جذبوں سے وفا کو سلیوٹ کرنے کے باوجود اپنے منصف کی سنائی سزا پر سر تسلیم خم کرتی ہوں- یہ میرا سب سے بڑا کفارہ ہے- میرے لیے دعا کیجیے گا کہ یہ جو داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر آپ کی صورت میری زندگی میں اتری ہے' اور جسے دیکھ کر میرے دل نے میرے ضمیر نے مجھے گواہی دے کر بتایا ہے کہ مجھے جس کا انتظار تھا' یہ وہ سحر نہیں- میری زندگی کی نئی سحر اس وقت طلوع ہوگی مجتبیٰ حسین! جب کفارے کی منزل عبور کرنے کے بعد مجھ پر توبہ کا در کھلے گا- مجھے یقین ہے کہ وہ سحر میری زندگی میں ضرور آئے گی کیونکہ اس کا اشارہ مجھے عالمِ ارواح میں موجود میرے پیاروں کی روحوں نے دیا ہے-

آپ اپنے جذبوں کے صدقے مجھ پر ایک احسان یہ ضرور کیجیے گا کہ اس داستان کو پڑھنے کے بعد میرا پیچھا نہ کیجیے گا- کیونکہ ایک عاصی کے اپنے عصیاں سے توبہ میں اسے جو Concentration (ارتکاز) درکار ہوتی ہے- اس میں آپ جیسی پرکشش دنیا بار بار حائل ہوئی- تو اتنے عرصے کی ریاضت اور ارتکاز کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے-

نیاز مند-

عائشہ نیازی المعروف آشا چاٹگام والا-

☆☆

ایک نوٹ از مجتبیٰ حسین

معزز قارئین! یہ داستان حیات جو مجھے لندن میں قیام کے دوران ملی میرے شکوہ رفتہ کے ماتم اور ثبوتِ حق کے سرابِ مسلسل تسلیم کرنے کا جواب ہے- اس داستان کے مطالعے نے ایک بات مجھ پر ثابت کی- عائشہ نیازی جو میری زندگی میں سراب بن کر داخل ہوئی تھی اور تمام عمر وہ سراب

بنی رہی- جس کے تعاقب اور ہاتھ آنے کی خواہش نے میرا سانس پھلا دیا' اسے ایک حقیقی سراب جان کر فراموش کر دینا ہی دانشمندی ہے-

پاکستان ہاؤس کے شعبہ انفارمیشن میں نوکری کے دوران عائشہ نیازی کو دیکھ لینے کے بعد جب میں نے اسے اپنے ہاں انوائیٹ کیا اس وقت تک میں اس کی اس ساری داستان سے بہ زبان اپنے ہم زاد عزیز احمد واقف تھا' میں نے اسے اس کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کے باوجود قبول کرنے کا عہد کر رکھا تھا-

مگر عائشہ نیازی کی داستان کا آخری حصہ میری معلومات کے برعکس اور عزیز احمد کی انفارمیشن میں غیر موجود تھا- گویا وہ کفارے کو اس کے پورے حق سے ادا کر رہی تھی- وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے غافل دل کی دنیا میں بسے منظروں میں زندگی گزار رہی تھی- سو میں نے جانا کہ میرے جذبوں کی اس کی موجودہ کیفیت کے سامنے کیا وقعت ہے- نائٹ کلب اور کیسینوز سے نکل کر خانقاہ میں پہنچے شخص کو وہاں سے نکال کر دوبارہ دنیا کی طرف لے جانے کا حق مجھے ہرگز نہیں ہے- سو میں اپنے عمر بھر کے جذبوں اور تعاقب سے دستبردار ہوا-

مگر عائشہ نیازی کو غالباً یہ یقین نہیں تھا کہ عمر بھر اپنی سوچ سے وفا کرنے والا شخص اس کی آخری درخواست پر توجہ دے گا- سو وہ یہ خط ملنے کے چند دن بعد اپنا ٹھکانا چھوڑ کر نجانے کہاں غائب ہو گئی- تاحال اس کی کچھ خبر نہیں- یہ نوٹ میں اس سارے قصے کے تین سال بعد جون 2000 میں لکھ رہا ہوں-

اس داستان کو آپ بیتی کے انداز میں شائع کروانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے ملک کی معاشرتی ناہمواریوں اور ان کے درمیان زندگی جینے والوں سے یہ پوچھا جائے کہ کیا بھٹکنے والی لڑکیوں اور عائشہ نیازی کے واقعے میں کچھ فرق ہے؟ کیا یہ واقعی حقیقت اور مجاز کی تفریق نہ کر سکنے کا نتیجہ ہے؟ اگر ہے تو پھر عائشہ نیازی کو پہلے مجاز اور پھر سولٹری کنفائنمنٹ (Solitary Confinement) کی طرف دھکیلنے والا کون ہے-

(ختم شد)

آؤ سچ بولیں

وہ صبح بے حد صاف اور نکھری ہوئی تھی' یہ رات بھر کی بارش کا کمال تھا' جو بہت دنوں بعد ٹوٹ کر برسی تھی- صبح تک آسمان صاف ہو چکا تھا مگر ہوا بڑی آہستگی سے چل رہی تھی- اس نے اس دلنواز صبح کو آنکھ کھلتے ہی نماز سے پہلے نہا کر منایا تھا- اور نماز کے بعد باہر لان میں چلی آئی تھی- حیات خان آغا جی کے لیے لان میں کرسیاں اور میز رکھ چکا تھا- میز پر تازہ اخبار پڑے ہوئے تھے اور چائے کا تھرموس بمعہ پیالیوں کے' اس نے کچھ دیر لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے حیات خان کے ڈسپلن پر غور کیا' تازہ ہوا میں چند لمبے سانس لیے اور پھر کرسی پر بیٹھ کر سب سے اوپر والا اخبار کھولا-

''ہر خبر وحشت ناک' منحوس اور فتنے منہ قسم کی-''

ہیڈ لائن پڑھنے کے بعد اس نے فیصلہ دیا اور ایڈیٹوریل نکالا-

''ہر معاملے میں ایڈیٹر صاحب کے مشورے کتنے صائب ہوتے ہیں- کاش یہ کبھی خود کو بھی کسی مقام پر رکھ کر دیکھیں-''

دو چار نظریں مارنے کے بعد اس پر بیزاری سوار ہو گئی اور پھر اس سے اخبار ایک طرف ڈال کر پیالی میں چائے ڈال لی- پہلے سپ سے قبل ہی بیرونی گیٹ کی چوں چوں نے اس کی گردن پیچھے گھما دی- آنے والا جو کوئی بھی تھا اس کے خیال میں بڑے غلط وقت پر آیا تھا- (یہ رائے اس نے بہت بعد میں قائم کی تھی)- رات ہی اس نے فلزا سے لے کر ایک رومانٹک انگلش شارٹ اسٹوری پڑھی تھی اور ذہن میں اس کے ساڑھے چھ فٹ کے گہری براؤن مونچھوں اور بالوں والے بہادر جنگ جو یانہ مین لی (Manly) قسم کے ہیرو کا سراپا چھایا ہوا تھا- گو وہ اتنی غیر منطقی اور بے عقل نہیں تھی کہ ان باتوں کو ذہن پر سوار کر لیتی نہ ہی ایسی کہانیوں کی شوقین تھی-

مگر ایک تو بڑے عرصے کے بعد اس نے ایسی کہانی پڑھی تھی' دوسرے وہ صبح ہی بڑی دلنواز تھی' کچھ دیر تک اس کی پیچھے گھومی گردن پیچھے ہی رہی- ایک- بیگ کندھے پر ڈالے ایک پیچھے گھسیٹتا خود بھی وہ قدم گھسیٹ کر چل رہا تھا- گویا میلوں مسافت پیدل چل کر طے کی ہو- رات کی کہانی اور صبح کی حقیقت میں مماثلت پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے گردن سیدھی کر لی- یقیناً وہ اتنی کمزور احمق بھی نہیں تھی کہ اچانک امڈ آنے والی حیرت کو چھپا نہ سکے- کل' پرسوں اس سے ایک دن پہلے

تک گھر میں کسی فرد نے کسی بھی مہمان کی متوقع آمد کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ضرور یہ مہمان غلطی سے گھر کا رستہ بھول کر ادھر چلا آیا ہوگا' اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ یوں ہو چکا تھا۔

''جاوید ہے یا ابھی نہیں آیا؟'' مگر آنے والے نے اس کے اس خیال کو بغیر سلام دعا اور تمہید کے داغے اس سوال سے غلط ثابت کر دیا۔

''کون سے والے جاوید؟'' وہ حسبِ معمول کبھی نہ چونکنے کا مظاہرہ کرتے ہوئے متانت سے بولی۔

''یہاں کتنے جاوید رہتے ہیں محترمہ؟'' اس شخص کا حلیہ ہی نہیں یہ ہارش قسم کا لہجہ بھی رات کی کہانی کے ہیرو سے ملتا جلتا تھا۔

''اردگرد' دائیں بائیں اتنی کثرت سے جاوید رہتے ہیں کہ بعض اوقات کسی اور گھر میں کوئی جاوید نام کے بندے کو پکارے تو اردگرد سے سات آٹھ جاوید اس امید پر باہر نکل آتے ہیں کہ شاید ان کا کوئی مہمان ہو۔ ممکن ہے آپ کو بھی کوئی مغالطہ ہوا ہو۔'' اس نے مزید متانت اور اطمینان کا مظاہرہ کیا۔

''جی نہیں خاتون' مجھے ہرگز مغالطہ نہیں ہوا۔ میں صحیح گھر میں پہنچا ہوں اور مجھے یہاں پر رہنے والے جاوید سے ہی ملنا ہے' بتائیے' وہ گھر پر ہیں یا نہیں؟'' وہ کچھ دیر آنکھیں سکیڑ کر اس کی بات پر غور کرنے کے بعد بولا۔

''بالفرض وہ گھر پر نہ ہوں تو کیا آپ اپنے سامان سمیت کھڑے کھڑے ہی واپس چلے جائیں گے۔'' اس نے لاشعوری طور پر بحث کرنے کی کوشش کی۔

''خیر آپ کے لئے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ آپ اگر اس گھر میں رہنے والے جاوید سے ملنے آئے ہیں تو وہ گھر میں موجود ہیں۔'' مگر پھر فوراً بات بدل ڈالی۔

''آپ جو کوئی بھی ہیں بے حد باتونی ہیں۔ اور بداخلاق بھی' بغیر یہ خیال کیے کہ میں جس وقت سے آیا ہوں کھڑا ہوں' جاوید پر بلاوجہ طویل بحث کیے جا رہی ہیں۔ یہ بات کہ وہ گھر پر ہے' آپ اس بے مقصد گفتگو کے بغیر بھی بتا سکتی تھیں۔''

پہلی بار پیچھے والے بیگ کے فیتے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ یوں برہمی سے بولا جیسے اپنا وقت ضائع ہو جانے پر اسے سخت افسوس ہوا ہو۔ اور یہ اس کے لیے ایک نیا لقب تھا ''باتونی'' بلکہ یہ الزام تھا وہ ہرگز باتونی نہیں تھی۔ یہ اس کو اچھی طرح جاننے والا قسماً کہہ سکتا تھا' یہ اور بات ہے کہ آج اس کی زبان خوامخواہ پھسل رہی تھی۔

''باتونی ہوں یا نہیں' ایک بات یہ بتا دوں کہ اس قسم کے درشت لہجوں کی عادی ہرگز نہیں ہوں۔'' اس نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور اپنی پیالی اٹھا کر اندر کی طرف چل دی۔

''میں بتا دوں گی' جاوید بھائی کو کہ ان سے کوئی بااخلاق صاحب ملنے آئے ہیں۔''

جاتے جاتے مڑ کر اس نے احسان جتانے کے سے انداز میں کہا۔ اور محسوس کیا کہ وہ اسی کی

طرف دیکھ رہا تھا گو اسے یقین تھا کہ ایسی سرسری نظریں لگا نہیں کرتیں پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر پشت پر بکھرے بالوں پر ڈوپٹہ ڈالتے ہوئے اندر کو بھاگی۔

ہاں یہ تو ٹھیک تھا کہ صبح ہی صبح اتنی حیران کن مماثلت اسے بری طرح چونکا گئی تھی اور اندر آ کر جاوید بھائی کو بتانے اور پھر گھر میں اِدھر اُدھر کے مختلف کام بلاوجہ نمٹانے کے چکر میں ذہن پر چھائی بھی رہی تھی' مگر اس وقت وہ بڑے مطمئن انداز میں کچن میں بیٹھی حیات خان سے بل والے پراٹھے بنانے سیکھ رہی تھی۔

گھر میں مختلف کونوں سے ہلکے ہلکے شور کی آوازیں آ رہی تھیں' گویا آہستہ آہستہ سب لوگ اٹھنا شروع ہو چکے تھے' سب سے بلند آواز شبر کی تھی جو صبح ہی صبح قاری صاحب کی آمد پر ناراض تھا اور جسے ناہید بھابی اب ڈنڈے کے زور پر باہر چھوڑ آنے کی دھمکی دے رہی تھیں۔

''ہر چیز پہلی بار سیکھنے سے پتا نہیں کیوں کسی بھی نارمل انسان کو الجھن سی ہی محسوس ہوتی ہے۔ خواہ وہ چیز آئندہ چل کر زندہ کا قاعدہ اور قرینہ ہی کیوں نہ بن جائے۔''

شبر کو دروازوں اور کرسیوں کو ٹھڈے مارتے سنتے ہوئے اس نے سوچا اور پھر نظریں حیات خان کے ماہر ہاتھوں پر جما دیں۔ آٹے کا پیڑا کاٹ کر وہ ہاتھوں سے اسے لمبا کرتا دونوں جانب گھی لگا کر خشک آٹے میں لتھیڑتا اور پھر اسے گھما گھما کر مہارت سے بل دیتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بلوں والا پیڑا پھیلی ہوئی گول شکل میں توے پر موجود ہوتا۔ ''بھئی اتنی تیزی سے کیوں کرتے ہو' کچھ سمجھ میں بھی آنے نہیں دیتے۔''

اس نے جھنجھلا کر کہا اور آگے بڑھ آئی۔

''لاؤ ایک میں خود بناتی ہوں۔'' اس نے گُندھے آٹے میں ہاتھ ڈالا اور مشق کرنے لگی۔

''پیڑا نہ ہوا پہاڑی راستہ ہو گیا' چکر ہی چکر۔''

کچھ دیر بعد اپنا شاہکار توے پر پڑا دیکھ کر اس نے کہا۔ اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے لیے اور کوئی الفاظ جو نہ ملے تھے۔ آملیٹ کے لیے مرچیں اور پیاز کاٹتا حیات خان باچھیں پھیلا کر ہنس رہا تھا۔

''ارے ابھی ناشتا بنا نہیں'' .... تیزی سے فلزا اندر آئی۔

''تمہیں معلوم نہیں حیات خان' سعد آیا ہے' اس کے لئے ٹوسٹ سینکے جائیں گے' اور ہے آملیٹ بھی علیحدہ سے بنے گا۔ ہلکے نمک مرچ والا اور وہ بھی کارن آئل میں۔ اچھا چلو چھوڑو' میں خود بناتی ہوں۔''

اس نے اپنی روایتی پھرتی سے ایک کے بعد ایک کیبنٹ کھولنا شروع کی' ٹوسٹر میں ٹوسٹ ڈالے اور پیالے میں انڈے پھینٹنے لگی۔ اور وہ اسے اس پھرتی سے ادھر ادھر گھومتا دیکھ کر یہ سوچتی رہی کہ آخر وہ کون سی اہم شخصیت آئی تھی جس کے لیے فلزا وقار نے نہ صرف یہ کہ اتنی صبح بستر چھوڑنا گوارا کر لیا تھا۔ بلکہ ناشتا بھی خود بنا رہی تھی' اور یہ کہ کیا آنے والی اہم شخصیت ڈائٹنگ پر تھی۔ جو کم نمک مرچ والا کارن آئل میں فرائی کیا ہوا آملیٹ اور دو عدد سوکھے ٹوسٹ جیسی خوراک پر گزارا کرے گی۔

''تمہیں معلوم ہے' سعد عالم آیا ہے-''

پھر فلزا نے خود ہی فرائی پین سے ہلکا براؤن آملیٹ پلیٹ میں نکالتے ہوئے اس راز سے پردہ اٹھایا- ''تمہیں معلوم ہی ہوگا چھوٹی پھوپھو کا دیور ہے نا جاوید بھائی کا دوست ہے- دونوں نے اکٹھے ہی آرکیٹیکچر کیا ہے- یہ آج کل لاہور میں ہوتا ہے- کسی غیر ملکی فرم کے ساتھ کام کر رہا ہے' بے حد ہینڈسم اور شاندار ہے' اور باتیں تو اس قدر خوبصورت کرتا ہے کہ بندہ سنتا چلا جائے اور کبھی بور نہ ہو- تم نے دیکھا ہی ہوگا شاہد بھائی کی شادی پر-''

نہیں' اس نے ہرگز نہیں دیکھا تھا- اور اگر دیکھا بھی ہو تو ہر دیکھا گیا چہرا یاد تو نہیں رہ جاتا' مگر اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کوئی بے حد ہی خاص بندہ ہوگا جس کی تعریفوں میں فلزا وقار رطب اللسان تھی- ورنہ عموماً تو اسے کوئی بھی شخص اپنے معیار کے مطابق نظر نہیں آتا تھا-

''اچھا تو یہ ہیں سعد عالم صاحب-'' ناشتے کی میز پر آخری کرسی پر' کرسی کی پشت سے تقریباً ڈیڑھ فٹ اوپر موجود چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا- فلزا خاص اس کا ناشتا اس کے سامنے سجاتے ہوئے اس سے بار بار اصرار کے ساتھ کہے جا رہی تھی کہ وہ سب اسے ہی کھانا ہے مگر تائی اماں کے لیے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کن اکھیوں سے اس نے دیکھا- وہ خاص اپنے لیے بنایا ناشتا ایک طرف ہٹاتا پراٹھوں کی پلیٹ کی جانب ہاتھ بڑھا رہا تھا- اور اس پلیٹ میں اب جو پراٹھا سب سے اوپر تھا وہ اس کا شاہکار تھا- معلوم نہیں حیات خان نے اس کو پلیٹ میں کیوں رکھ دیا تھا جبکہ اس کا ارادہ اس کو صفائی والے بابا یا پھر برتن دھونے والی مائی کے لیے پار کر دینے کا تھا- مگر....''دانے دانے پر کھانے والے کا نام ضرور لکھا ہوتا ہے-''

اس نے یقین سے سوچا- یہاں تک تو ٹھیک تھا' مگر.... حیات خان نے کچن سے آمد کے ساتھ ہی آغا جی سے گفتگو کرنا شروع کر دی-

''آہو جی.... یہ پراٹھا اپنی سارا بی بی نے آج خود بنایا ہے- پیڑا ٹھیک نہیں بنا تو کہنے لگیں- پیڑا نہ ہوا پہاڑی راستہ ہو گیا- چکر پر چکر' میں نے سوچا- بڑے صاحب کو کھلاؤں گا' پر یہ تو جی سعد صاحب کے حصے میں آ گیا- کہتے ہیں نا- مہر لگی ہوتی ہے کھانے والے نام کی-''

''واہ سارا.... کون کہے گا تم نے بی- اے میں فائن آرٹس پڑھا تھا-''

ناہید بھابی نے ایک نظر سعد عالم کی پلیٹ پر ڈال کر اس کو مخاطب کیا- اس نے دیکھا' کھانے والے کے چہرے پر ایک لمحہ کو ہلکی سی مسکراہٹ آئی جو اس نے گھنی مونچھوں تلے دبا لی-

''لو نا سعد! یہ آملیٹ خاص طور سے تمہارے لیے بنا ہے' کم نمک مرچ والا-''

وہ فلزا کی طرف متوجہ ہوا- جو اپنی محنت اکارت جاتے ہوئے دیکھ کر سخت جھنجھلا گئی تھی- لیکن پھر بھی ایک کوشش اور سہی کے طور پر آملیٹ اس کی پلیٹ میں ڈالنے کو تیار تھی-

''نہیں بھئی-'' اس نے ہاتھ سے اس کو روکا- ''اب میرا بلڈ پریشر نارمل ہے' وہ تو اس وقت اس

حادثے کی وجہ سے بڑھ گیا تھا- تو میں نے احتیاط کرنا شروع کر دی تھی' اور پھر اب ان گرما گرم پراٹھوں اور مزیدار آملیٹ کو دیکھ کر تو ویسے بھی ہر قسم کی احتیاط چھوڑ دینے کو دل چاہ سکتا ہے-''

اس نے ایک بار پھر اچٹتی سی نظر سارا پر اور پھر اپنے پراٹھے پر ڈالتے ہوئے کہا- فلزا نے پٹخ دینے کے سے انداز میں پلیٹ میز پر رکھی اور فلاسک گھسیٹ کر پیالی میں چائے انڈیلنے لگی-

''چینی بھی شروع کر لی یا نہیں-''.... اس نے دوبارہ سے آواز میں شیرینی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا-

''کون- یہ چائے میرے لیے بنائی ہے؟'' اس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے چونک کر کہا-

''نہیں بھئی' میں دیکھ رہا ہوں' اس طرف والی فلاسک میں چائے زیادہ تیز ہے' چینی ویسے میں اب بھی نہیں پیتا-''

''سارا' پلیز بیٹا! سعد کے لیے چائے بناؤ-'' تائی جان نے فالتو برتن اٹھا کر حیات خان کو دیتے ہوئے کہا' اور فلزا گویا بالکل ہی بے حال ہو گئی تھی- اس نے سکون سے قہوہ انڈیلا' دانستہ کم دودھ ڈالا' اور پیالی فلزا کے پاس رکھ کر ''ذرا آگے کر دو-'' کہتی باہر نکل آئی-

''لو بھئی' اب اس میں میرا کیا قصور-''

اس روز تمام وقت فلزا کے خود سے ناراض ناراض رہنے پر اس نے سوچا- ''اب اگر کسی کا کولیسٹرول لیول بالکل درست ہو' بی پی نارمل ہو اور وہ ہرگز موٹاپے کی طرف مائل نہ ہو تو پھر خوش خوراک ہونے کی حیثیت میں اس کو حق ہے جو دل چاہے کھائے' اب کسی کی مرضی پر آپ کا کیا اختیار اور پھر میں تو اس کو ہرگز یہ کہنے نہیں گئی تھی کہ بندہ خدا میرا بنایا شاہکار کھاؤ اور مجھے مسکرا مسکرا کر چڑاؤ- میں تو خود صبح سے سخت اپ سیٹ ہوں کیا ہوتا جو رات کو وہ کہانی نہ پڑھی ہوتی یا پھر صبح ہی صبح یہ نہ آ دھمکا ہوتا-''

اگلے دو تین دنوں میں وہ اس گھر کی آب و ہوا میں خاصا رچ چکا تھا- چھوٹی پھوپھو کا دیور ہونے کی حیثیت میں کم اور تائی جان کی دیرینہ دوست کا بیٹا اور جاوید بھائی کا کلاس فیلو ہونے کی حیثیت میں زیادہ- وہ پہلے ہی اس گھر کے لیے اجنبی نہیں تھا- مگر اس کے لیے وہ ایک نیا بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد اور نہ سمجھ میں آنے والے شخص کی حیثیت میں خاصا اجنبی اور مشکل ثابت ہوا- اگلے کچھ دنوں میں اس سے کئی بار مڈ بھیڑ ہونے کے علاوہ ایک دو بار بلاوجہ سخت قسم کے جملوں کے تبادلے کے باوجود پہلے دن کی وہ اولین حقیقت اپنی جگہ قائم رہی تھی- وہ اسے ایک رات پہلے پڑھی کہانی کے ہیرو سے مماثل لگا تھا- اور اس نے اپنی آمد کے ساتھ ہی اس کے بائیس سالہ محتاط اور محفوظ ذہن کو بری طرح اپ سیٹ کر دیا تھا- اور بعض حقیقتیں اتنی ٹھوس اور اپنی جگہ قائم رہنے والی ہوتی ہیں کہ انسان کی عقل اور استدلال ان کو جھٹلانے میں ہمیشہ ناکام رہتی ہے-

مگر انہی دنوں میں اس کو ایک خیال نے بری طرح آ گھیرا' شروع سے ہی اس کے ساتھ یہ المیہ

رہا تھا کہ اسے جو بھی چیز اپنے لیے بے اختیار پسند آتی' اس کے بارے میں جلد ہی اس پر انکشاف ہوتا کہ اس کو پہلے سے کوئی اپنے لیے پسند کر چکا ہے- کوئی کپڑا' کوئی جوتا' کوئی کتاب' قلم' جیولری غرض استعمال میں آنے والی ہر ایسی چیز جس کی اکثر ضرورت پڑتی رہتی ہے- یہ نہیں تھا کہ یہ چیزیں یا ان کے ساتھ کی کوئی اور چیز مارکیٹ میں ایک ہی دفعہ آنے کے بعد نایاب ہو جاتی تھی- لیکن ایک دفعہ اپنے کسی ارد گرد کے بندے کے پاس وہ چیز دیکھ کر لاشعوری طور پر اس کے دل سے اتر جاتی- ''میں نے بھی لے لی تو چیز کا نیا پن ختم ہو جائے گا-'' وہ کہتی یا پھر یہ کہ-

''دوسرے کی پسند کی ہوئی چیز پر میرا کیا حق-''

وہ بڑی فراخ دلی سے اپنی پسند سے دستبردار ہو جایا کرتی تھی-

مگر اب کے بات نئی تھی' اب اس کے ذہن پر پہلی نظر نے جو خیال آسیب کی طرح سوار کیا تھا- وہ کسی چیز کے بارے میں نہیں تھا- ایک جیتے جاگتے انسان کے بارے میں تھا- اور یہ ایک ایسی جنس تھی' جس کے ساتھ کا دوسرا پیس مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہو سکتا تھا جو..... وہ دل کی تسلی کی خاطر لے کر رکھ لیتی-

اسی لیے تو یہ بات جاننے کے بعد کہ اس شخص پر اس سے پہلے ہی فلزا کی خاصی گہری نظر پڑ چکی ہے' وہ اپنے اس اولین احساس کو جھٹلا نہیں سکی- اس نے خود کو منطق سے دلائل دے دے کر قائل کرنا چاہا مگر اپنا آپ ہر دم بے بس ہی لگا- یہ اور بات تھی کہ جو کچھ بھی تھا' وہ بہرحال- سارا حسن تھی- جو اپنی سوچ' جذبات اور کیفیات چھپا لینے میں ملکہ رکھتی تھی اور اسے خود پر اتنا کنٹرول حاصل تھا کہ کوئی دوسرا انسان تو کیا پاس گزرتی ہوا بھی اس کے دل کا اور ذہن کی سوچ کا پتا نہیں پا سکتی تھی- اس کے اندر کی دنیا اتنے دبیز پردوں تلے چھپی تھی کہ وہاں چڑیا کا بھی پر مارنا مشکل تھا- اسی لیے تو وہ اس شخص سعد عالم کو سامنے موجود پا کر بھی اپنی کیفیت اندر چھپائے بے حد بے نیازی اور رسان سے گفتگو کرتی' نارمل انداز میں ادھر ادھر کے کام نپٹاتی پھرتی-

مگر رفتہ رفتہ اس پر یہ راز آشکار ہونے لگا کہ خود کو دھوکا دینا ایک انتہائی مشکل عمل ہوا کرتا ہے- تنہائی میں یہ احساس اس کے گرد بڑی مضبوطی سے اپنا جال بنتا کہ آج تک اس نے صنفِ مخالف میں ایک مثالی شخص کے لیے جو خوبیاں اپنے ذہن میں دفن کر رکھی تھیں' ان میں سے بیشتر پر وہ شخص سعد عالم سو فیصد پورا اترتا تھا- اور یہ کہ وہ خواہش کے باوجود اپنے ذہن سے یہ بات نہیں نکال سکے گی' کہ اس شخص نے پہلی ہی نظر میں اسے بری طرح چونکا دیا تھا- اور اب اس کی نشست و برخاست اور دیگر مینرز و عادات نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ جو تصور انسان اپنے ذہن میں قائم کرتا ہے' وہ کبھی کبھار بہت ہی غیر متوقع طور پر حقیقت بھی بن سکتا ہے-

''مگر کیسے؟'' اس نے خود سے سوال کیا-

''یوں تو کوئی ہرگز نہ چاہتا ہوگا-''

وہ سعد عالم تھا جو چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا' مگر وہیں پر فلزا وقار بھی تھی' جو اس سے اپنی چیز کا سا برتاؤ کرتی تھی- گویا پہلے آیئے' پہلے پایئے کا سا معاملہ تھا' یہ اور بات ہے کہ اتنے دن میں وہ باوجود کوشش کے یہ اندازہ نہ کر سکی کہ سعد عالم کا رویہ فلزا کے ساتھ..... کیسا تھا کیا وہ پایا جا چکا تھا' یا یہ آکشن (نیلام) ابھی جاری تھا-

''ظاہر ہے کہ فلزا کی چکا چوند کر دینے والی شخصیت کے سامنے وہ کیا چیز ہے' جب ہی تو اس شخص کا لہجہ باقی سب کے ساتھ اتنا تمسخرانہ ہوتا ہے-'' پھر اس نے گویا خود ہی..... شکست مانتے ہوئے فیصلہ سنایا' جبکہ اسے یہ خلش بھی بری طرح ستا رہی تھی کہ صرف ایک شخص کے سامنے اس کی اپنی شخصیت اتنی دب سی جائے کہ وہ اس کے لیے اکیلے ہی میں سہی احمقانہ باتیں سوچنے لگے- جو بھی تھا' وہ اس سارے معاملے پر بہرحال خود سے بے حد ناراض تھی' اسی لیے اس نے واپس پنڈی چلے آنے کا فیصلہ کیا- مگر یہ بھی اس کی قسمت تھی کہ جس دن وہ ایبٹ آباد پہنچی تھی اسی دن سے اس نے مانسہرہ اور شنکیاری جانے کا ہنگامہ مچایا ہوا تھا-

شنکیاری میں منجھلی پھوپھو کے میاں کی ان دنوں پوسٹنگ تھی- اور مانسہرہ میں تائی جان کے بھائی رہتے تھے- اور اب اچانک جاوید بھائی نے ان دونوں جگہوں پر جانے کے انتظامات مکمل ہو جانے کی خبر دی تھی-

''لیکن مجھے واپس جانا ہے' میری چھٹیاں ختم ہونے میں بس تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں-'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی انکار کیا-

''یہ سب پروگرام تمہاری ہی وجہ سے بنا ہے' لہٰذا اب انکار کی گنجائش ہرگز نہیں ہے-'' جاوید بھائی نے سختی سے کہا-

''اور ویسے بھی یہ سب آگے جائیں گے تو تمہیں واپس چھوڑ کر آنے والا کون ہوگا- جاوید کی چھٹی ختم ہوگی تو اس کے ساتھ ہی چلی جانا-''

تائی جان نے آرام سے سمجھایا- اور باقی سب لوگ' تم نے ہی تو کہا تھا کہ رٹ لگاتے رہے-

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بات کر کے پھنس جاؤں گی' مجھے کیا معلوم تھا کہ ناگہانی مصیبت بن کر یہ شخص یہاں نازل ہوگا- اور میرے بنائے ہوئے پروگرام میں یوں آگے آگے ہوگا- جیسے اس کی تجویز ہو-'' اس نے جھنجھلاتے ہوئے سوچا' اور اپنے کپڑے چھوٹے بیگ میں گھسانے لگی-

اب یہ بھی اس کی قسمت کا کرشمہ تھا کہ وہ دانستہ اس جیپ میں بیٹھی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اسے جاوید بھائی ہی ڈرائیو کریں گے' مگر چلنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی جاوید بھائی کلائی میں موچ آ جانے کا عذر پیش کر کے فرنٹ سیٹ پر بصد اطمینان براجمان ہو گئے' اور سعد عالم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی-

''افوہ- اب یہ اچھا خاصا سفر ایک نئی کشمکش میں گزرے گا-''

اس نے بیزاری سے سوچا- اور عین اسی لمحے فلزا بھاگتی ہوئی آئی اور شبر کو نکال کر شاہد بھائی کی گاڑی میں بٹھا کر تقریباً گھس جانے کے سے انداز میں جیپ میں داخل ہوگئی-

''مانا تم بہت دھان پان ہو فلزا! مگر شبر بھی تم سے کم ہی جگہ گھیرتا ہوگا-'' سعد عالم نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے زیرِ لب مسکرا کر کہا-

''بس-'' فلزا نے شانے اچکائے-''بزرگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تو بہتر ہے کہ انسان کہیں نہ جائے-''

''اچھا!'' اس نے ذرا مڑ کر دیکھا-''یاد رکھو' ایک وقت میں تم کو بھی بزرگ بننا ہے-''

''تم دیکھنا اور یاد کرنا کہ میں کس قسم کی بزرگ بنوں گی-'' فلزا مسکرا کر جواب دے رہی تھی-

''دیکھنا کیا اور یاد کرنا کیا' میں تو ابھی سے پیش گوئی کر سکتا ہوں' حال بھی مستقبل کا ہی آئینہ ہوتا ہے-'' اب کے اس کا انداز مذاق اڑانے کا سا تھا-

''تم کیا جانو' میرا حال کیا ہے-'' فلزا نے جواب میں ایک ذو معنی سی بات کہی اور پھر سن گلاسز آنکھوں پر چڑھا کر باہر دیکھنے لگی-

''کبھی تم لوگوں کی آپس کی بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور پھر بھی کیے جاتے ہو-'' جاوید بھائی نے کلائی دباتے ہوئے کہا-

''محض حاضرین کی دلچسپی کے لیے-'' وہ موڑ کاٹتا ہوا ہنسا-''یہ اور بات ہے کہ بعض حاضرین اتنے بور اور ڈل ہوتے ہیں کہ بحث میں مزا نہیں رہتا-''

اس نے بیک ویو مرر ٹھیک کرنے کے بہانے ذرا سا سارا کی طرف موڑا- اور ایک نظر ڈالنے کے بعد اس کا زاویہ درست کر لیا-

وہ نظر انداز کر دینے اور لاپروائی برتنے کا تہیہ کر کے گھر سے چلی تھی' اس لیے نوٹس لیے بغیر تائی جان کا بیگ ٹٹولنے لگی-

وہ دن دلچسپ اور پرلطف تھے جو مانسہرہ اور شنکیاری میں گزرے' مگر اس سارے ہنگامے سے محفوظ ہوتے ہوئے بھی اس کے ذہن اور دل پر ایک نامعلوم اداسی سی چھائی رہی اور ایسا صرف فلزا کے رویے کی وجہ سے تھا' یہ بات وہ طے کر چکی تھی- بات بے بات' جگہ بے جگہ فلزا اسے یہ احساس دلانا اپنا فرض سمجھ رہی تھی کہ سعد عالم گویا دنیا میں آیا ہی اس کے لیے ہے- اور اگر غلطی سے اس کے دل میں کوئی خوش فہمی بیٹھنے لگے تو وہ اس کو نکال پھینکے-

وہ اتنی گئی گزری تو ہرگز نہ تھی' بلکہ اس کو اپنی فراخدلی پر بڑا بھروسا تھا اور جہاں کہیں اسے اپنی انا اور خودداری پر زد پڑتی نظر آتی تھی' وہاں اسے سوائے اپنے بچاؤ کے دوسرا کوئی احساس پیارا نہیں ہوتا تھا- پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس حقیقت کو مان لے کہ کوئی چیز اس کی رسائی سے بالکل باہر ہے' وہ پھر بھی اس کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتی رہے- مگر اسے فلزا سے بھی ایسی کمینگی کی توقع نہیں تھی-

''سعد کا خیال ہے کہ تم ایک بور اور غیر دلچسپ لڑکی ہو-'' وہ اس کے کان میں بار بار یہ خبر

انڈیلتی-

''کل ہم لوگ ارتقاء کے مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے' تم یوں خاموش بیٹھی تھیں' جیسے اس بارے میں کچھ جانتی ہی نہ ہو- کیا تم واقعی کچھ نہیں جانتیں؟''

ایک روز اس نے پوچھا-

''سعد کہہ رہا تھا کہ اسے پڑھے لکھے جاہل قطعی اچھے نہیں لگتے-'' یا پھر یہ کہ-

''بھئی' تم عجیب لڑکی ہو' معاف کرنا- تمہیں پہننے اوڑھنے کا بھی کچھ ایسا سلیقہ نہیں ہے' رات سعد کہہ رہا تھا کہ سارا کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے' جیسے کوئی قبرستان سے اٹھ کر زندوں کی دنیا میں آ گیا ہو-''

''ہر شخص کے اپنے تصورات ہوتے ہیں' اور خیالات بھی اور ضروری نہیں کہ ہر دوسرا شخص ان تصورات اور خیالات پر پورا اترتا ہو' لیکن میں یہ ہرگز پسند نہیں کرتی کہ کوئی شخص بلاوجہ میری شخصیت کو اپنا موضوع بنا کر خیالات کا اظہار کرتا پھرے' اور وہ بھی میری غیر موجودگی میں' یہ بھی تم ہی ان سے کہہ دینا-''

ایک دن اس نے چڑ کر فلزا کو جواب دیا- جو اسے یقین تھا کہ آگے پہنچ چکا ہوگا-

اور یقیناً ہونا تو یہ ہی چاہیے تھا کہ ان احمقانہ ریمارکس پر اسے اس شخص سے سخت چڑ بلکہ نفرت ہو جاتی' مگر وہ اپنے اس اولین احساس کو کچھ اتنا کامیابی سے دبانے میں ناکام ہو رہی تھی' اسی لیے وقت گزرنے کا انتظار کرتی رہی-

وہ شنکیاری میں ان کا آخری دن تھا- منجھلی پھوپھو ان کے لیے الوداعی ڈنر کے انتظامات میں مصروف تھیں- جاوید بھائی نے شام ہی سے سُم کا ایک چکر لگا آنے کا شور مچایا ہوا تھا- اور انہی کے اصرار پر وہ بھی بادل نخواستہ کچن چھوڑ کر باہر نکلی تھی' راستے بھر اسے فلزا کی چہچہاٹیں بور کرتی رہیں-

''ضروری تو نہیں کہ ہر بات اور ہر رویہ ہر جگہ ہی اچھا لگے-''

اس نے بیزاری سے سوچا- اور جب وہ لوگ سُم پہنچ کر فوٹو گرافی میں مصروف تھے' وہ خاموشی سے ایک طرف پڑے بڑے سے پتھر پر بیٹھی دریائے سرن کے تسلسل اور خاموشی سے بہتے پانیوں کو دیکھتی رہی-

''آپ غالباً پہلے دن سے مجھ سے ناراض ہیں' اور اب تک اس ناراضگی کو دل سے نکال نہیں پائیں-''

اسے پتا نہیں چلا کب وہ باقی سب کو مصروف چھوڑ کر اس کی طرف آیا تھا- اس نے چونک کر اسے دیکھا-

''پہلے دن سے ناراض-'' اسے اس غلط فہمی پر دل میں بے اختیار ہنسی آ گئی-

''جی نہیں...'' پھر اس نے سنجیدگی سے جواب دیا-''ایسی کوئی بات نہیں-''

''یقین کیجیے' اس روز میں تھکا ہوا تھا اور خاصا لمبا سفر کر کے آیا تھا اسی لیے آپ کو بداخلاق کہہ بیٹھا' گو اتنے دنوں میں' میں آپ کے بارے میں اس ریمارک کی نفی ڈھونڈ نہیں پایا' پھر بھی اس پر

معذرت خواہ ہوں-'' وہ اس کے سامنے زمین پر ہی بیٹھ گیا-

''معذرت خواہ ہونے کی کیا ضرورت ہے' بہت ممکن ہے' آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں- جبکہ آپ کو یقین ہے کہ آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے-''

اس نے قدرے درشتگی سے جواب دیا-

''ہاں! مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ آپ نے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی- بلکہ آپ کے رویے نے اس کو مزید تقویت پہنچائی ہے- پھر بھی کوئی بات ناممکن نہیں ہوا کرتی' شاید....آپ پوز کر رہی ہوں' اپنے گرد بداخلاقی کی باڑھ کھڑی کر کے لوگوں سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہوں' یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے بارے میں میرے سارے ہی اندازے غلط ہوں-

آفٹر آل ہیں تو یہ ایک عام سے انسان کے اندازے ہی-'' وہ مسکرایا-

''خیر کہنا دراصل یہ تھا کہ کیوں میری وجہ سے اپنا وقت اور مزا خراب کر رہی ہیں' یوں سمجھیے کہ میں ہوں ہی نہیں' اور اپنے کزنز کے ساتھ انجوائے کیجیے- میں اس بات کو کچھ اتنا اچھا نہیں سمجھتا کہ میں کسی کی تفریح میں بھنگ ڈالنے کا ذریعہ بنوں-''

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا-

''اف سعد! ذرا ادھر آؤ میں تمہیں وہاں کا منظر دکھاؤں اف اس قدر نیچرل بیوٹی کہ-''

فلزا کی نظر ادھر کے منظر پر کیا پڑی کہ اسے پتنگے ہی لگ گئے- وہ جھپٹنے کے سے انداز میں اس کا بازو پکڑ کر اسے دوسری جانب گھسیٹتے ہوئے بولی-

''تم کیا جانو فلزا بی بی!'' اس نے دل میں ہنستے ہوئے سوچا- ''کہ جب تک میں خود نہ چاہوں- مجھے کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا-'' پھر اس نے پانی کی طرف گردن موڑی-

''اور آپ کیا جانیں سعد عالم صاحب کی بداخلاقی بھی بعض اوقات کتنی بڑی نعمت بن جاتی ہے' خصوصاً اس وقت جب انسان اپنے ہر احساس کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں دفن کر دینے کا خواہش مند ہو-''

''آج مجھے علم ہوا کہ کسی مخاطب سے براہ راست بات کرنے میں کتنا مزا ہے- ان ڈائریکٹ اشاروں کنایوں میں اپنا موقف پیش کرنا کچھ اتنا سود مند ثابت نہیں ہوتا-''

واپسی پر سعد نے جاوید بھائی کی کسی بات کے جواب میں کہا تو وہ جو سارا راستہ نیم مندی آنکھوں سے بیٹھی رہی تھی' اچانک چونک کر سیدھی ہو گئی- ایک لمحے کے لیے اس نے پیچھے مڑ کر مسکرا کر دیکھا اور پھر سیدھا ہو گیا-

''کس سے براہ راست مخاطب ہوئے بھائی؟ اور یہ اشاروں کنایوں میں کس سے گفتگو کرتے رہے ہو؟ یقیناً ہم میں سے کوئی بھی گونگا اور بہرا نہیں ہے-''

''ہے نا یار تمہیں کچھ علم نہیں' ضروری نہیں کہ انسان قدرتی طور پر ہی گونگا اور بہرا....ہو کچھ لوگ ویسے ہی کانوں کے سوئچ آف رکھتے ہیں' اور زبان کو سی لیتے ہیں- روٹیاں لینی ہیں' آنٹی نے کہا تھا-''

بات کرتے کرتے اس نے اچانک ہی گفتگو کا رخ موڑا اور جاوید بھائی کے گاڑی روکنے پر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا- فلزا نے گردن دائیں جانب گھما کر ایک چبھتی ہوئی تمسخرانہ نظر اس پر ڈالی-

''اور سن لو اپنے بارے میں نادر خیالات؟'' اس کی آنکھیں کچھ ایسی ہی بات کہہ رہی تھیں جبکہ اس کا اپنا جسم تھکا ہوا تھا- اور ذہن غیر حاضر' وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے پاؤں اگلی سیٹ سے ٹکائے نیم کھلی آنکھوں سے تنور والے کو سرخ سرخ کناروں والی موٹی روٹیاں اتارتے دیکھتی رہی-

ایبٹ آباد واپسی کے فوراً بعد ہی اس نے پنڈی جانے کا شور مچا دیا- اس کے اتنی جلدی مچانے پر جاوید بھائی نے اپنی تین چھٹیوں کی قربانی دینا گوارا کیا اور وہ دھڑا دھڑ تیاریوں میں مصروف ہو گئی اور واپسی سے ایک دن قبل جب شاہد بھائی ان کو پی ایم اے روڈ واک کے لیے لے گئے' اس نے محسوس کیا کہ وہ دانستہ آہستہ قدموں سے چل رہا تھا- اور جونہی وہ بھابی سے بات کرتے کرتے ذرا سا پیچھے ہٹی' وہ تیزی سے دو قدم چل کر اس کے ساتھ آ ملا-

''اب آپ ذرا آہستہ ہی چلیں گی....'' وہ آہستہ آواز میں بولا-

''کیوں بھئی؟'' اس نے اس کا تحکمانہ لہجہ محسوس کرنے کے باوجود آرام سے پوچھا-

''بس یونہی' ضروری تو نہیں کہ آپ سارا دن جن کے گلے کا ہار بنی رہتی ہیں' اس وقت بھی انہی کے ساتھ چمٹی رہیں' مانا کہ میرا وجود آپ کے لیے باعث آزار ہے- مگر پھر بھی میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہوں گا-''

اس نے ایک نظر اپنے سے آٹھ دس قدم آگے چلتی بھابی پر ڈالی- وہ شبرا اور انیقہ کو ساتھ لے آنے پر جھنجھلا رہی تھیں اور بار بار شاہد بھائی کو اپنی جانب متوجہ کر کے ان سے انیقہ کی پُش چیئر پکڑ لینے کو کہہ رہی تھیں- شاہد بھائی اور جاوید بھائی کوئی بہت ہی گمبھیر اقتصادی مسئلہ حل کر رہے تھے' اور ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ فلزا شدید فلو کی وجہ سے آج گھر سے نہیں نکلی تھی-

''آپ سے دن بھر مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہتی ہے-'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جان چھڑانے کی کوشش کی-

''مختلف' مو....ضو....عا....ت-'' اس نے لفظ کے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا-

''دنیا کی سیاست' اقتصادی مسائل- ہالی وڈ کی فلمیں' گرین پیس کے مشن' نصرت فتح علی خان' ٹی وی کے ڈرامے' ہا....یہ آپ کے خیال میں موضوعات ہیں-''

''جی ہاں- یقیناً....'' اس نے متاثر ہوئے بغیر جواب دیا-

''ہوں گے مگر یہ اجتماعی موضوعات ہیں-'' پھر وہ لاپروائی سے بولا- ''میں آپ سے کچھ انفرادی موضوعات پر باتیں کرنا چاہتا ہوں- پرسنل قسم کے-''

''مگر کیوں؟'' اس نے چونک کر کہا-

''ایسے ہی بس میرا دل چاہ رہا ہے- اور دل کا کیا ہے' وہ تو کچھ بھی چاہ سکتا ہے-'' وہ تفریح کے

موڈ میں لگ رہا تھا۔

''مگر میرا دل نہیں چاہ رہا' اور دل کا کیا ہے' وہ بہت کچھ نہیں بھی چاہ سکتا۔'' اس کے لہجے میں اس کی وہ ازلی خودداری عود کر آئی اور اس نے آگے بڑھ کر بھابی سے انیقہ کی پُش چیئر لے لی۔

''اور یہ دل کے ہاتھوں بھی انسان کس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔''

اس رات سونے کے لیے لیٹتے ہوئے اس نے سوچا۔

''جس بات کو بے تحاشا دل چاہ رہا ہو' وہ ہونے پر آئے تو محض اس لیے اس سے منہ موڑ لیا جائے کہ یہ آپ کی انا کا معاملہ ہے۔ کاش' فلزا تم درمیان میں نہ ہوتیں میں بغیر کسی خلش کے اس شخص سے گفتگو کیسے جاتی۔ ضروری تو نہیں کہ وہ شخص جو ہمیں اوروں سے منفرد اور اچھا لگتا ہو' اس سے کوئی خاص توقع ہی رکھی جائے۔ نارمل انداز میں بات بھی تو کی جا سکتی ہے' مگر ایک یہ فلزا اور اس کی کہی باتوں کا احساس اس طرح میرے اردگرد چھا گیا ہے کہ میں اس گھر اور اس کے مکینوں اور مہمانوں سے کہیں دور بھاگ جانے کے تصور ہی میں سکون محسوس کرتی ہوں۔'' اس رات اس کے دل میں دکھ تھا اور اداسی بھی۔

☆☆

بہت دیر تک اس نے کوریڈور میں کھڑے کھڑے تالا لگے بند دروازے کو گھورا۔ اس کا سامان اس کے اردگرد دھرا تھا۔ اور اسے اس بات سے وحشت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی ونگ خالی تھی۔ ابھی ادھر کوئی دوسری لڑکی واپس نہیں آئی تھی۔ پھر اس نے مایوسی سے رخ موڑ کر جنگلے سے نیچے دیکھا۔ اکادکا لڑکیاں ٹی وی روم اور پریسر روم میں آ جا رہی تھیں۔

''چھٹیوں کے بعد ایسی ہی نحوست اور وحشت طاری رہتی ہے ہاسٹل پر۔ جب تک کہ ساری لڑکیاں واپس نہ آ جائیں۔''

پھر اس نے دانت کچکچا کر سوچا۔

''اور ایک وہ فروا ہے جس نے کبھی وقت پر نہ آنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اور ایک یہ میں ہوں جسے بابا جان کا بس چلے تو چھٹیاں ختم ہونے سے ایک ہفتہ پہلے ہی واپس ہاسٹل بھیج دیں۔''

ایبٹ آباد سے واپسی پر اس نے بمشکل چھ دن پنڈی میں گزارے اور پھر چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ اس کے لاکھ کہنے کے باوجود کہ اتنی جلدی کوئی پڑھائی نہیں ہوتی۔

بابا جان نے اسے پنکچوئل اسٹوڈنٹ بننے کا درس دیتے ہوئے کوچ پر سوار کرا دیا تھا۔ یونہی ہر دفعہ اسے چھٹیاں ختم ہونے کے بعد اپنے اسلام آباد چھوڑ کر یہاں داخلہ لینے پر غصہ آتا تھا۔ اسے قدیم جگہوں اور درسگاہوں سے عشق تھا اور اسی عشق کی حماقت میں اس نے گھر سے کوسوں دور لاہور آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اب اس فیصلے پر پچھتانا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

دیر تک ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے بیگ سے چابی نکالی اور

وہ سعد عالم تھا جو چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا' مگر وہیں پر فلزا وقار بھی تھی' جو اس سے اپنی چیز کا سا برتاؤ کرتی تھی۔ گویا پہلے آیئے' پہلے پایئے کا سا معاملہ تھا' یہ اور بات ہے کہ اتنے دن میں وہ باوجود کوشش کے یہ اندازہ نہ کر سکی کہ سعد عالم کا رویہ فلزا کے ساتھ.... کیسا تھا کیا وہ پایا جا چکا تھا' یا یہ آکشن (نیلام) ابھی جاری تھا۔

''ظاہر ہے کہ فلزا کی چکا چوند کر دینے والی شخصیت کے سامنے وہ کیا چیز ہے' جب ہی تو اس شخص کا لہجہ باقی سب کے ساتھ اتنا تمسخرانہ ہوتا ہے۔'' پھر اس نے گویا خود ہی.... شکست مانتے ہوئے فیصلہ سنایا' جبکہ اسے یہ خلش بھی بری طرح ستا رہی تھی کہ صرف ایک شخص کے سامنے اس کی اپنی شخصیت اتنی دب سی جائے کہ وہ اس کے لیے اکیلے ہی میں سہی احمقانہ باتیں سوچنے لگے۔ جو بھی تھا' وہ اس سارے معاملے پر بہرحال خود سے بے حد ناراض تھی' اسی لیے اس نے واپس پنڈی چلے آنے کا فیصلہ کیا۔ مگر یہ بھی اس کی قسمت تھی کہ جس دن وہ ایبٹ آباد پہنچی تھی اسی دن سے اس نے مانسہرہ اور شنکیاری جانے کا ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔

شنکیاری میں منجھلی پھوپھو کے میاں کی ان دنوں پوسٹنگ تھی۔ اور مانسہرہ میں تائی جان کے بھائی رہتے تھے۔ اور اب اچانک جاوید بھائی نے ان دونوں جگہوں پر جانے کے انتظامات مکمل ہو جانے کی خبر دی تھی۔

''لیکن مجھے واپس جانا ہے' میری چھٹیاں ختم ہونے میں بس تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی انکار کیا۔

''یہ سب پروگرام تمہاری ہی وجہ سے بنا ہے' لہٰذا اب انکار کی گنجائش ہرگز نہیں ہے۔'' جاوید بھائی نے سختی سے کہا۔

''اور ویسے بھی یہ سب آگے جائیں گے تو تمہیں واپس چھوڑ کر آنے والا کون ہوگا۔ جاوید کی چھٹی ختم ہوگی تو اس کے ساتھ ہی چلی جانا۔''

تائی جان نے آرام سے سمجھایا۔ اور باقی سب لوگ' تم نے ہی تو کہا تھا کہ رٹ لگاتے رہے۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بات کر کے پھنس جاؤں گی' مجھے کیا معلوم تھا کہ ناگہانی مصیبت بن کر یہ شخص یہاں نازل ہوگا۔ اور میرے بنائے ہوئے پروگرام میں یوں آگے آگے ہوگا۔ جیسے اس کی تجویز ہو۔'' اس نے جھنجلاتے ہوئے سوچا' اور اپنے کپڑے چھوٹے بیگ میں گھسانے لگی۔

اب یہ بھی اس کی قسمت کا کرشمہ تھا کہ وہ دانستہ اس جیپ میں بیٹھی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اسے جاوید بھائی ہی ڈرائیو کریں گے' مگر چلنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی جاوید بھائی کلائی میں موچ آ جانے کا عذر پیش کر کے فرنٹ سیٹ پر بصد اطمینان براجمان ہو گئے' اور سعد عالم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''اُفوہ۔ اب یہ اچھا خاصا سفر ایک نئی کشمکش میں گزرے گا۔''

اس نے بیزاری سے سوچا- اور عین اسی لمحے فلزا بھاگتی ہوئی آئی اور شبر کو نکال کر شاہد بھائی کی گاڑی میں بٹھا کر تقریباً گھس جانے کے سے انداز میں جیپ میں داخل ہوگئی-

''مانا تم بہت دھان پان ہو فلزا! مگر شبر بھی تم سے کم ہی جگہ گھیرتا ہوگا-'' سعد عالم نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے زیرِلب مسکرا کر کہا-

''بس-'' فلزا نے شانے اچکائے-''بزرگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تو بہتر ہے کہ انسان کہیں نہ جائے-''

''اچھا!'' اس نے ذرا مڑ کر دیکھا-''یاد رکھو! ایک وقت میں تم کو بھی بزرگ بننا ہے-''

''تم دیکھنا اور یاد کرنا کہ میں کس قسم کی بزرگ بنوں گی-'' فلزا مسکرا کر جواب دے رہی تھی-

''دیکھنا کیا اور یاد کرنا کیا' میں تو ابھی سے پیش گوئی کرسکتا ہوں' حال بھی مستقبل کا ہی آئینہ ہوتا ہے-'' اب کے اس کا انداز مذاق اڑانے کا سا تھا-

''تم کیا جانو' میرا حال کیا ہے-'' فلزا نے جواب میں ایک ذو معنی سی بات کہی اور پھر سن گلاسز آنکھوں پر چڑھا کر باہر دیکھنے لگی-

''کبھی تم لوگوں کی آپس کی بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور پھر بھی کیے جاتے ہو-'' جاوید بھائی نے کلائی دباتے ہوئے کہا-

''محض حاضرین کی دلچسپی کے لیے-'' وہ موڑ کاٹتا ہوا ہنسا-''یہ اور بات ہے کہ بعض حاضرین اتنے بور اور ڈل ہوتے ہیں کہ بحث میں مزا نہیں رہتا-''

اس نے بیک ویو مرر ٹھیک کرنے کے بہانے ذرا سا سارا کی طرف موڑا- اور ایک نظر ڈالنے کے بعد اس کا زاویہ درست کرلیا-

وہ نظر انداز کردینے اور لاپروائی برتنے کا تہیہ کرکے گھر سے چلی تھی' اس لیے نوٹس لیے بغیر تائی جان کا بیگ ٹٹولنے لگی-

وہ دن دلچسپ اور پرلطف تھے جو مانسہرہ اور شنکیاری میں گزرے' مگر اس سارے ہنگامے سے محفوظ ہوتے ہوئے بھی اس کے ذہن اور دل پر ایک نامعلوم اداسی سی چھائی رہی اور ایسا صرف فلزا کے رویے کی وجہ سے تھا' یہ بات وہ طے کرچکی تھی- بات بے بات' جگہ بے جگہ فلزا اسے یہ احساس دلانا اپنا فرض سمجھ رہی تھی کہ سعد عالم گویا دنیا میں آیا ہی اس کے لیے ہے- اور اگر غلطی سے اس کے دل میں کوئی خوش فہمی بیٹھنے لگے تو وہ اس کو نکال پھینکے-

وہ اتنی گئی گزری تو ہرگز نہ تھی' بلکہ اس کو اپنی فراخدلی پر بڑا بھروسا تھا اور جہاں کہیں اسے اپنی انا اور خودداری پر زد پڑتی نظر آتی تھی' وہاں اسے سوائے اپنے بچاؤ کے دوسرا کوئی احساس پیارا نہیں ہوتا تھا- پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس حقیقت کو مان لے کہ کوئی چیز اس کی رسائی سے بالکل باہر ہے' وہ پھر بھی اس کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتی رہے- مگر اسے فلزا سے بھی ایسی کمینگی کی توقع نہیں تھی-

''سعد کا خیال ہے کہ تم ایک بور اور غیر دلچسپ لڑکی ہو-'' وہ اس کے کان میں بار بار یہ خبر

مردہ ہاتھوں سے تالا کنڈی کھولی' اندر گھٹن' گرد اور برسات کے بعد کمروں کی باس نے اس کا استقبال کیا- کچھ دیر تک اس باس کے نکل جانے کا انتظار کرنے کے بعد اس نے بیگ گھسیٹ کر اندر رکھے اور بالکونی میں کھلنے والا دروازہ کھولا- بیرونی لان میں پتوں کے ڈھیر تھے اور ہاسٹل سے باہر بھی کوئی رونق نہیں تھی-

''خدا جانے کب سب لوگ آئیں گے-'' اس نے ایک بار پھر پچھتاتے ہوئے جھاڑو اور جھاڑن پکڑا اور صفائی میں مشغول ہوگئی- باتھ روم سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لاتے ہوئے اس کی کمر دہری ہوگئی- اور جب سب کچھ صاف ہوگیا تو وہ خود بھتنی بنی کمرے کے درمیان کھڑی تھی-

''اچھا سارا..... یہ تم ہو.....'' سامنے کی ونگ سے آئی لڑکی نے اندر جھانکا-''میں بھی ابھی اسی حلیے سے جان چھڑا کر آئی ہوں' میرے خیال سے کپڑے نکالو اور نہالو-''
اس نے مشورہ دیا-

''ہاں..... یہی کرنے والی تھی- تم بیٹھو-'' اس نے کپڑے نکالے اور بالٹی اٹھا کر باتھ روم کی طرف آگئی- نہانے سے سفر اور اس کے بعد کی مصروفیت کی تھکان خاصی حد تک اتر گئی- اور جب وہ نہا کر دھلے کپڑے الگنی پر پھیلا رہی تھی- اسے چائے کی بیل کی خوشگوار آواز سنائی دی-

''میس کھلا ہے-'' اس نے حیرت اور خوشی سے پلٹ کر اس لڑکی سے پوچھا- جس کا نام بھی وہ ٹھیک طرح نہیں جانتی تھی-

''ہاں- تم بال سلجھالو' میں چائے لاتی ہوں-'' اس نے فلاسک اٹھاتے ہوئے کہا-

''شکر ہے میس کھلا ہے-'' اس نے بال سلجھاتے ہوئے کوئی دسویں مرتبہ سوچا-''ورنہ یہ ایک علیحدہ دردِسر بن جاتا-''

اور پھر چائے کے دوران وہ لڑکی جس کے نام سے بھی وہ ڈھنگ سے واقف نہیں تھی- اس کی ایک بے تکلف دوست میں بدل چکی تھی-

''جی..... محترمہ..... فروا خالد..... دوسراہٹ کی ضرورت انسان کو نئے نئے لوگوں سے بھی متعارف کرواسکتی ہے-''

اس نے تصور میں فروا کو مخاطب کیا' جس کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ اس لڑکی سے متعارف ہوئی تھی- وہ ایک دلچسپ لڑکی تھی' اس کا مزاج بے حد اچھا تھا اور وہ ایک اچھی ساتھی ثابت ہوچکی تھی' اسی کے ساتھ جا کر اس نے پی سی او سے گھر فون کیا' اور اپنی بخیریت آمد کی اطلاع دی' اور اسی کی دلچسپ گفتگو کے دوران اسے ڈنر میں ملی ''آلو بڑیوں'' کے بدمزہ ہونے کا احساس تک نہ ہوا تھا-

رات کو وہ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی اور اسے بھی ساتھ بٹھائے رکھا- پھر کینٹین کی یخ کوک پیتے ہوئے ان دونوں نے وقت گزاری کے لیے رسالوں کا تبادلہ کیا- اور اس کے چلے جانے کے بعد جب سارا نے وہ میگزین کھولا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ وہی میگزین تھا جو اس نے فلزا سے لے کر پڑھا

تھا اور جس میں .... وہ شارٹ اسٹوری تھی جس کے پڑھ لینے کے بعد سے اب تک وہ ایک عجیب سے خلجان میں مبتلا تھی۔ مگر مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر اس نے وہ رومانٹک اسٹوری بار بار پڑھی اور پھر اسے اپنے قریب سے کچھ مانوس سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''میں آپ سے کچھ پرسنل معاملات پر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''یونہی۔ بس میرا دل چاہتا ہے۔ اور دل کا کیا ہے وہ تو کچھ بھی چاہ سکتا ہے۔''

''آپ آہستہ چلیں گی۔''

''یونہی' ضروری تو نہیں کہ سارا دن آپ جن کے گلے کا ہار بنی رہتی ہیں' اس وقت بھی ان کے ساتھ چمٹی رہیں۔''

''سو فیصد ویسا ہی سراپا' گفتگو' مینرز اور سب سے بڑھ کر گہری براؤن مونچھیں اور بال۔'' پھر اس نے اسٹوری کے ساتھ چھپے آڑی ترچھی لائنوں والے اسکیچ کو دیکھا۔

''مگر....'' اس کا دل اگلی بیٹ کے ساتھ ہی مایوس ہو گیا۔

''بی پریکٹیکل (BEPRACTICAL) سارا رحمٰن۔'' اس نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''کس قدر احمقانہ خیالات ہوتے جا رہے ہیں آپ کے کچھ عرصہ سے' ایک شکل نظر آئی نہیں اور آپ ریشہ خطمی ہوئی جا رہی ہیں' سلی تھنکنگ اس سے پہلے تو آپ کا دل اتنا آؤٹ آف کنٹرول کبھی نہ ہوا تھا اور اب اگر ہو ہی گیا ہے تو فوراً اس کو کنٹرول کیجیے کہ زندگی میں اتنی نان پریکٹیکل سوچوں کا وقت نہیں رہ گیا۔'' چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے بیٹھے اس نے خود کو دیر تک سمجھایا۔

''اور ایک وہ ازلی و ابدی حقیقت فلز اوقار بھی ہے' جس نے بارہا میرے وقار کو مجروح کرنے کی کوشش کی' اس کڑوی حقیقت کے ہوتے ہوئے انسان چاہے بھی تو نان پریکٹیکل سوچیں آنا نہیں چاہئیں۔'' لائٹ آف کر کے لیٹتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا اور کروٹ بدل کر سو گئی۔

''اچھا تو تمہاری چھٹیاں مزے میں گزریں۔'' یہ فروا کا سوال تھا جو اس نے میڈم کی کلاس کے دوران کاپی پر لکھ کر اس سے کیا تھا۔ وہ صبح ہی ساہیوال سے پہنچی تھی' اور سامان رکھ کر سیدھی ڈیپارٹمنٹ آئی تھی۔

''ہاں بالکل ٹھیک ٹھاک' ویسے میں تم سے ناراض ہوں....'' اس نے جواب میں لفظ گھسیٹے اور توجہ سے میڈم کی شکل دیکھنے لگی۔

''کلاس ختم ہونے دو' پھر ناراضگی بھی دیکھتے ہیں۔'' اس نے اسے کہنی مار کر اپنے لکھے الفاظ کی طرف متوجہ کیا۔

اور کلاس ختم ہونے کے بعد کامن روم میں کھڑے کھڑے اس نے فروا کو ڈھیروں ڈھیر صلواتیں سنائیں۔

''چھٹیوں کا بتاؤ.... کیا کیا.... گھوم آئیں ایبٹ آباد' شنکیاری اور مانسہرہ۔'' جواب میں وہ اپنی ازلی ڈھیٹ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''ایبٹ آباد' شنکیاری' مانسہرہ۔'' اس کے چہرے کا سارا تناؤ ختم ہو گیا۔ اس نے ایک شکست خوردہ سی ہاں حلق سے نکالی۔

''کیوں تمہارے جانے پر وہاں والوں نے سوگ منایا تھا کیا؟'' فروا کرسی گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''ہرگز نہیں.... اس نے خود پر قابو پا لیا۔' بہت اچھا بلکہ بہت ہی اچھا ٹرپ تھا۔'' پھر اس نے اسے ایک ایک بات بتائی۔ لیکن اس صفائی سے اس واقعہ کو گول کیا جو اس کے اپنے بقول چھٹیوں کا کیا اس کی زندگی کا اہم ترین لیکن احمقانہ واقعہ تھا' کہ وہ خود حیران رہ گئی۔

اس کے جواب میں فروا نے چھٹیوں کی بوریت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کا نئے نئے کارنامے کرنے کا شوقین منگیتر بھی ساری چھٹیاں دوستوں کے ساتھ شمالی علاقوں میں ہائکنگ پر چلا گیا تھا۔

''لہٰذا کوئی لچھے دار رومانوی واقعہ بھی وقوع پذیر نہ ہو سکا۔'' اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اور واپسی ہوئی اس جگہ جوں کی توں۔''

''آؤ کینٹین چلتے ہیں....'' اس نے کہا۔ مگر وہ سُن نہیں رہی تھی' ایبٹ آباد جانے کے ذکر نے اسے پھر سے وہ یاد دلا دیا تھا' جسے بھلانے کی کوششوں میں وہ اتنے دن سے مصروف تھی۔

''کیا بات ہے سارا' سب باتوں کے باوجود آج تم ''ان'' نہیں ہو؟'' .... فروا نے اس کا شانہ ہلایا۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔'' وہ چونک گئی اور اسی بات کا تو اسے غصہ تھا کہ خود کو سمجھانے' خود سے وعدے کرنے اور حقیقت کی دنیا میں چلے آنے کا نعرہ لگانے کے باوجود وہ اپنی سوچوں کا اثر ظاہر پر آنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ پنڈی میں بھابی بھی اس سے بار بار پوچھتی تھیں۔

''سارا! کہاں کھو گئی ہو۔'' اور ثناء بھی۔ ''آپا تو شاید ایبٹ آباد سے ٹرینکولائزرز ادھار مانگ کر لے آئی ہیں۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں جیسے نیند میں ہوں۔'' وہ کہتی اور تو اور یاسر نے بھی ایک بار اسے چونکایا تھا۔

''سارا تم اپنا ذہن وہاں ایبٹ آباد ہی میں تو نہیں چھوڑ آئیں۔''

''حد ہے بھئی۔'' اب کے فروا کے چونکانے پر اسے خود پر بری طرح غصہ آیا۔ ''میرے خیال سے اب تک مجھے ہوش کے ناخن لے لینے چاہئیں۔''

اپنے آپ کو بری طرح ڈانٹتے ہوئے اس نے فائل اٹھائی اور فروا کے ساتھ کینٹین کی طرف چلی آئی۔ مگر وہاں بھی چائے کے دوران فروا ہی زور و شور سے مصروف گفتگو رہی۔ چھٹیوں کے بعد ہونے والی تبدیلیاں ''وہ گروپ پہلے وہاں بیٹھتا تھا۔ اب وہاں بیٹھا ہے' فلاں لڑکا پہلے اپنی بائیک کی ٹینکی پر براجمان رہتا تھا۔ اب سیٹ پر بیٹھا ہے' اس کو دیکھو چھٹیوں کے بعد بھی اسی جینز میں آ گیا ہے۔ بیچارے کو نئی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ یہ کینٹین والے اصغر بھائی نے بال پہلے سے چھوٹے نہیں کرا لیے' اور کمزور بھی پہلے سے زیادہ ہو گئے ہیں' یہ ایجوکیشن والی میڈم کو دیکھو' کیا فیشن ہے۔ ہاں تم نے چھٹیوں میں فلاں ڈرامہ دیکھا تو قیر ناصر کتنا اسمارٹ لگ رہا تھا' اور اس کے ساتھ کی ہیروئن توبہ توبہ اس کی بے

بے لگتی تھی۔'' وہ بولتی جا رہی تھی اور وہ خالی نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں' کیا کسی موضوع میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی' میں ایویں ہی بک بک کیے جا رہی ہوں....'' فروا نے ناراضگی سے پوچھا۔

''سخت بور کر رہی ہو....'' اس نے سموسہ پلیٹ میں مار کر کہا۔

''سعد کا خیال ہے کہ تم ایک بور اور غیر دلچسپ لڑکی ہو۔'' اسے فلزا کی آواز سنائی دی۔

''ہاں!'' غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا ہاں بھئی۔'' فروا نے سموسہ دوبارہ اٹھایا۔ ''میں یہ کہہ رہی تھی کہ اس ایم' بی اے والی لڑکی کو دیکھو' کیا ملٹی کلر آؤٹ لک ہے اس کی۔''

شکر تھا کہ اس نے اس کے بے تکے لفظ کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا اور اپنے پسندیدہ موضوع پر گفتگو جاری کر دی تھی۔

مگر ایسا بھی نہ تھا کہ فروا ہر بار ہی نوٹس نہ لیتی۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے دن رات اس کے ساتھ تھی۔ پہلے ڈرامیٹری میں اکٹھی رہتی تھیں اور اب ان کے کیوبیکلز بھی ساتھ ساتھ تھے۔ انکا سبجیکٹ ایک تھا اور ہاسٹل میں وہ ایک دوسرے کے سائے کے طور پر مشہور تھیں۔ ایسی صورت حال میں وہ جو بھابی' ثناء اور یاسر کی نظروں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی' فروا کی نظروں سے بچ نہ پا رہی تھی۔ اور اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ فروا بہت دیر سے دوپہر کے کھانے میں ملی ماش کی دال پر تبصرہ کر رہی تھی' اور وہ کوئی بات کہے بغیر بظاہر کل کے لیے اسائنمنٹ تیار کرنے میں مصروف تھی۔

''سنو سارا رحمٰن....'' فروا ایک دم خاموش ہو گئی۔

''تم جو کچھ مجھ سے چھپا رہی ہو' اس کے چھپانے پر میں تم سے سخت ناراض ہوں' لیکن پھر بھی ڈھیٹ بنی تمہارے ساتھ پھر رہی ہوں' یہ میری انسانیت کی ایک ادنیٰ مثال ہے' لیکن اب وہ وقت آ چکا ہے جب میں تم سے ناراض ہونے والی ہوں۔ کیونکہ یہ مزید میری برداشت سے باہر ہے۔''

تیزی سے چلتا اس کا قلم اچانک رک گیا۔

''کیا مطلب بھئی' میں ذرا یہ اسائنمنٹ۔'' اس نے بات بنانا چاہی۔

''کیا مجھے علم نہیں کہ پہلے تم کس قدر انہماک سے اسائنمنٹ بنایا کرتی تھیں جواب بنا رہی ہو گی' بات صرف اتنی ہے کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جس نے تمہیں اتنا بور اور غیر دلچسپ بنا دیا۔ میں بکواس کیے جاتی ہوں' تم کچھ سن کر ہی نہیں دیتیں۔ یوں جیسے کہیں موجود ہی نہیں ہو۔ افسوس تو صرف اس بات کا ہے کہ میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے سے دل کی بات کہہ لینے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے' مگر اب مجھے علم ہوا ہے کہ میرا خیال غلط تھا۔ تم مجھے کچھ اتنا بھی قابل اعتبار نہیں سمجھتیں' اچھا میں چلتی ہوں۔'' اس نے کرسی سے پاؤں اتار کر چپل میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم سکون سے کرو اپنے مارکس اور اینگلز کے سیاپے۔''

ظاہر ہے' وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ فروا یوں اس سے ناراض ہو جائے' دوسرے اچانک اسے خیال آنے لگا تھا کہ دل کی بات دنیا میں کسی ایک فرد سے کہہ لینے میں کچھ اتنا بھی حرج نہیں' کوئی ایک شخص جس کے بارے میں خود کو یقین ہو کہ وہ مذاق نہیں اڑائے گا۔ اور غلط مشورہ بھی نہیں دے گا۔ شاید دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔

''بات بے حد معمولی سی ہے' بالکل عام سی....'' اس نے دروازہ کھولتی فروا کو پکارتے ہوئے کہا۔ وہ وہیں رک گئی۔

''مگر ہے تو سہی۔'' یہی تو اس لڑکی کی سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ بہت جلد مان جاتی تھی۔

''ہاں ہے' تم سے اس لیے نہ کہی کہ شاید تم کہو' یہ بھی کوئی بات ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''جو بھی ہے' کہہ ڈالنی چاہیے تھی' میں کچھ اتنی بھی احمق نہیں ہوں۔ اچھا چلو اب کہو۔'' وہ دوبارہ سے کرسی پر براجمان ہو گئی۔

''فلزا نے۔ اس بار ایک سے زیادہ مرتبہ میرا دل دکھانے کی کوشش کی۔'' اس نے ان ڈائریکٹ بیان دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' فروا جہاں تھی وہیں رہ گئی۔

''وہ ایک شخص تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے مجھے۔'' پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی دانست میں اپنی احمقانہ کہانی سنائی۔

''ہاں اچھی کہانی ہے۔'' فروا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا۔ یاد ہے تم مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ ندیم کے بارے میں الٹی سیدھی گفتگو نہ کیا کروں۔ میں نے بھی سوچا کہ شاید میں ہی غلط کہتی ہوں۔ اب پتا چلا کہ جب ایسی کیفیت' تم بے شک اسے احمقانہ کیفیت ہی کہو۔ وارد ہو جاتی ہے تو پھر اس پر قابو پانا کچھ اتنا آسان بھی نہیں رہتا۔ مگر تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ موصوف فلزا کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ فلزا کی خوش فہمی ہو' بہت ممکن ہے کہ اس کے برعکس' وہ جو تم سے ذاتی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ وہ خدا جانے کیا ہو۔ کچھ باتیں فرض کر لینا غلط ہوتا ہے۔ مگر کچھ فرض کر لینا غلط نہیں ہوتا۔ اور یہ تم اپنے اس احساس پر اس طرح شرمندہ کیوں ہو رہی ہو۔ جیسے تم نے کوئی چوری کر لی ہو۔ یہ کوئی ناممکن سی بات تو نہیں' وہ آیا' تمہیں اچھا لگا۔ اس میں کیا برائی ہے۔ ایسا ہوتا ہے بلکہ اکثر ہوتا ہے۔ ہر کوئی بتاتا تھوڑی ہے۔ تم خوامخواہ دل سے نہ لگاؤ۔ بہت ممکن ہے کہ جلد ہی اسے بھول بھی جاؤ' کیونکہ کچھ احساسات وقتی ہی تو ہوتے ہیں اور بھئی اب اپنے ہاتھ سے یہ کتابیں چھوڑو' چلو باہر چلتے ہیں۔ ٹیرس پر' ان مارکس اور اینگلز کو بہت رو لیا' ویسے یہ مارکس اور اینگلز ہر مضمون ہی میں کیوں گھسے ہوئے ہوتے ہیں۔ صبح اکنامکس کی ایک لڑکی بھی ان کو رو رہی تھی۔''

پھر اس نے اس کی کتابیں حقیقتاً اٹھا کر میز پر رکھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ فروا کی

ہمت دینے والی باتوں سے اس نے وقتی طور پر ہمت پکڑ ہی لی تھی- اور یہ بھی فرض کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس مرتبہ بھی چھٹیاں گزشتہ روٹین کی طرح ہی گزر گئی تھیں اور یہ کہ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی-

مگر اس کی قسمت کہ ایسا بہت دن تک نہیں چلا- اس روز امی کا خط آیا تھا- اور بہت سی باتوں کے علاوہ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ فلزا اس سال ہسٹری میں ایڈمیشن لینے کا ارادہ کر رہی ہے- اور جب وہ ایڈمیشن کے سلسلے میں لاہور پہنچے تو اپنے گزشتہ تجربے کی وجہ سے اس کی ہر طرح مدد اس کا اولین فرض ہونا چاہیے-

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً فلزا کے ادھر آ جانے پر خوش ہوتی- یہاں جہاں کوئی بھی اپنا عزیز نہیں تھا- کسی ایک اپنے کی آمد خاصی خوشی کا باعث ہو سکتی تھی- مگر اب یہ وقت اور تھا- اسے اس خیال ہی سے وحشت ہونے لگی کہ وہ یہاں آ رہی تھی-

''پھر نجانے کون کون سے طریقوں سے میری- دل آزاری کرے گی' خدا معلوم اسے کیوں مجھ سے بلاوجہ کا بیر ہو گیا ہے-'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے فروا کو مخاطب کیا-

''تم اس کے مستقبل کے لیے خطرہ بننے جو جا رہی تھیں' اس کو خدشہ لاحق ہو رہا ہو گا کہ تم اس کی رقیب روسیاہ بن سکتی ہو' جب ہی اس نے سرد مہری دکھانا شروع کر دی ہو گی' ورنہ اپنی فرسٹ کزنز وہ بھی جو ہم عمر ہوں' کسے بری لگ سکتی ہیں-''

فروا نے خود کو ایک اچھا مشورہ دینے والی سمجھتے ہوئے ذرا سنجیدگی سے جواب دیا-

''اور ویسے بھی رات گئی بات گئی' نہ اب وہ دن ہیں' نہ یہ ایبٹ آباد ہے اور نہ وہ موصوف موجود ہیں لہٰذا اب اسے تم سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے-'' پھر اس نے ایک اور خیال پیش کیا- مگر اس تسلی کے باوجود نجانے کیوں اس کا دل فلزا کی آمد کے تصور سے ہی دہلا جا رہا تھا- بارہا اس نے سوچا کہ کاش وہ اپنا ارادہ بدل دے یا پھر سیشن لیٹ ہو جانے کی وجہ سے اسے ایڈمیشن ہی نہ مل سکے مگر اس کی کوئی بھی دعا قبول نہ ہو سکی- فلزا ایک لائق اسٹوڈنٹ تھی- سیشن لیٹ ہو جانے کے باوجود بھی میرٹ سے خاصا اونچا نمبر تھا اور ارادہ بھی اس کا پکا تھا- اسی لیے وہ بڑی شان سے آ موجود ہوئی تھی-

''ویسے ہاسٹل نمبر ٹو میرے والے سے زیادہ اچھا ہے- وہاں کا کک بھی بہتر ہے اور کمرے بھی اچھی حالت میں ہیں-'' ایس ٹی سی ہال میں ہاسٹل فارم بھرتے ہوئے اس نے آہستہ آواز میں اس کو مشورہ دیا-

''نہیں' میرا خیال ہے کہ تمہارے ہاسٹل ہی کو ترجیح دینی چاہیے' اکٹھے رہنا اچھا ہوتا ہے- ورنہ نئی جگہ پر گھبراہٹ محسوس ہو گی-'' یہ شاہد بھائی کا کہنا تھا جو فلزا کے ساتھ آئے تھے-

اس کا کوئی بھی مشورہ کارگر ثابت نہ ہو سکا- اور اب فلزا اسی کے ہاسٹل میں گراؤنڈ فلور کی ڈرامیٹریز میں سے ایک میں براجمان تھی-

شروع شروع میں اس نے اس کو گائیڈ کرنے کی اس کے ساتھ رہنے کی کوشش کی- مگر پھر اس نے خاصے اسٹریٹ فارورڈ انداز میں اسے منع کر دیا- ''بھئی مجھے یہ بڑی آپاؤں والے کیئرنگ قسم کے رویے پسند نہیں- مجھے معلوم ہے' ہاسٹل لائف کیسی ہوتی ہے- اور یہ بھی کہ میں کوئی بچی نہیں ہوں جو یونیورسٹی کے ماحول سے گھبرا جاؤں' تم میری فکر نہ کرو-''

وہ اس کی فکر کرنا بھی نہیں چاہتی تھی- یہ تو امی کے خطوط کا دباؤ تھا جو اس نے خلوص کا تاثر چہرے پر سجایا تھا- اور اس کے منع کرنے پر اس نے اپنا چولا اتار کر واپس اپنے کمرے اور کمپنی کا رخ کیا اور اسی وقت اسے محسوس ہوا کہ اس کے اور فلزا کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو چکی تھی- اور دونوں طرف ہی اس کو پاٹنے کی خواہش کا فقدان تھا- ''اس سرد جنگ کی وجہ تسمیہ تو نجانے کہاں مزے کر رہا ہو گا' ہمارے درمیان خوامخواہ کی دراڑ ڈال گیا-'' اس نے سوچا-

مگر اس وجہ تسمیہ کے ویراباؤٹس کے بارے میں زیادہ دن سوچنا نہیں پڑا- فلزا کی آمد کے ٹھیک بیسویں دن یونیورسٹی سے واپسی پر بس سے اترتے ہی اس کی نظر ہاسٹل گیٹ کے عین سامنے کھڑے سعد عالم پر پڑی- وہ ایک گرے سوزوکی سوئفٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا- اس کو اپنے دل پر ایک نامعلوم گھونسہ پڑتا محسوس ہوا- یہ بات تو وہ بھول ہی چکی تھی کہ وہ اسی شہر میں رہتا تھا- اور فلزا کی آمد یقیناً اس کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتی تھی- اس نے بس سے اترنے والی لڑکیوں کے ریلے میں خود کو گم کرنا چاہا- اور انہی کے درمیان چھپی چھپی اس کے سامنے سے گزر گئی- فلزا کینٹین پر کھڑی چائے کے دو مگ بھروا رہی تھی-

''آ گئیں تم-'' اسے دیکھ کر وہ چلائی- ''میں ڈیپارٹمنٹ سے جلدی چلی آئی' سعد جو آ گیا تھا ملنے-'' پھر اس نے گردن موڑ کر باہر دیکھا- ''مجھ سے-'' مگ پکڑ کر باہر جاتے ہوئے وہ مڑ کر رکی اور الفاظ کی اہمیت اجاگر کر گئی- سارا کا چہرہ بظاہر بالکل سپاٹ تھا- مگر اس کے دل میں مہینوں پہلے کی کیفیت اترنے لگی تھی-

''یہ ہی تو-'' ڈائننگ ہال میں گھس کر اپنی پلیٹ میں کھانا ڈالتے ہوئے اس نے سوچا- ''اسی لیے تو میں فلزا کے یہاں چلے آنے پر گھبرا گئی تھی' اب بات خواہ کوئی بھی ہو' میرا ذہن پھر سے اپ سیٹ ہو جائے گا- کیونکہ اس معاملے میں میرا دل اور ذہن میرے قابو میں نہیں رہے- یہ بات طے ہے-''

''میں نے تم سے کتنا کہا تھا' دفع کرو ڈاکٹر شہریار کی کلاس کو' کون پڑا کرسی پر اکڑوں سوتا رہے' اس سے اچھا نہیں کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ کر سویا جائے-'' فروا جو کلاس بنک کر کے پہلے ہی سے آ چکی تھی- اپنا کھانا لے کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی- ''کاش میں نے تمہارا کہا مان لیا ہوتا-'' اس نے سوچا-

''میں نے تو کہا تھا تم سے مگر تم نہیں مانیں-'' اس نے پھر جتایا ''ایک تو تم پرائیفی شنٹ اور ہارڈ

ورکنگ اسٹوڈنٹ نظر آنے کا خبط سوار ہے- اور یہ جو تمہارے چہرے کا رنگ بدلا بدلا لگ رہا ہے نا اور تھکن کے آثار نظر آ رہے ہیں- یہ سب ان دھانسو قسم کے علمی نظریوں کی سماعت کا نتیجہ ہے- خواتین وحضرات- ماڈرن فلسفی میں صرف تھنکنگ ہی کا تصور نہیں ماڈرن فلاسفی عمل کا طریقہ بھی بتاتی ہے-''

پھر اس نے ڈاکٹر شہر یار کی آواز میں ایک مکالمہ دہرایا-

''کاش یہ اپنی ماڈرن فلاسفی سمیت وہیں رہ گئے ہوتے' یونائیٹڈ کنگ ڈم میں-'' فروا کا تبصرہ بے لاگ تھا- مگر اس وقت اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا- اس کے حلق میں نوالے اٹک رہے تھے-

''یہ بار بار پانی پینے کا کام بھی اسی ماڈرن فلاسفی کا راگ سننے کا نتیجہ ہے-'' فروا نے اسے ایک ایک نوالے کے بعد پانی پیتے دیکھ کر کہا-

''میں بس اب اوپر چلوں گی-'' اس نے ایکدم کھانا چھوڑ دیا-

''کیا بات ہے' طبیعت پر واقعی لیکچر نے اثر کر دیا-'' فروا نے حیرت سے اسے دیکھا-

''بس یونہی-'' اس نے کتابیں سمیٹ کر باہر کی طرف آتے ہوئے کہا-

اس کا بس یونہی' اس پر رات تک طاری رہا- اور فروا اس نئی صورت حال سے پریشان تھی-

''نہ تو تمہیں بخار ہے' نہ زکام' نہ ہی تمہیں کوئی اور بیماری ہے' پھر وجہ کیا ہے-''

وہ اس سے بار بار پوچھ رہی تھی- ''کہیں میری آمد کے بعد پریوسس کے اس ''مائیکل ڈگلس'' نے تو کچھ نہیں کہہ دیا- وہ کئی دن سے تم سے فلرٹ فرمانے کی کوشش کر رہا ہے اور مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ میرے تمہارے ساتھ ساتھ رہنے پر مجھے ہٹلر کا خطاب بھی دے چکا ہے-'' اس نے اسے ہنسانے کی کوشش کی- اس کی مسلسل خاموشی پر پھر اس کا پارہ چڑھ گیا-

''کوئی بات تو ہے' تمہارے موڈ پر یہ محرم یوں ہی تو نہیں چھا گیا- اچانک' دیکھو سیدھی طرح مجھے بتا دو' ورنہ میں چلی پٹیالے-'' اس نے ''نکلے تیری تلاش میں'' ہاتھوں میں گھماتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا-

''اچھا- اچھا-'' پھر جیسے اس کی سمجھ میں خود ہی کوئی بات آ گئی-

''اپنی اس کزن ہرجائی نیس فلزا وقار کی وجہ سے پریشان ہو' اس نے کچھ کہہ دیا-'' اس نے منہ بنا لیا- ''بھئی سیدھی سی بات ہے خواہ تمہیں برا لگے' مجھے تمہاری اس کزن کا مزاج کچھ اچھا نہیں لگا- پہلے ہی دن سے-'' اسے برا کیوں لگتا تھا- وہ تو خود اس مزاج سے ہی ڈسی گئی تھی- اور شروع دن سے فروا کی اس اسٹیٹ منٹ نے اس کا دل بے وجہ باغ باغ کر دیا تھا-

''پھر کیا کہہ دیا اس نے اب-'' اب فروا اس کے جواب کی منتظر تھی-

''نہیں یہ کوئی بات نہ ہوئی کہ انسان اپنی ہر حماقت زدہ سوچ کو کسی سے بیان کر دے خواہ وہ اس کا بہت ہی قریبی دوست کیوں نہ ہو-'' اس نے سوچا-

''ایسی کوئی بات نہیں' بس میرا دل گھر کے لیے اداس ہو گیا ہے' جب سے آئی ہوں' ایک بار بھی کوئی

ملنے نہیں آیا- پہلے تو منصور بھائی کا ایک آدھ چکر لگ ہی جاتا تھا لاہور کا' مگر جب سے ان کی پروموشن ہوئی ہے' یہ سلسلہ بھی ختم ہوا' اور یاسر نجانے کون سے کاموں میں مصروف رہتا ہے جو توفیق نہیں ہوتی-''

اس نے پلٹ کر دروازے میں کھڑی فروا کو دیکھا اور سیاسی بیان دیا- فروا نے کچھ دیر اسے غور سے دیکھا-

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ ہی بات ہے جس کی وجہ سے تم دوپہر.... سے محرم منا رہی ہو-'' وہ بے یقینی سے بولی-

''ہاں- اور کیا-'' وہ زور سے ہنس دی- ہنسی کی یہ آواز بھی یقیناً اجنبی سی تھی-

''آؤ چلیں' نائلہ کے کمرے میں' وہ کافی بنا رہی تھی- اس نے میرا ہیٹر ادھار مانگا تھا- اس کا کرایہ ہی وصول کر لیں-''

اب وہ موضوع بدلنا اور بات ٹالنا چاہ رہی تھی- اس لیے جلدی سے فروا کا بازو پکڑ کر اسے گھسیٹتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں گھس گئی- اور یہ اس سے چند ہی دن بعد کی بات تھی- جب اگلے روز کے ٹیسٹ کی تیاری کرتے کرتے اچانک فروا کو بے وقت- بھوک لگنے لگی-

''کھانا ملنے میں تو بہت دیر ہے- چلو کچھ چائے پانی کر آئیں کینٹین سے-''

اس نے نیلر کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا- وہ بے حد انہماک سے اسٹڈی میں مصروف تھی اور اسے قطعی بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی- مگر پھر فروا کے ''میں چلی پٹیالے'' والی دھمکی پر اسے مجبور ہونا پڑا-

''کبھی کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بالوں میں برش ہی پھیر لیا کرو-'' اسے دروازے کو لاک لگاتے دیکھتے ہوئے فروا نے کہا- ''لگتا ہے' ساری دنیا کے ٹیسٹ تمہارے سراپے پر برس رہے ہیں- ایک ہم ہیں کہ نہ صرف بال بنائے ہیں بلکہ یہ لوشن بھی اور یہ لپ اسک بھی' انسان کو ہر برے اچھے میں زندہ دل رہنا چاہیے-'' سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی اس نے اپنا بیان جاری رکھا- مگر وہ کوئی خاص نوٹس نہیں لے رہی تھی اور جب وہ کینٹین کے سامنے والے لان میں پتھر کے بینچ پر پاؤں اوپر چڑھائے آلتی پالتی مار کر بیٹھی گیٹ سے ہونے والی آمد و رفت کو دیکھ رہی تھی- اس وقت اسے اچانک احساس ہوا کہ فروا غلط نہیں کہہ رہی تھی- اس کے بال الجھے ہوئے تھے' کپڑے ملگجے تھے' چہرا بے رونق تھا- ایسے جیسے دنیا کے سارے ٹیسٹ اس کے سراپے ہی پر برس رہے تھے- اور یہ کہ اچانک گیٹ سے جو شخص اندر آیا تھا- اس نے غالباً ایک بار کبھی ٹھیک ہی کہا تھا کہ ''اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے' جیسے کوئی قبرستان.... سے اٹھ کر زندہ انسانوں میں آ گیا ہو-''

''ٹھیک ہے' انسان کو کبھی تو ڈھنگ کے حلیے میں ہونا چاہیے-'' وہ جب اسے دیکھ کر اس کی طرف چلا آیا تو بینچ سے ٹانگیں اتار کر کھڑی ہوتے ہوئے اس نے سوچا- ''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں-'' وہ کہہ رہا تھا-

''جی نہیں ایسی بات نہیں-'' اس کے لہجے میں جو سرد مہری اچانک اتر آئی تھی- اس پر وہ خود بھی

حیران تھی۔

''اچھا!'' اس نے یوں کہاں جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

''اتفاق سے آپ سے ملاقات ہوگئی میں ادھر....''

''فلزا سے ملنے آئے تھے۔'' اس کے منہ سے اچانک پھسل پڑنے والے الفاظ نے اس کی بات کاٹ دی۔ اسے خود سے ایسے کاٹ دار لہجے اور اس غلط موقع پر پھسل پڑنے والے الفاظ کی قطعی توقع نہ تھی۔

اس نے ایک لمحے کو حیرت سے اسے دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ کو کیا معلوم کس سے ملنے آیا ہوں۔''

''اچھا!'' اس نے سر اٹھایا۔ ''فلزا کے علاوہ کوئی دوسرا بھی آپ کا شناسا اس ہاسٹل میں رہتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔''

''ایک شناسا میری آپ بھی تو ہیں۔ یہ اور بات کہ آپ اس سے انکار کر دیں۔''

''توبہ توبہ! یہ محی الدین تو بالکل شائیلاک کی نسل میں سے ہے۔ کہتا ہے۔ کپ بڑا ہے۔ ڈیڑھ روپے کی چائے ملے گی۔''

فروا اپنے ہاتھوں میں پکڑی چیزوں پر دھیان جمائے ہوئے بڑبڑاتی ہوئی ادھر آئی۔ لیکن سر اٹھانے پر ٹھٹھک کر رہ گئی۔ یہ منظر اس کے لیے قطعی نیا تھا۔ اس کی قریب ترین دوست ایک لمبے ہی لمبے شخص کے ساتھ تھی۔ اور وہ شخص اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔

''معاف کیجیے گا۔'' اس نے گرم گرم چائے کے مگ کی تپش کو برداشت نہ کر سکتے ہوئے اسے بینچ پر رکھا۔

''مجھے ادھر کھڑے کھڑے قطعی معلوم نہ ہو سکا سارا۔'' پھر وہ اس کی طرف مڑی۔ ''تمہارے وزیٹر آئے ہیں۔ ورنہ ایک تیسرا کپ بھی بنوا لیتی۔''

''یہ میرے نہیں فلزا کے وزیٹر ہیں۔ یا پھر شاید کسی اور کے۔''

اس کی توقع کے ایک بار پھر برعکس سارا نے کپ اور چپس کے پیکٹ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''میری ان سے معمولی سی شناسائی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔'' وہ بے حد بے مروتی سے مڑی اور اندرونی گیٹ سے برآمدے میں داخل ہوگئی۔

''میں صورت حال کو سمجھ نہیں سکی ہوں۔'' فروا نے واقعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس شخص کی طرف مڑ کر کہا۔ ''ویسے اگر آپ واقعی فلزا سے ملنے آئے ہیں تو چوکیدار سے کہہ کر بلوا لیجیے' اس کا کمرا نمبر اکتیس ہے۔''

''آپ اندر جا ہی رہی ہیں تو پلیز' ذرا آپ ہی کہہ دیجیے' اس سے کہیے گا کہ سعد عالم آیا ہے۔''

اس شخص نے اس انوکھی صورت حال کو بے حد متانت سے ہضم کرتے ہوئے اس سے درخواست کی۔

''سعد عالم' آپ' سعد عالم۔'' فروا کو جیسے کوئی تاؤ سا لگا۔ ''اچھا!'' پھر اس کی سمجھ میں گویا سارا

معاملہ آ گیا۔ ''میں بلوا دیتی ہوں فلزا کو۔'' اس نے اندر آ کر فلزا کی روم میٹ کو پیغام دیا اور خود دو دو سیڑھیاں پھلانگتی اوپر چڑھ آئی۔

اس کی دوست اپنے کمرے میں بے حد اطمینان سے چپس کا کھلا پیکٹ گھٹنوں میں پھنسائے چائے کا مگ ایک ہاتھ میں پکڑے دوسرے میں شوفیلڈ کی ایجوکیشن تھامے گم تھی۔

''لاپروا اور بے نیاز نظر آنے کا یہ طریقہ کچھ اتنا درست نہیں۔'' اس نے اندر آ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی چائے پکڑی۔

''یہ کیسی بے نیازی ہے۔ بے نیازی نہیں بلکہ بے مروتی اور غالباً بدتمیزی ہے۔'' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے ایسی بری باتیں کہتی ہی جائے۔ مگر وہ کوئی دھیان دیے بغیر پروپیگنڈا اور ان ڈوکٹرنیشن کے فرق چھاننے میں مصروف تھی۔

''سارا تم جانتی ہو کہ ابھی ابھی تم نے باہر جو کچھ کیا ہے غلط کیا ہے خواہ ذہنی دباؤ کے تحت ہی سہی۔'' وہ اس کی غلطی تسلیم کروانے پر تل گئی۔ اب بھی وہ خاموش تھی' اس نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

''مجھے بتاؤ۔'' اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ اور جواب میں اس نے اب بھی بغیر کچھ بولے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

''آئی ایم ہیلپ لیس'' (I am help less) کچھ دیر کے بعد اندر سے اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

''اوہ خدایا۔'' فروا' سارا جیسی مضبوط' ذہین' باشعور اور عقلمند لڑکی سے اتنی امیچور اور بزدلانہ رویے کی توقع کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کو یونہی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا چھوڑ کر بالکنی کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ہاسٹل کی بیرونی دیوار کے ساتھ والی سڑک پر ایک گرے سوزوکی آہستہ رفتار میں چلتی آ رہی تھی۔ اور اس کے قریب آنے پر اسے اس شخص کا چہرا نظر آیا جسے ابھی کچھ دیر قبل اس نے تذبذب کے عالم میں کھڑے دیکھا تھا۔ اور اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی لڑکی یقیناً فلزا تھی۔

پھر اس نے گردن گھما کر جالی کے دروازے کے پار بستر پر بیٹھی سارا کو دیکھا۔

''بعض اوقات ایک عقلمند' باشعور اور غیر جذباتی انسان کا پانی بھی کہاں آ کر مرتا ہے۔''

اس نے سوچا۔

اب یہ سارا ہے جس کے بارے میں' میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اسے کوئی بات بے بس کر سکتی ہے۔ وہ کلاس کی سب سے محنتی اور ذہین اسٹوڈنٹ تھی۔ سنجیدہ اور معتبر سی نظر آتی تھی۔ اسی وجہ سے کلاس کے باقی لوگ خصوصاً لڑکے اس کے ساتھ عزت سے پیش آتے تھے اور پروفیسرز اس کی قدر کرتے تھے' خود وہ بھی اس سے اچھی خاصی متاثر تھی۔ اس کا اعلیٰ ذوق' علم' ذہانت' سنجیدہ سی گفتگو اور اس کا خلوص اسے بے حد پسند تھا' وہ اس کے بتائے اوامر ونہی پر بڑی جلدی عمل پیرا

ہو جاتی تھی- کیونکہ اس نے ہر مشکل اور پریشانی میں اب تک قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا- لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کی جس کے علاوہ وہ ڈیپارٹمنٹ اور ہاسٹل میں کوئی دوسری دوست بنا ہی نہیں سکی تھی کہ اس مشکل .... صورت حال میں کیسے مدد کرے- وہ دیر تک باہر کھڑی ایسی ہی باتیں سوچتی رہی اور پھر اوپر نیچے کاریڈورز کی لائٹس آن ہو جانے پر اندر چلی آئی- سارا منہ دھو کر باتھ روم سے لوٹی تھی- اور اب تولیے سے خشک کر رہی تھی-

''دل کے بہت سے معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں' جن کو دھیرے دھیرے بھلایا بھی جا سکتا ہے' اور سکون پذیر بھی کیا جا سکتا ہے-'' اس نے ٹیبل کے ساتھ ٹیک لگا کر سنجیدگی سے کہا- ''لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو' ایسی صورت حال میں انسان کو وقت گزرنے کا انتظار کرنا چاہیے' وقت ہی ایک ایسی چیز ہے جو رفتہ رفتہ ہر غلط اور درست بات کو سامنے لے آتا ہے-''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی وجہ سے تمہیں پریشان کر دیا- مجھے خود بھی اپنے آپ سے اتنی بڑی حماقت کی توقع نہ تھی- نہ ہی اس اچانک آمد کی-'' اس نے اطمینان سے جواب دیا-

''مگر اب یقیناً ایسا نہیں ہوگا- آؤ MORALS پر ایک نظر ڈال لیں-'' دوبارہ سے نوٹس پکڑ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی-

اور واقعی اس کے بعد ایسا نہیں ہوا- اگلے کچھ عرصے میں کتنی ہی مرتبہ اس نے ایکس نمبر فلزا بی بی' وزیٹر ہیں کی آوازیں سنیں' خود اس کے وزیٹر کو دیکھا- اس کو اس کے ساتھ وزیٹرز روم میں بیٹھے دیکھا' اس کے ساتھ باہر جاتے دیکھا- مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود کو بے حس کر لینے میں کامیاب ہو گئی تھی-

یہ اس کا فائنل ایئر تھا اور اسے اس کی بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ زیادہ فکر تھی- ایسے میں اس نے اس بات پر بھی توجہ دینا چھوڑ دی کہ فلزا اس کو اکثر کیا سناتی رہتی ہے- ''سعد آیا تھا' میں ویک اینڈ پر اس کی آپا یعنی پھپھو کی نند کی طرف گئی- انہوں نے مجھے سوٹ دیا' انہوں نے مجھے جیولری دی- ان کے ہاں سے میں نے گھر فون کیا- سعد نے مجھے تائی وا میں ڈنر کروایا- سعد کے ساتھ میں الحمرا میں ڈرامہ دیکھنے گئی- سعد' یہ سعد وہ-'' وہ اپنی بات کہے جاتی اور وہ اپنے کانوں کے سوئچ آف کر لیتی-

''ہاں! انسان کیوں وہ سنے جو سننا چاہتا ہی نہ ہو-'' اس نے کئی بار سوچا- اس دوران وہ ایک بار دو اکٹھی چھٹیاں آنے پر گھر بھی ہو آئی- اس کے ذہن کا بوجھ مزید ہلکا ہو گیا- مگر وہ جمعہ مختلف تھا- جمعرات کو باتھ رومز میں رش دیکھ کر اس نے صفائی دھلائی اور نہانے کا کام جمعہ پر ٹال دیا تھا- اور جس وقت فروا ناشتہ لے کر آئی وہ بالٹی میں سرف گھولے چھپا چھپ کپڑے مل رہی تھی-

''اس کو چھوڑو' ناشتا کر لو' بہت مزے کے ہیں- آلو کے پراٹھے' گرما گرم اور چائے-'' فروا بار بار اس کو لالچ دے رہی تھی- مگر اس کا ارادہ کام مکمل کر کے ہی اٹھنے کا تھا- اسی دوران اس کو اپنا نام اور کمرا نمبر پکارے جانے کی آواز سنائی دی-

''میرا' میرا ہے نا؟'' اس نے تصدیق کے لیے فروا کو دیکھا-

''یقیناً-'' اس نے آم کے اچار کی پھانک منہ میں رکھتے ہوئے کہا- ''فون ہوگا' گھر سے آیا ہوگا-''

''خدا خیر کرے' ابھی کل شام ہی کو تو بابا جان نے فون کیا تھا-'' وہ گھبرا کر بالکنی میں نکلی- اب چوکیدار عین اس کے کمرے کے نیچے آواز لگا رہا تھا-

''وزیٹر ہیں- سارا بی بی!'' اس کی شکل نظر آنے پر اس نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا-

''وزیٹر-'' اس نے مڑ کر فروا کو دیکھا- ''کون ہو سکتا ہے-'' پھر اس نے چوکیدار کو دیکھا- مگر وہ آہستہ قدموں سے لان عبور کر کے برآمدے کی طرف بڑھ چکا تھا-

''ضرور منصور بھائی ہوں گے-'' اچانک وزیٹر کے تصور سے ہی اس کا دل خوش ہو گیا- کمرے سے باہر نکل کر اسے خیال آیا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں- اور وہ ابھی تک رات کے کپڑوں ہی میں ہے- ''مگر پھر کیا ہوا منصور بھائی ہی تو ہوں گے-''

خود کو تسلی دیتے ہوئے وہ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری اور..... بھاگتے قدموں سے باہر کی طرف آئی-

''اوہ!'' گیٹ پر پہنچ کر اسے دھکا سا لگا- ''لو یہ بھی موجود ہے-'' سعد عالم کو عین اپنے سامنے پا کر اس نے سوچا- ''مگر منصور بھائی کہاں ہیں-'' پھر اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں-

''میرے وزیٹر عدالت بھائی-'' مڑ کر اس نے چوکیدار کو دیکھا- ''یہ ہی تو ہیں-'' وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے وارڈن کے گھر کی طرف مڑ گیا-

''جی میں ہی آپ کا وزیٹر ہوں قسمت سے-'' اس نے سنجیدگی سے کہا-

ہاں یہ بھی اس کی قسمت ہی تھی کہ وہ اکثر اسی حلیے میں اس کے سامنے آ جاتی تھی-

''جی فرمائیے- فلزا تو نہیں ہے-'' اس نے ایک بار پھر بلا ارادہ وہ ہی بات کر دی-

''مجھے معلوم ہے- مگر میں آج اس کے پاس نہیں بلکہ آپ سے ملنے بلکہ یہ بھی نہیں آپ کو لینے آیا ہوں-''

''مجھے لینے-'' اس نے حیرت سے اس کو دیکھا-

''جی ہاں- سلمیٰ بھابی کل شام کو ہی پہنچی ہیں آپا کی طرف انہوں نے مجھے آپ کو لینے کے لیے بھیجا ہے- کل شام انہوں نے واپس چلے جانا ہے فیصل آباد-''

وہ اس نئی صورت حال پر پریشان ہو گئی-

''لیکن وہ خود کیوں نہیں آئیں' مجھ سے ملنے کے لیے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا-

''یہ تو آپ انہی سے پوچھ لیجیے گا وہاں جا کر' فی الحال تو انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو فوراً لے آؤں- اب آپ بتائیں چل رہی ہیں یا نہیں-''

یہ لمحہ بڑا ہی مشکل تھا- فیصلے کا لمحہ' کیا کرے اور کیا نہ کرے-

''اچھا- میں ابھی آتی ہوں-'' کچھ دیر گومگو کی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد اس نے کہا اور

واپس مڑ گئی۔

"کہاں؟ کون؟ کیا؟" فروا جو اپنے کمرے کی صفائی میں مشغول تھی' اس کے تیزی سے آنے اور استری اتار کر اپنے کمرے میں لے جانے پر پریشان ہو کر بولی۔ مگر اسے جلدی تھی۔

اور جب وہ واپس نیچے آئی تو اسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے تئیں جتنی بھی جلدی میں کپڑے استری کرنے نہانے اور بال بنانے کا کام کیا۔ نیچے کھڑے شخص کے لیے یہ ٹائم پھر بھی بہت زیادہ تھا۔ اور اس پر کوئی بھی جھنجلا سکتا ہے۔ مگر اس کے اس احساس کے برعکس جب وہ گاڑی موڑ کر مین روڈ پر لایا تو گفتگو کا آغاز اس نے ایک نئی بات سے کیا۔ "آپ اپنی ہم عمر خواتین کے مقابلے میں ایک الگ مزاج کی خاتون ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔" اس نے واقعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔

"میرا خیال تھا کہ میرے آنے پر جو آپ کا حلیہ تھا۔ اسے درست کرتے کرتے آپ دو گھنٹے تو لگائیں گی ہی۔ مگر آپ تو آدھ گھنٹے میں ہی نیچے آ گئیں۔ آپ کو غالباً اس آرائش و زیبائش سے واقفیت ہی نہیں۔ جو دیگر خواتین کرتی ہیں۔" یقیناً وہ گھما پھرا کر وہی بات کہہ رہا تھا۔ جو شنکیاری میں ....اس نے اس کے بارے میں فلزا سے کہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کا ذہن تپ کر رہ گیا۔

"جی نہیں' میں اس کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتی ہوں۔ کیونکہ میرے پاس اپنی ایک شخصیت ہے۔ جس میں میں ایسی کسی زیادتی کی گنجائش کی ضرورت نہیں سمجھتی۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"خوب' گویا آپ خود کو مکمل خیال کرتی ہیں۔" اس نے اسٹیرنگ گھماتے ہوئے اسے دیکھا۔

"یقیناً میں اس دنیا میں مکمل وجود کے ساتھ آئی تھی۔ ہاتھ' پاؤں' بازو' ٹانگیں' آنکھیں' چہرا ناک سب کیا آپ کو کچھ کم لگتا ہے؟"

"واقعی سب کچھ ہے' مگر ایک چیز کی کمی ہے۔ اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔" وہ ذرا مسکرایا۔

"فی الحال تو مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ آپ میرے ساتھ آ کیسے گئی ہیں۔ جبکہ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ آپ انکار کر دیں گی۔ آخر آپ کی مجھ سے بہت زیادہ شناسائی تو نہیں ہے۔"

"اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے آپ آمد کا جو مقصد بتایا۔ اس میں کہیں بھی کوئی جھوٹ نہیں۔ اور اس لیے بھی کہ پھپھو میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ سنجیدہ تھی اور.... یہی لہجہ اپنائے رکھنا چاہتی تھی۔

"اور بالفرض یہ غلط ہوا تو؟"

"تو میرا ایمان اپنی چھٹی حس پر سے اٹھ جائے گا۔"

"اتنا یقین ہے' آپ کو اپنی چھٹی حس پر۔" اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"یہ یقین ہی تو انسان کو حوصلہ اور بہادری دیتے ہیں۔ بے یقینی تو بندے کو کچھ بھی نہ کرنے دے۔ بے یقینی دراصل بے عملی ہوا کرتی ہے۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ گاڑی ماڈل ٹاؤن میں داخل ہو چکی تھی اور اس نے اس کا رخ ایچ بلاک کی طرف موڑا تھا۔ ایک جدید وضع کے مختصر سے

بنگلے کے سامنے گاڑی روک کر اس نے باہر آ کر گیٹ کھولا اور پھر گاڑی اندر لے آیا۔ لان میں بھاگتے پھپھو کے نوید کو دیکھ کر سارا کے اندر کی بے چینی جیسے ایک دم ختم ہو گئی۔ ابھی اپنے تیار ہونے کے دوران اور رستے بھر وہ یہ سوچتی آئی تھی کہ اس نے ایک دم یہاں آنے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔ اور یہ کہ بالفرض پھپھو کی آمد کی بات غلط ہوئی تو وہ خود کو کیا جواب دے گی۔ مگر اس کی حس ....غلط نہیں تھی۔ اس نے گاڑی سے اتر کر نوید کو گلے لگا کر پیار کیا اور اسے گود میں اٹھاتے ہوئے اندر آ گئی۔ پھپھو ڈائننگ روم میں ٹیبل پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھیں۔

"توبہ! اتنی دیر لگا دی۔" اس کی آواز پر سر اٹھا کر انہوں نے کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو یہ ان خاتون کی مہربانی ہے کہ یہ خود کو مکمل سمجھتی ہیں۔ نہ سمجھتی ہوتیں تو نجانے کتنی دیر لگتی۔"

پیچھے سے آواز آئی۔ پھوپھو ان سنی کرتی ہوئی محو گفتگو ہوئیں۔ اور جب وہ بولنے پر آتی تھیں تو پھر کمرے میں سو بندوں کی موجودگی میں بھی صرف انہی کی آواز آیا کرتی تھی۔ یہ خیال اسد بھائی کا تھا۔ جو ان کے شوہر نامدار تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر انہوں نے اس سے عزیزوں' رشتہ داروں سے لے کر پڑھائی' لاہور کی گرد اور دھوئیں' نئے کپڑوں کے پرنٹ' اشیاء کی گرانی اور اپنے میگرین کے قصے ڈسکس کر ڈالے' ان کی اس گفتگو کا ٹیمپو فلزا نے آ کر توڑا۔ اسے دیکھ کر یکدم اس کے چہرے پر حیرت اور ذرا سی ناگواری کا تاثر پھیلا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

"آپ لے ہی آئیں جا کر سارا کو' پہلے تو کہہ رہی تھیں خود مل آتی ہوں۔" اس نے کرسی کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"میں کہاں لے آئی' یہ تو سعد نے ہمت کر لی۔ یہ ہی کہہ رہا تھا' سارا کو ہی لے آئیں' آپ کہاں جائیں گی۔ آپ کے سر میں پہلے ہی درد ہو رہا ہے' میں نے کہا' نیکی ہے تمہاری۔" پھپھو حسبِ عادت بغیر آگے پیچھے کی پروا کیے بولے جا رہی تھیں۔ اور انہیں قطعی احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کی اس بات پر ان کی دونوں ہی بھتیجیاں کتنا چونکی تھیں۔

فلزا نے اپنی مزید حیرت اور ناگواری چھپانے کے لیے سلائس پر جام کی تہہ چڑھانا شروع کی اور وہ خود اپنے سامنے دھرے اخبار پر جھک گئی۔ پھر پھپھو کی نند رابعہ آپا نے کمرے میں انٹری دی۔

"آ گئی سارا۔" وہ یوں مخاطب ہوئیں جیسے ازل سے اس سے گہری واقفیت ہو۔

"چلو اپنی پھپھو کے بہانے ہی سہی آئی تو' ورنہ میں تو کب سے کہہ رہی تھی' سارا کو بھی لاؤ۔ فلزا نے بتایا کہ تم پسند نہیں کرو گی یوں چلے آنا' میں چپ ہو گئی ورنہ میرا خیال تھا کہ ہاسٹل کی زندگی میں کبھی کبھی تو بوریت ہوتی ہو گی' پھر تھوڑے سے چینج میں کیا حرج ہے۔ یہ رشتہ داریاں اور دوستیاں ہی تو سہارا ہوتی ہیں۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر چونک کر فلزا کو دیکھا' وہ بظاہر لاپروا بنی سلائس کتر رہی تھی۔

"سلمٰی تم نے سارا کو ناشتا نہیں دیا۔ چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی' رشید نجانے کہاں رہ گیا۔" پھر انہوں نے

ملحقہ کچن کی جانب منہ کر کے آواز دی۔ ”لو سارا جو تمہارا دل چاہے لو۔ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے اس کے آگے سینکے ہوئے ٹوسٹ اور آملیٹ کی پلیٹیں کھسکاتے ہوئے کہا۔

”دیکھنا‘ آملیٹ بھی تو ٹھنڈا نہیں ہو گیا۔ اور یہ اسد کب جائے گا۔ بھئی‘ سعد بھی نجانے کہاں نکل گیا۔ ساتھ میں عرفی کو بھی لے گیا۔ یہ ماموں‘ بھانجا تو کبھی وقت پر کوئی کام نہ کریں گے۔“ پھر وہ ان سب کو بلانے کے لیے باہر نکل گئیں اور کچھ ہی دیر کے بعد انہیں لیے واپس آئیں۔

”یہ میرا بیٹا ہے عرفان!“ انہوں نے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے کی طرف اشارہ کیا‘ جو اپنی گھسی ہوئی جینز اور نجا ٹرٹلز سے مزین شرٹ میں ملبوس خود سے ہی بتا رہا تھا کہ کس ”ایج“ کا نوجوان ہے۔ ”ایک یہ ہی بیٹا ہے میرا۔ ادریس اسی لیے سب کا لاڈلا۔ چلو ناشتا کرو۔“ پھر وہ حکمیہ لہجے میں بولیں۔

”لو نا سارا! یہ آملیٹ رشید تازہ بنا کر لایا ہے۔“ پھپھو کی خاموشی بھی ٹوٹی۔

”سارا تو کر چکی ہو گی ناشتا‘ فرائیڈے اسپیشل وہ گز گز بھر لمبا آلو بھرا پراٹھا‘ جس کی شکل دیکھ کر ہی انسان کی طبیعت بیزار ہو جائے۔“ فلزا نے چائے کا سِپ لیتے ہوئے گفتگو میں کودنا چاہا۔

”کیا واقعی سارا۔ ایسے ہی ہوتے ہیں تمہارے ہاں کھانے۔“ پھپھو نے اس سے تصدیق چاہی۔

”نہیں‘ کچھ اتنے بھی برے نہیں‘ گزارا ٹھیک ٹھاک ہے۔“ وہ ذرا مسکرا کر بولی۔

”سارا کا کیا ہے۔“ فلزا نے اس کے متعلق گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کو ہاسٹل میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی لگتا ہے۔ ہاسٹل کی زندگی میں سارا سے زیادہ کون رچ بس سکتا ہے‘ صبح و شام کمرے کی دھواں دھار صفائی ستھرائی‘ روزانہ کے روزانہ کپڑوں کی دھلائی۔ بیڈ شیٹس‘ ٹاول سب کچھ جس میں شامل ہے اور وقت پڑے پر چائے وائے کھانا شانا ہر کچھ چلتا ہے‘ سارا انہی کاموں کے لیے ہاسٹل آئی ہے۔ پڑھائی تو ایک اضافی چیز ہے۔“

”اچھی بات ہے نا!“ پھپھو نے کہنا چاہا۔ مگر فلزا انکشافات کے موڈ میں تھی۔

”بلکہ اس کا بس چلے تو اپنی پوری ونگ کے کاریڈورز تک صاف کر دے‘ ایک روز سوئیپر سے کہہ رہی تھی کہ تمہیں تو جھاڑو بھی ڈھنگ سے پکڑنا نہیں آتی تمہاری گرفت خراب ہے جھاڑو کیا خاک پھیرو گے۔“

فلزا کے اندر نجانے کس بات کے ابال اٹھ رہے تھے۔ جن کو وہ اس گفتگو سے باہر نکالنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اس کی باتوں کے دوران اندازہ کرنا چاہا۔

”اچھی بات تو یہ ہے کہ فلزا پڑھنے کے لیے آئی ہے اور یہ ہی کر رہی ہے۔ اضافی باتوں سے اسے کچھ سروکار نہیں‘ میں تو اتنے عرصے میں کچھ بھی نہ سیکھ پائی۔“

اس نے اس گفتگو کے آخر میں متانت سے کہتے ہوئے پھپھو کو دیکھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ فلزا کے اندر اب نئے سرے سے ابال اٹھنا شروع ہو گئے ہوں گے۔

”اس سارے ڈسکرپشن (Description) میں کوئی یہ نہ بھول جائے کہ سارا نے ناشتا نہیں کیا

ہوا۔ کیونکہ انہیں موقع ہی نہیں مل سکا۔ فلزا میرے خیال سے تم اب کچھ دیر کے لیے اپنی چائے کی خوبیوں اور خرابیوں کی کھوج لگا کر اس کا تجزیہ پیش کرو۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اچانک سعد عالم بولا اور اپنے آگے دھری فرائی انڈوں کی پلیٹ بھی سارا کو پیش کی۔ فلزا نے جس انداز میں پیالی پٹخی تھی۔ اس نے کچھ دیر کے لیے سب ہی کو اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ اسد بھائی اور رابعہ آپا کے میاں جمیل احمد جنہیں رابعہ آپا کے علاوہ باقی سب بھائی میاں کہتے تھے سے ملی۔ اور ان کے ساتھ اپنے پسندیدہ موضوعات ادب‘ اور فلسفہ پر گفتگو کرتی رہی۔

”یہ لڑکی سلمٰی۔“ گفتگو کے دوران انہوں نے پھپھو کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔

”کہاں چھپائی ہوئی تھی اب تک تم لوگوں نے۔ یہ تو بڑے کمال کی لڑکی ہے۔ دل خوش ہو گیا اس سے مل کر‘ آج کل کی نسل میں ایسی باذوق اور سلیقہ گفتگو سے واقف لڑکیاں کہاں ملتی ہیں۔ ونڈرفل‘ بھئی ونڈرفل۔“ انہوں نے پائپ منہ میں دبانے سے پہلے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ شکر کہ فلزا اس وقت اس کمرے میں موجود نہیں تھی۔ البتہ سعد عالم تھا جو نوید اور عرفان کو کرکٹ بال پر گرپ درست رکھنے کی ترکیبیں بتا رہا تھا۔ اور جس نے ان کمنٹس پر.... ایک لمحے کو سر اٹھا کر اپنے بہنوئی کو دیکھا تھا۔ اور پھر کچھ کہنے کا ارادہ کر کے توڑتے ہوئے بچوں کو باہر چلے آنے کا کہا تھا۔

”یہ فلزا کیسی جا رہی ہے۔“ ذرا تنہائی ملنے پر پھپھو نے اس سے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

”کیا مطلب کیسی جا رہی ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”بھئی‘ میں تو پیچھے ہی رہ گئی۔ اس نے اس گھر میں خوب دوستی جمالی ہے‘ ٹھیک ہے کہ میری ساس اس کی اماں کی قریبی سہیلی رہی ہیں۔ مگر اتنا فرینک ہو جانا مجھے کچھ اتنا پسند نہیں ہے۔“ پھپھو کی یہ پرانی عادت تھی۔ ان کو جو بات اچھی یا بری لگتی تھی۔ وہ بے ساختہ بلا دھڑک اس کا اظہار بھی کر دیتی تھیں۔

”اور جو سچ پوچھو تو مجھے اس کا یوں بغیر جھجکے ہر بات کر دینے کا طریقہ بھی پسند نہیں۔ خیر مجھے کیا وہ خود سمجھدار اور باشعور ہے‘ کوئی بچی تو نہیں ہے۔“ انہوں نے اپنے اعتراضات بند کیے۔

”ویسے سعد ایک شریف انسان ہے۔“ پھر انہوں نے ایک دوسرا موضوع چھیڑتے ہوئے رائے طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”لیکن اس کا خیال ہے کہ تم اسے صرف انسان سمجھتی ہو‘ شریف وغیرہ کے بارے میں تمہاری رائے محفوظ ہے۔“ وہ سیدھی ہوتی ہوئی بولیں۔

”مگر میری رائے کا کیا تذکرہ۔ میری تو ان سے کوئی اتنی گفتگو بھی نہیں کہ رائے قائم کروں۔“ اس نے اٹھ کر بک ریک سے میگزین کھینچتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بھی ہے۔ مگر وہ تو رکھتا ہے رائے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے بارے میں-'' کمرے سے باہر جاتے جاتے انہوں نے جو بات مکمل کی اس کے سیاق وسباق سے وہ واقف تھی- وہ اسے مردہ دل' بداخلاق اور بے علم قسم کی لڑکی ہی سمجھتا تھا- اور یہ ہی رائے ہوگی جو اس نے اس کی سگی پھپھو کے حضور پیش کی ہوگی- مگر اب اس نے کسی بھی بات کا کوئی نوٹس نہ لینے کا ارادہ کر رکھا تھا-

وہ دن اچھا گزرا تھا رابعہ آپا نے دوپہر میں خاص طور پر.... ہاسٹل والوں کے لیے کھانا بنوایا تھا- اور اس دوران بھی فلزا کے سارا کے بارے میں بے لاگ تبصرے جاری رہے تھے-

''ہاں کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں کے بارے میں ہی گفتگو کرتے رہنے کا مراق ہوا کرتا ہے-'' اس نے اپنے اس دل کے ساتھ سوچا جس کو کچھ عرصہ قبل ہی اس نے دوبارہ سے وسعت اور فراخ دلی بخش دی تھی-

شام کو اسد بھائی اور بچے باہر جانے کی بات کرنے لگے' بھائی میاں کے بارے میں اسے معلوم ہوا کہ وہ بہت کم باہر نکلتے تھے- پھپھو پیکنگ میں مصروف تھیں- اور خود اس نے واپسی کا ہنگامہ مچا رکھا تھا-

''آج یہیں رہ جاؤ' آخر یہ فلزا بھی تو کل صبح ہی جائے گی- سعد آفس جاتے ہوئے چھوڑ دے گا-'' رابعہ آپا نے محبت سے کہا-

''جی نہیں' مجھے آج واپس جا کر بہت سے کام کرنے ہیں- اور اس میں مشکل بھی کیا ہے- باہر نکل کر وین پکڑوں گی اور آدھ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی-'' اس نے سنجیدگی سے کہا-

''خیر وین وغیرہ کی کیا ضرورت ہے- جو شخص تمہیں لانے کی تجویز پیش کر سکتا ہے' وہی واپس بھی چھوڑ سکتا ہے- لیکن اچھا ہوتا جو تم ٹھہر جاتیں' اچھی گفتگو رہتی-'' بھائی میاں نے کہا- مگر وہ اسی وقت واپس جانا چاہتی تھی-

''افوہ بھئی کیا مصیبت ہے' فضول میں اپنی اہمیت جتانے کی کوشش-''

فلزا نے اپنے مہندی سے رنگے چمکدار بالوں میں تیزی سے برش چلاتے ہوئے کہا- اس نے ایک مسکراہٹ جواب میں اس کی طرف پھینکی اور پھپھو کی طرف متوجہ ہوئی-

''اچھا کیا جو آپ نے مجھے بلوالیا- اتنے عرصے بعد آپ سے مل کر بڑا مزا آیا-''

''اچھا ایسا ہی اصرار ہے تو یوں کرتے ہیں کہیں باہر نکلتے ہیں پھر تمہیں بھی چھوڑ آئیں گے-'' اسد بھائی نے کہا-

رابعہ آپا نے اس کو اپنے ہاں پہلی آمد پر ملٹی کلرڈ ایمبرائیڈری کا خوبصورت دوپٹہ دیا اور بار بار آتے رہنے کی تاکید کی' فلزا کے چہرے کا تناؤ بڑھ رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد واپس چلی جائے-

نوید کے اصرار پر وہ لوگ ریس کورس پارک کی طرف نکل گئے- مگر وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی-

''اب چلیں نوید-'' اس نے کوئی دسویں مرتبہ کہا مگر نوید کا سر ایک بار پھر انکار میں ہلا-

''آپ لوگ یہاں گھومیں اسد بھائی' میں اتنے میں سارا کو چھوڑ آتا ہوں' انہیں غالباً بہت جلدی ہے-'' سعد ٹہلتا ٹہلتا ایک دم ان کی طرف آکر بولا- ''آئیے-'' پھر اس نے اس کی جانب دیکھا-

''آپ کو بار بار زحمت کرنا پڑے گی-'' اس نے شرمندہ سا ہو کر کہا-

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' آپ آئیے-'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا- ''ہاں جاؤ بھئی' یہ بچے تو ابھی چلنے کے نہیں لگتے-'' اسد بھائی نے سر ہلایا-

''اچھا جا ہی رہے ہو تو میں بھی چلتی ہوں' صبح کے لیے ایک اور سوٹ ہی لے آؤں گی-'' فلزا نے اس کو اٹھتے دیکھ کر ایک بودا سا بہانا بنایا-

''بہتیرے کپڑے ہیں تمہارے پاس' تم اسد بھائی کو بور نہیں کرو گی-'' وہ تیزی سے آگے چلتا ہوا بولا اور اس کے پیچھے باہر آتے ہوئے اس نے فلزا کی بڑبڑاہٹ واضح طور پر سنی تھی-

''مجھے افسوس ہو رہا ہے' یوں آپ کو زحمت دینے پڑی' اسی لیے میں نے کہا تھا وہیں سے وین پر چلی آتی-'' راستے میں اس نے گفتگو کا آغاز خود کیا-

''اچھا-'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا- ''لیکن ایک بات بتائیں' آپ ہر وقت ایک افسوس کی سی کیفیت میں کیوں رہتی ہیں- کیا خوشی کی کوئی بات کبھی آپ سے دوچار نہیں ہوتی-''

''خیر یہ ایک دوسری بات ہے کہ مجھ پر کیا کیفیت طاری رہتی ہے کیا نہیں-'' اس نے ایک دم برا مانتے ہوئے کہا- ''البتہ معلوم ہوتا ہے آپ کو دوسروں کے بارے میں رائے زنی کی بہت عادت ہے-''

''ہونی بھی چاہیے' جو لوگ ہم سے ملتے ہیں- ان کا کوئی نہ کوئی امیج تو ضرور بنتا ہے ہمارے ذہن میں' یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر کسی رائے یا تاثر کے آپ کسی شخص سے بار بار ملتے رہیں.....'' اس نے اس کے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر کہا-

''اور اس کا اظہار- ہر کسی کے سامنے کرنا بھی آپ ضروری سمجھتے ہیں شاید- خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے-'' اس نے بات کو طول پکڑتا دیکھ کر کہنے والی بات کہنے کے بعد بات بدل دی- ''ویسے ابھی آپ فلزا کے ساتھ زیادتی کر آئے ہیں ممکن ہے اسے کسی چیز کی اشد ضرورت ہو-''

''فلزا کو جس چیز کی اشد ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے وہ پیچھے پڑ جاتی ہے- یوں ہی بے دم سا اصرار نہیں کیا کرتی- یہ تو محض بہانا تھا- اور میں بہانوں پر کچھ اتنا غور نہیں کیا کرتا-'' اس نے اسی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا-

''مگر اس میں حرج ہی کیا تھا- کم از کم مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے-''

''حرج تو تھا مگر آپ کو کیوں عجیب لگ رہا ہے- شاید آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر پا رہیں- اور اگر ایسا ہے تو کچھ غلط بھی نہیں ہے- آخر مجھ سے آپ کی معمولی سی شناسائی ہی تو ہے-''

''جی ہاں' ایسا ہی ہے- میری آپ سے معمولی سی شناسائی ہی ہے' اور یہ کافی نہیں ہوا کرتی' لیکن جہاں تک اعتماد کی بات ہے' وہ مجھے ہے- آپ سے زیادہ خود اپنے آپ پر' میں جانتی ہوں کہ آپ

چاہیں بھی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" ایک دم ہی بلاوجہ اس کا دماغ الٹ گیا۔

"یقیناً میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ جو چیز آپ کے پاس سب سے زیادہ قابل قدر ہے' وہ تو پہلے سے ہی بگڑی ہوئی ہے' مزید کیا بگاڑی جا سکتی ہے۔" وہ ذرا مسکرا کر بولا۔

"یا خدایا! زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی صورتِ حال سے پالا پڑا ہے۔ میں چاہوں بھی تو شاید عمر بھر آپ کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکوں گا۔" اس نے سر ذرا سا پیچھے کر کے ہلاتے ہوئے کہا۔

"آیئے! آپ کا عزیز از جان ہاسٹل آ گیا۔" پھر اس نے گاڑی موڑ کر ہاسٹل والی سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ روایتی مہمان نواز خواتین کی طرح جن میں سے بے شمار اس ہاسٹل میں رہتی ہیں۔ مجھے اندر آنے یا کسی مشروب وغیرہ کی آفر نہیں کریں گی۔" گاڑی روک کر اس کے باہر نکلنے سے پہلے اس نے کہا۔

"بلکہ شاید مجھے ہی آپ کا شکریہ ادا کرنا پڑے۔ صبح میرے ساتھ جانے پر اور اس وقت واپس آنے پر۔"

"جی ہاں! مجھ میں کوئی بھی خصوصیت روایتی مہمان نواز خواتین والی موجود نہیں ہے۔" اس نے دروازے کو ان لاک کر کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میرے اپنے کچھ اصول ہیں مگر شکریہ کہنے میں وہ قطعی مانع نہیں' بہت شکریہ صبح لے جانے اور اب چھوڑ جانے کا۔ خدا حافظ۔"

وہ تیزی سے باہر نکلی اور تیز قدموں سے چلتی گیٹ سے اندر آ گئی۔

اندر فروا تھی اور اس کے بے انت سوال۔ "کہاں گئی تھیں؟ کس کے ساتھ گئی تھیں؟ کیوں گئی تھیں؟ کیا کیا' کیسا رہا؟ وغیرہ وغیرہ" اور اس کے ادھورے جوابوں کے دوران وہ مسکراتی رہی۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ کچھ باتیں فرض کر لینا غلط ہوتا ہے' مگر کچھ باتیں فرض کر لینا غلط نہیں بھی ہوتا۔ دیکھا' کتنا صحیح کہا تھا' اب یہ جو وہ موصوف تمہارے سامنے فلزا کو نظر انداز کر کے کِلساتے رہے ہیں اس کو تم کیا کہو گی۔"

"کہنا کیا ہے سوائے اس کے کہ وہ شخص بے حد چالاک ہے اور اس کی ایک ٹریجڈی یہ ہے کہ دوسروں کو بہت ہی احمق سمجھتا ہے۔" اس نے رابعہ آپا کے دیے دوپٹے کے رنگ دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوسرے ہوں ہی احمق تو وہ کیا کرے' ویسے آپا جان نے دوپٹہ خوب دیا۔ معلوم نہیں بھائی صاحب نے تمہارے بارے میں کیا انفارمیشن دی ہو۔" فروا جو کچھ فرض کر چکی تھی اس پر مصر تھی۔

"اب تم کہانیاں تو بنانے نہ بیٹھ جاؤ۔ سارا وقت اس فضول قسم کے گروپ میں بیٹھ بیٹھ کر تمہیں بھی کوئی اور کام کرنا یاد نہیں رہ گیا سوائے مفروضے قائم کر کے کہانیاں بنانے کے۔" اس نے ناراضگی سے کہا۔

"کہانیاں خود بن جاتی ہیں۔ خاص طور سے کوئی گھڑنے نہیں بیٹھتا۔ خیر اب تمہیں ہر بات کا تاریک

پہلو دیکھنے کی عادت ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ چھوڑو آؤ ٹی وی روم میں چلتے ہیں ڈراما دیکھنے۔"

اس نے اسے اٹھانا چاہا' مگر وہ تھکن محسوس کر رہی تھی اور اس کو صبح کے آدھے دھوئے کپڑوں کا بھی کچھ کرنا تھا' اس لیے وہ وہیں رہی۔

اور تنہا ہوتے ہی خود سے بے تحاشا جنگ کے باوجود وہ شخص اس کے قریب آ موجود ہوا۔

"ہاں' تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم عمر بھر میرے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکو گے کیونکہ ہر فارمولا آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتا اور تمہارے لیے تو میں نے خاص طور سے اپنے سارے مہرے سنبھال کر ایک جگہ اکٹھے کر لیے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کیا آئے گا۔ میں کسی بھی قسم کی شکست سے خوف کھاتی ہوں' اس لیے اب مجھے حقیقت کی دنیا میں رہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔ فلزا جیسی مہمان نواز' زندہ دل خاتون کے ہوتے ہوئے تمہیں میرے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور اب جاؤ کیونکہ میں تمہیں خدا حافظ کہہ دینا چاہتی ہوں۔" اس نے سختی سے تصور میں براجمان اس شخص سے کہا۔ اور اپنے کاموں میں دل لگایا۔

مگر یہ اس کی قسمت تھی کہ اس کے بعد سے وہ شخص اتنی بار اس سے ٹکرایا تھا کہ خدا حافظ کہہ دینے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

وہ اگلا ویک اینڈ تھا۔ اور فروا کو اپنے شہر کی کسی لڑکی کے ڈیڈی راستے میں مل گئے تھے۔ اس نے اسی وقت ان کے ساتھ گھر جانے کا پروگرام بنا لیا اور وہ ایک بور ویک اینڈ کے تصور سے کانپتی ہوئی دوپہر سے شام تک سوتی رہی۔

شام کو اس کے دروازے پر زوردار دستک نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"سات بجے کامن روم میں نائلہ کی برتھ ڈے منائی جا رہی ہے' سارا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" یہ ناہید تھی جو اسی کے ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔

ہاسٹل میں ہونے والی ایسی تقریبات کا بھی اپنا مزا تھا۔ اچانک پروگرام بنتا تھا' اچانک ہی زبانی انویٹیشن بھیجے جاتے تھے اور پھر سب کے گفٹس ادھار پر اٹھ جاتے۔ اس نے بوریت سے بچنے کے لیے اسی وقت تیار ہونے کا فیصلہ کیا۔

اور جب وہ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو اس کے کمرے میں اس کی کلاس فیلوز براجمان تھیں۔

"سارا! تم لال جوڑا پہنو یا پھر اورنج' نہیں تو پھر رسٹ تو ضرور ہی پہنو۔" وہ مشورہ دے رہی تھیں۔

"ارے بھئی' ہماری ہی تقریب ہے ناں' کون سا کوئی اور دیکھ رہا ہے۔ کبھی تو ان دھیمے رنگوں کی دنیا سے باہر نکلو۔"

مگر اس کے کپڑوں میں کوئی ایسا کپڑا نکل ہی نہ سکا جو ان کے اسٹینڈرڈ پر پورا اتر سکتا۔

ایک بلیک سوٹ انہیں پسند آیا' جس کے ساتھ انہوں نے زبردستی اس کو فروا کا گولڈن کڑھائی والا بلیک دوپٹا پہنا دیا۔ کسی کمرے سے میک اپ ادھار لے کر اور کسی سے جھمکیاں لے کر اس کے

کانوں میں اڑس دی گئیں- اس کو سب اجنبی لگ رہا تھا- مگر ان کا دل رکھنے کو اس نے وہ سب بخوشی پہن لیا-

کامن روم میں میوزک تھا' رنگ تھے خوشبوئیں تھیں- وہ دیر تک ایک کونے میں بیٹھی یہ مسرور چہرے دیکھتی رہی اور ان کے ساتھ شریکِ گفتگو ہوتی رہی-

''سارا! آؤ ذرا دیکھ آئیں' محی الدین نے ابھی تک باٹلز نہیں بھجوائیں-'' ناہید کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ اٹھ کر کینٹین کی طرف آ گئی-

باہر تاریکی پھیل رہی تھی اور لائٹس آن ہو چکی تھیں- ناہید محی الدین سے الجھ رہی تھی' جب چوکیدار نے اس کے قریب آ کر کہا-

''فلزا بی بی کے گیسٹ ہیں- وہ بازار گئی ہوئی ہیں' آپ کو بلا رہے ہیں-''

اس نے ذرا پیچھے ہو کر گردن موڑی' وہ عین گیٹ کے درمیان کھڑا تھا-

''ہیلو!'' اسے قریب آتا دیکھ کر وہ مسکرایا- ''اوہو! آج تو میں نے آپ کو بمشکل پہچانا- لگتا ہے آج آپ کو اپنے مکمل ہونے کے نظریے پر کچھ شک ہو گیا ہے جب ہی-'' اس نے ایک نظر دوبارہ اس کے حلیے پر ڈالی- ''خیر جو بھی ہے' یقین کریں بہت اچھا ہے' زندگی کا احساس ہو رہا ہے-''

''آپ فلزا کے پاس کسی کام سے آئے تھے؟'' وہ اس ساری بات کے جواب میں سنجیدگی سے بولی-

''جی ہاں-'' اسے بھی شاید یاد آ گیا- ''یہ پیکٹ آیا ہے ایبٹ آباد سے' امی گئی ہوئی تھیں' وہی لائی ہیں فلزا کے لیے-'' اس نے ایک پیکٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا- ''اس تک پہنچا دیجیے گا-''

اس نے پیکٹ لے کر واپسی کے لیے قدم اٹھایا-

''اور سنیے!'' پیچھے سے آواز آئی- ''کیا آپ کے اصول آپ کو دوبارہ رابعہ آپا کی طرف آنے کی اجازت دے سکتے ہیں' بھائی میاں یاد کر رہے تھے آپ کو اور میری امی بھی آئی ہوئی ہیں-''

''شکریہ! لیکن میں بے حد مصروف ہوں آج کل-'' اس نے رکھائی سے کہا اور خدا حافظ کہہ کر چلی آئی-

''یقین کریں' یہ بہت اچھا ہے' زندگی کا احساس ہو رہا ہے-'' کامن روم میں واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے اور ڈنر میں شریک ہوتے ہوئے بار بار یہ جملہ اس کے کانوں سے ٹکراتا رہا-

''کیا کچھ جملے' کچھ لفظ بھی زندگی سے بھرپور ہو سکتے ہیں' جیسے یہ الفاظ جو بار بار میرے کانوں سے ٹکرا رہے ہیں-'' رات کو فلزا کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اس نے سوچا-

فلزا کمرے میں اکیلی تھی اور اس کے بیڈ پر مختلف پیکٹوں کا انبار لگا ہوا تھا-

''گھر جانے سے پہلے سب کے لیے یہاں کی کچھ نہ کچھ سوغات خرید رہی ہوں-''

اس نے ذرا شاہانہ انداز میں کہا- اس نے پیکٹ اس کے حوالے کیا-

''ہا! شاہدہ آنٹی آئی ہوئی ہیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا-'' اس نے پیکٹ کھول کر کپڑے نکالتے ہوئے کہا- ''کون.... سعد آیا تھا؟ اللہ کس قدر فراڈ ہے یہ شخص- کہہ رہا تھا کہ اب کے آیا تو تمہیں آواری میں ڈنر کراؤں گا- آیا ہی ایسے وقت جب میں نہیں تھی- اسے بتایا بھی تھا کہ جمعرات کی شام کو میں بازار جاؤں گی- بھول گیا ہو گا-''

وہ اپنی کہے جا رہی تھی اور اسے یہ احساس تک نہیں تھا کہ اس وقت سے اب تک اس نے ایک بار بھی سارا سے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا-

''یہ پستے کا ڈبا تمہارے لیے بھیجا ہے امی نے....'' کچھ ٹٹولنے کے بعد ڈبا نکال کر اس نے اسے دیا-

''ہاں' تم بیٹھو تو اور کوئی پیغام تو نہیں دیا سعد نے-'' پھر اسے یاد آیا-

''نہیں' اور میں اب اوپر جا رہی ہوں-'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا- اس کی نظریں فلزا کی الماری پر لگے اسٹکر کو پڑھ رہی تھیں-

I MAY HAVE MY FAULTS, BEING WRONG IS NOT ONE OF THEM

''واقعی بزعم خود فلزا کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی-'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سوچا-

''میں نہیں ملی ہوں گی تو مجبوراً اس نے تمہیں بلوا لیا ہو گا-'' پھر اسے فلزا کی کہی بات یاد آئی-

''وہ یہ پیکٹ چوکیدار کے حوالے بھی کر سکتا تھا اور وہ تمہارے بتانے کے باوجود کہ جمعرات کی شام کو تم نہیں ہو گی اسی وقت کیوں آیا- ارے فلزا بی بی! خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کا تو ڈھیر سامنے پڑا ہے' جس کو چاہے اٹھا لو-''

اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلتے ہوئے اور پھر منہ دھوتے ہوئے اس نے سوچا- اس روز اسے دیر تک نیند نہیں آئی-

اس نے بہت عرصے کے بعد دوبارہ وہ رومانٹک شارٹ اسٹوری پڑھی-

''کیا ہو' جو چند لمحوں کے لیے کسی خوش فہمی پر ہاتھ مار لیا جائے' اس نے سوچا- اور لائٹ آف کر کے سونے کی کوششوں میں مصروف ہو گئی-

اگلی صبح بھی تازہ اور خوشگوار تھی- آتی سردیوں کی نیم خشک ہوا نے اسے مزید خوشگوار بنا دیا تھا-

وہ جمعہ کے مخصوص کام جلدی جلدی نپٹا کر ناشتے کی ٹیبل تک فارغ ہو چکی تھی-

ڈائننگ ہال سے ناشتا اور چائے لے کر اوپر آتے آتے اس نے کچھ دیر نیوز پیپر اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر تازہ خبروں اور نذیر ناجی کے کالم پر نظریں دوڑائیں- اس وقت تک سب کچھ اچھا لگ رہا تھا- اخبار سے ہٹ کر اوپر آتے آتے اس نے ذرا کی ذرا مڑ کر دیکھا اور کہانیاں سچ ہی تو کہتی تھیں' ''پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا پتھر کے ہو جاؤ گے-''

اوپر آ کر.... ناشتا میز پر رکھتے ہوئے اس نے سوچا- ''جو میں مڑ کر نہ دیکھتی تو وہ رات بھر کی کیفیت

ذرا دیر تو مزید قائم رہتی۔'' اس کی نظروں کے سامنے سے گرے سوزوکی میں بیٹھی فلزا اور سعد کا منظر ہٹ کر نہیں دے رہا تھا۔ یہ منظر کچھ دیر پہلے ہی اس نے ہاسٹل کے کھلے گیٹ سے دیکھا تھا۔

''اس احمقانہ راستے پر چلنے کی خواہش لے کر ایک قدم آگے بڑھتے تو ایک ٹھوکر دوسرا قدم دوسری ٹھوکر اور تیسری ٹھوکر پر چاروں شانے چت۔'' اس نے دیر تک یہ ہی ایک بات سوچی۔

''ظاہر ہے کہ ایک اچھی خاصی باشعور لڑکی ہوتے ہوئے ایسی احمقانہ باتیں سوچو گی تو سزا تو ملے گی۔'' دماغ نے کہا۔

''کیا بکواس ہے بھئی، اچھی خاصی باشعور لڑکی کے پاس دل نہیں ہوتا کیا؟ ایم اے میں پڑھنے سے لطیف احساس ختم ہو جاتے ہیں۔ خدا نے دنیا میں اچھی چیزیں انسان کے دیکھنے اور پسند کر لینے کے لیے بھیجی ہیں ناں، اگر اچھی لگ جائیں تو انسان کیا کرے۔''

دل نے جواب میں دماغ کو بری طرح ڈانٹا۔

''تو پھر بھگتو، اس راہ میں تو کانٹے بہت ہیں۔'' دماغ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''ایک کانٹا فلزا وقار ہے، جو بہت بڑی حقیقت ہے اور اصل کانٹا وہ اچھی چیز ہے جو تمہارے دل کو اچھی لگ گئی ہے۔ وہ شخص یقیناً صنفِ مخالف کے احساسات چھیڑ دینے کا گُر اچھی طرح جانتا ہے۔''

''دفع کرو بھئی۔'' اس نے دل دماغ کی اس کشمکش کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ناشتا برف ہو چکا تھا اسے ایک طرف کر کے اس نے بستر ٹھیک کیا۔ کپڑے استری کیے اور نہانے چلی گئی۔

نہانے کے بعد اس نے سنجیدگی سے کتابیں کھولیں اور دن بھر اپنے اردگرد کی آوازوں سے بے نیاز ان میں کھوئی رہی۔ نوٹس بنا بنا کر اس کی انگلیاں دکھنے لگیں مگر وہ اپنے اندر کی فرسٹریشن کو چھپانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ساتھ والی نائلہ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے ظہر کی نماز پڑھی اور زبردستی سو گئی۔

شام کو اٹھ کر چائے پینے کے لیے وہ جان بوجھ کر نیچے چلی آئی اپنا مگ پکڑے پکڑے اس نے ٹی وی روم کے سامنے والے لان کا رخ کیا۔ ٹی وی روم میں دن بھر کوئی میچ لگا رہا تھا اور اب لڑکیاں اس کے ختم ہونے کے بعد باہر نکل رہی تھیں۔

''پاکستان جیت گیا، پاکستان نے میچ جیت لیا۔''

ادھر ادھر سے یہ ہی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر کرکٹ فوبیا میں مبتلا ایک گروپ چائے لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ سب آج کے میچ پر گفتگو کر رہی تھیں۔

اس کے اتار چڑھاؤ کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ کرکٹ کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھی، مگر اس کی فرسٹریشن اسے ان کی باتوں میں الجھا رہی تھی۔

''عاقب نے کمال کر دیا، سات وکٹیں پلس اے ہیٹ ٹرک۔'' کوئی کہہ رہی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا، ان میں سے بہترین باؤلر کون ہے؟'' دوسری نے کہا۔

''اور زاہد فضل کو نہ بھولو، اے گریٹ اننگز۔''

تیسری بولی۔ اس کے لیے یہ نام سراسر اجنبی تھے مگر وہ سنتی رہی۔

پھر ایک ایک کر کے وہ اٹھنے لگیں۔

آخر میں غالباً وہ اکیلی ہی رہ گئی تھی۔

''اصل میں جو عاقب جاوید ہے، وہ ٹیم کو مشکل سے نکالنا جانتا ہے اور وقار یونس دوسری ٹیم کو مشکل میں ڈالنا جانتا ہے۔'' آخری لڑکی نے اٹھ کر جاتے جاتے مڑ کر اس سے کہا۔

وہ اسے بھی کرکٹ کی کوئی اچھی کریٹک سمجھ رہی تھی۔

''اور وسیم اکرم یہ دونوں کام جانتا ہے، بس یہ ہی کمال ہے ان سب کا۔''

''کام تو یہ سب ہی مہارت کا ہے۔'' اس نے سر اٹھا کر کہا مگر اس کی مخاطب لان کے دوسرے سرے پر پہنچ چکی تھی۔

''اپنے کام میں مہارت تو کسی کسی ہی کے بس کا روگ ہے۔'' اس نے مگ سے زمین کھودتے ہوئے کہا۔

''سارا بی بی!'' پھر اسے فون اٹینڈنٹ کی آواز آئی۔

''گیسٹ ہیں جی؟'' اس کے مڑنے پر اس نے بتایا۔

''میرے گیسٹ!'' وہ چونک گئی۔ مگر گیٹ سے باہر کھڑے جاوید بھائی کو دیکھ کر اس کی حیرت خوشی میں بدل گئی تھی۔

''آپ کب آئے اور میرے پاس اتنی دیر سے کیوں آئے ہیں شام ڈھلے؟''

اس نے گرے سوزوکی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''آج ہی پہنچا ہوں دوپہر کو، پتا چلا کہ تم ویک اینڈ پر رابعہ آپا کی طرف آنا جانا کچھ اتنا پسند نہیں کرتیں، اس لیے ملنے چلا آیا۔ یہی وقت ملا تھا، کل صبح کسی کام کے سلسلے میں خواری کا ارادہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''جانا پسند نہیں کرتیں۔'' اس نے دل میں دہرایا۔ یہ یقیناً اس شخص کی اڑائی ہوگی۔

''آئیں، میں آپ کو چائے پلواؤں کینٹین سے۔'' اس نے ان کو اندر آنے کو کہا۔

''کیا خیال ہے یار، چائے پی لی جائے؟'' جاوید بھائی نے مڑ کر سعد سے پوچھا جو نسبتاً تاریکی میں کھڑا تھا۔

''تم جاؤ یار! میرا آنا ان کے اصول شاید پسند نہ کریں۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''اصل میں ہم نکلے تو یہ کہہ کر تھے کہ کسی دوست کی طرف جا رہے ہیں۔'' جاوید بھائی نے اس کی بات سمجھے بغیر اس کی طرف مڑ کر کہا۔

''پھر خیال آیا آج تم سے مل لیا جائے، چلو کچھ دیر اس ہاسٹل سے نجات حاصل کرلو کہیں باہر

تمہیں کھانا کھلاتے ہیں-"

"وہ..... باہر....." اس نے گرے سوزوکی کو دیکھتے ہوئے کہا- "آپ چائے پی لیتے' یہیں کچھ باتیں ہو جاتیں-"

"چھوڑو یار! مجھ سے کیا تکلف' تم فٹافٹ تیار ہو کر آؤ-" جاوید بھائی نے اس کی بھی کچھ نہیں سمجھی-

"تیار کیا ہونا ہے-" اس نے کاٹن کے ڈھیلے کرتے کو سیدھا کیا اور بالوں پر ہاتھ پھیرا- "مگر باہر جانے کے لیے اس وقت وارڈن سے اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور وارڈن نجانے کمرے میں ہوں بھی یا نہیں-"

اس نے ایک اور بہانا گھڑنے کی کوشش کی-

"جہاں تک مجھے علم ہے یہاں ایک نہ دو پوری چار وارڈنز ہیں-" پیچھے سے آواز آئی-

"بہانا نہیں سارا! جلدی کرو جو کرنا ہے' میں تم سے یہاں کھڑے کھڑے باتیں نہیں کروں گا' خاصی مضحکہ خیز جگہ ہے-"

جاوید بھائی نے شور مچا دیا- اور وہ گھبرا کر وارڈن کے کمرے کی طرف بھاگی- گیٹ کیپر کو مطلع کر کے وہ انہی تیز قدموں سے چلتی باہر آ گئی-

گاڑی میں بیٹھ کر جاوید بھائی اپنی داستان سنانے میں مشغول ہو گئے- پنڈی میں سب کیسے تھے منور بھائی کا چانس امریکہ جانے کا بن رہا تھا- بابا جان کی دوائیوں کے ریج میں اضافہ ہو رہا تھا اور امی کے گھٹنوں میں تکلیف تھی-

"یاسر بھی بضد ہے امریکہ جانے پر- یار! ویسے یہ امریکہ مینیا بھی کمال شے ہے-"

اس سے باتیں کرتے کرتے انہوں نے دفعتاً سعد سے کہا- جواب میں وہ آہستگی سے ہنس دیا-

"فرسٹریٹڈ قوم ہے' فرار چاہتی ہے اور اس کی خواہش میں مزید بیڑیاں پاؤں میں ڈال لیتی ہے-"

"میں گھر نہیں جاؤں گی جاوید بھائی-" اس نے اسے ماڈل ٹاؤن کی طرف گاڑی بھگاتے ہوئے دیکھ کر قطعیت سے کہا-

"آپ فکر نہیں کریں' ہم آپ کو لے بھی نہیں جا رہے' ہم بھی اصول شکن لوگ نہیں ہیں- ہاں البتہ بُت شکن ضرور ہو سکتے ہیں-" اس نے جواب میں سختی سے کہا-

"ہاں جاوید! آؤ تمہیں آج ذرا چائنا گارڈن لے چلیں' یہ بھی ایک اچھا تجربہ رہے گا-" پھر وہ جاوید بھائی سے مخاطب ہوا-

چائنا گارڈن میں اس نے اپنے تجربے کی بنا پر بہترین مینو کا انتخاب کیا-

"بہت اچھی اور خوبصورت جگہ ہے-" جاوید بھائی نے نظریں دوڑاتے ہوئے کہا-

"اور جو فلزا کو علم ہو جائے کہ ہم یہاں اس وقت تفریح کر رہے ہیں' بجائے ناصر کا گھر ڈھونڈنے کے تو وہ ہمارا کیا حشر کرے؟"

"ضروری ہے کہ ہر بات کا اسے علم ہو- کچھ باتیں چھپا لینے میں کوئی حرج نہیں ہوا کرتا-" سعد نے لاپروائی سے کہا-

پھر وہ دونوں اس روز کے میچ کو ڈسکس کرنے لگے-

"تین مسلسل وکٹیں اور وہ بھی ایل بی ڈبلیو کمال ہیٹ ٹرک- پاکستان دراصل سلو سٹارٹر ہے' جب ہی پہلے میچ ہار کر بھی جیت گیا- اب ورلڈ کپ کی دیکھو-" وہ دیر تک ان کی یہ گفتگو بے دھیانی سے سنتی رہی-

"کیوں سارا! تم کیوں خاموش ہو؟" اچانک جاوید بھائی کو خیال آیا-

"جو باتیں آپ کر رہے ہیں' میری سمجھ میں قطعی نہیں آ رہیں-" اس نے سادگی سے اعتراف کیا-

"اوہ! ہاں کرکٹ اور سارا! دو بالکل مختلف باتیں ہیں-" جاوید بھائی ہنسے-

"ان سے گفتگو کرنے کے لیے ذہن پر بھاری پتھر رکھ کر وزن دار موضوعات چننے پڑتے ہوں گے- فزکس اور میٹا فزکس' مسٹی سزم' تھیسس اور اینٹی تھیسس' نطشے اور ہیگل' ڈیکارٹ اور سارتر' پوئیٹیکل فلاس اور اس کے مختلف نظریات' ڈائیلکٹکس- اور مارکسزم وغیرہ وغیرہ- یقین کرو جاوید! ایسے موضوعات سے مجھے خوف آتا ہے- لڑکیوں کو کم سے کم ایسے بھاری بھرکم مضمون نہیں پڑھنے چاہئیں-"

وہ ہاٹ اینڈ سار سوپ سے انصاف کرتا ہوا بولا- جواب میں جاوید بھائی قہقہہ لگا کر ہنس دیے-

"نہیں' کچھ ایسی بھی ضرورت نہیں وزن دار موضوعات چننے کی- جو کام انسان کے بس کا نہ ہو' اس کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے-"

اس نے نیپکن ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا-

"آپ لائٹ موضوعات پر بھی بات کر سکتے ہیں' خاموش رہنا میری عادت تو ہو سکتی ہے مجبوری نہیں-"

وہ ایک لمحے کو اسے دیکھتا رہ گیا-

"اچھا پھر آیئے' اس ڈکشن آف دم مست قلندر پر گفتگو کریں یا پھر عدنان سمیع خان کے راگ ٹائم پر بات کرتے ہیں یا پھر پاکستانی ڈرامے پر ثقافت کی یلغار یا فلم انڈسٹری کا روز افزوں زوال' یہ نہ سہی یہ ہی کہ سیاچن گلیشئر پر کون نقصان اٹھا رہا ہے' کون فائدے میں ہے اور یہ کہ جو روس پر زوال..... آ رہا ہے' اس کا سبب یا اسباب کیا ہیں' کوئی لائٹ موضوع چنیے' کہیں تو کوئی بات کیجیے-"

وہ جیسے کسی بات کے ستائے ہوئے کی طرح پھٹا تھا- جاوید بھائی مسلسل مسکرا رہے تھے-

"یہ تو بہت عام موضوعات ہیں عام آدمی کی پہنچ کے اندر اندر آتے ہیں- کوئی اور بات بھی کی جا سکتی ہے-" اس نے جان بوجھ کر اسے مزید زچ کرنا چاہا-

"جی نہیں' میرے خیال سے آپ کو پکڑنا مشکل ہے' آپ کی موجودگی میں خاموش رہنا ایک بہتر عمل ہوگا-" وہ بگڑ کر بولا-

"اصل میں تم سارا کو نہیں جانتے-" پھر جاوید بھائی درمیان میں کود دے- "بچپن سے ہی یہ ہم سب کزنز سے مختلف ہے- اس کی پسند ناپسند' اس کی گفتگو' اس کا وے آف لائف ہی مختلف ہے-"

بظاہر بے حد خاموش مگر جب بولنے پر آئے تو.... خیر یار، اس کا کیا ذکر، دی اونلی تھنگ از دیٹ سارا! از ٹوٹلی ڈفرنٹ۔" (دراصل سارا بہت مختلف ہے)

جاوید بھائی نے اپنا نظریہ پیش کیا۔

"یہ بھی کسی کی خام خیالی ہی ہوگی کہ میں ان کو نہیں جانتا۔" وہ آہستہ آواز میں بڑبڑایا اور چائینز منچورین پر جھک گیا۔

اس روز وہ پہلی مرتبہ اتنی دیر سے ہوسٹل واپس لوٹی تھی اور اس کے خیال میں یہ بھی اس کے اصول کے خلاف تھا۔ بغیر وجہ کے اسے گیٹ کیپر سے جھجک محسوس ہوئی۔ اتنے عرصے میں ایک بار بھی اتنی لیٹ اسے سارا رحمٰن کے لیے گیٹ نہیں کھولنا پڑا تھا۔ مگر کمرے میں آکر سونے کے لیے لیٹتے ہوئے اس نے دن بھر میں وارد ہونے والی مختلف کیفیات پر غور کیا۔

صبح پرسکون اور باقی کا دن فرسٹریشن کا شکار اور اب شام میں ایک نئی کیفیت۔ دفعتاً اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک بیکراں سناٹے اور ناقابل عبور خلا میں ٹکراتی پھر رہی ہو۔ خود کو دھوکا دیتے ہوئے، اپنے خیالات اور محسوسات سے فرار حاصل کرتے ہوئے سچ کا سامنا کرنے سے بچتے ہوئے اور وہ شخص بھی عجیب تھا جب وہ اس سے چڑ کر اپنے خیالات بدلنے کی کوشش کرتی، ایک نئے رنگ کے ساتھ اس کے سامنے آجاتا۔

آخر وہ فلزا کی عدم موجودگی میں ہی ادھر آنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ کیا وہ بیک وقت ہم دونوں کو بے وقوف سمجھتا ہے، مگر ایک بات یہ بھی ہے کہ کیوں صرف وہ ہی کیوں میرے ذہن سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔ دنیا میں اور بھی تو بہت سے لوگ ہیں۔

"اصل میں بات یہ ہے سارا بی بی! کہ کچھ لمحے ہوتے ہی بڑے جاندار ہیں، ان کا اثر عمر بھر رہتا ہے اور اس اثر سے کوئی نکلنے کی خواہش کرے بھی تو نکل نہیں پاتا۔ بہت ممکن ہے بلکہ یقیناً اگر وہ اس روز اس مخصوص صبح تایا جان کے ہاں تم سے نہ آٹکراتا اور کسی اور وقت میں ملتا تو تم اس کے متعلق کبھی بھول کر بھی دوبارہ نہیں سوچتیں۔ بس لمحے اپنی پوری ٹیسنگ اور پلان کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ اتفاقات بھی وقت کے انوکھے کھیل ہوا کرتے ہیں اور اپنی جگہ بہت بڑی حقیقت ہوا کرتے ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ ان حقیقتوں سے جان کس طرح چھڑائی جائے۔"

یہ باتیں سوچتے سوچتے اس کو نیند آ گئی۔

اور آنے والے دنوں میں اس نے اپنی پڑھائی میں بری طرح مشغول ہو کر ان حقیقتوں سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

فلزا کی باتوں، سعد کی ہاسٹل میں آمد کو نظر انداز کر کے بارہا جو اس نے ان دونوں کو کئی جگہوں پر اکٹھے دیکھا، دس نمبر کے پل پر بس کا انتظار کرتے ہوئے نہر کی پل پر بیٹھے ڈیپارٹمنٹس کے پارکنگ لاٹ سے گرے سوزوکی نکلتے دیکھ کر مین برج پر دہی بھلے کھاتے ہوئے، اپنے کرچی کرچی دل کو

اس نے ان سب کے روٹین ہونے کا یقین دلا کر سمجھا دیا۔ اور پھر خدا خدا کر کے دسمبر کی چھٹیاں آ گئیں۔ اتنے عرصے میں اس نے بے چینی سے ان کا انتظار کیا تھا۔

"گھر اور گھر والوں کے ہونے کا احساس بھی کتنا جاندار ہوتا ہے۔" اس بار اسے لگتا تھا وہ سالہا سال کے بعد گھر واپس آئی تھی۔ سارا سارا دن وہ امی، بھابی ثناء اور یاسر سے محو گفتگو رہتی، منصور بھائی کے نومی اور چھوٹی سی گڑیا کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اکیلے رہنا گویا اس کو مصیبت لگتا تھا۔

"اس بار کوئی کتاب وغیرہ تو لائیں نہیں سارا؟"

بابا جان بار بار اسے یاد دلاتے۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتی رہی۔ کتابوں سے اسے ہاسٹل اور ہاسٹل سے اور بہت کچھ یاد آ جاتا تھا۔ فی الوقت وہ گھر اور صرف گھر کو ذہن میں رکھنا چاہتی تھی۔

وہ دسمبر کے اواخر کا ایک سرد ترین دن تھا۔ تمام دن باہر بارش ہوتی رہی تھی اور وہ ہیٹر کے پاس دبکی ڈینئل سیٹل کا نیا ہاتھ آیا ناول پڑھتی رہی تھی۔ پھر اسے بھابی نے اٹھایا۔

"نومی نے اپنے کپڑوں پر چاکلیٹ گرالی ہے۔ ذرا اسے نہلا کر کپڑے بدلوا دو۔"

وہ با دل نخواستہ اٹھی اور نومی کو لے کر بھابی کے باتھ روم میں گھس گئی۔

ثناء نے بیڈروم کا ٹی وی آن کر رکھا تھا اور ادھ کھلے دروازے سے بونینزا سوئٹرز اور کارڈیگنز سپریم دنیا کی بہترین چائے، سب سے اچھی ہے، لپٹن یلو لیبل اور فرام دی ہاؤس آف لارنس پور کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔" پھر ایک مدھم مگر جاندار آواز آئی۔ اور اس کا ہاتھ غلط پڑ گیا۔

نومی کی آنکھوں میں صابن پڑ گیا تھا اور اس نے چلانا شروع کر دیا تھا۔ بمشکل اس کی آنکھیں دھلوا کر اس کو کپڑے پہنائے اور جب وہ دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ نومی کو لیے باہر نکلی تو کچھ دیر پہلے تک وہ جسے اپنا واہمہ اور خیال ثابت کرتی رہی تھی۔ حقیقت بن کر سامنے موجود تھی۔

اس نے ایک نظر اپنی قمیص کے گیلے دامن پر ڈالی اور کالی شال کا بھیگا ہوا کونا انگلیوں سے نچوڑا۔

"کیا کیا سارا! تم سے تو ذرا سا بچہ بھی ڈھنگ سے نہیں نہلایا گیا۔"

بھابی نے نومی کی شکایت پر اسے چھیڑا۔ اس نے قمیص کا دامن جھٹکے سے جھاڑا اور ہیٹر کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ ذرا سا بچہ ہے کہ آفت کا پرکالا۔" وہ الٹا ناراض ہوئی۔

"اب اس کو کیا کہا جائے؟" دروازے میں کھڑے ابھی ابھی آئے جاوید بھائی نے کہا۔

"اے بیڈ ورک مین کورلز ود۔" سامنے کی کرسی پر بیٹھے سعد عالم نے کہتے کہتے اپنی زبان کنٹرول کی۔

"کیا حال ہیں آپ کے؟"

اس کو یہاں دیکھ کر وہ ششدر تھی، مگر ششدر نظر آنا نہیں چاہتی تھی۔

"یہ سعد ہے سارا! سلمیٰ پھپھو کا دیور۔" نومی کے بالوں میں برش پھیرتی بھابی نے اسے اطلاع فراہم کی۔

''ارے ہاں، تم تو جانتی ہوگی۔ تم نے بتایا تھا، تم رابعہ آپا کی طرف بھی گئی تھیں۔ یہ سعد آج کل آیا ہوا ہے جاوید کی طرف، اس کی یہ اچانک آمد بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔''

اسے خبر ہی نہیں ہوئی کب وہ اس کے گھر آ کر گھر والوں سے بے تکلف بھی ہو چکا تھا اور وہ چھٹیوں میں گھر اس کے سائے سے بھی پیچھا چھڑانے کے خیال سے آئی تھی۔

اس روز وہ رات دیر تک بیٹھا رہا۔ امی اور بابا جان اس کی تعریفوں میں رطب اللسان تھے۔

''دو تین مرتبہ ہی آیا ہے مگر لوگوں کا دل جیتنا خوب جانتا ہے۔'' امی نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''جی ہاں خوب جانتا ہے۔'' وہ قدرت کی اس نئی ستم ظریفی پر حیران تھی۔ اسی پر اس نے کڑھ کر سوچا۔

''کیا کیا جائے۔'' اس دن کے بعد وہ اپنی چھٹیوں میں عود کر آئی چوکڑی بھول گئی۔ اور پھر سے وہی خاموش سارا اور بے دل سارا بن گئی۔

یکم جنوری کو جاوید بھائی ٹیکسلا جانے کا پروگرام بنا کر آئے تھے اور ٹیکسلا جانے کو وہ ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ مگر اس بار باہر کھڑی گرے سوزوکی اس کو بد دل کر رہی تھی۔

''اللہ سارا تم! اور ٹیکسلا نہ چلو، یہ کیسے ممکن ہے۔'' بھابی نے حیرت سے دریافت کیا۔

''آؤ بھئی سارا! آج تو میں بھی چلوں گا۔ تم سے ٹیکسلا کی ہسٹری سننے میں مزا آئے گا۔'' بابا جان نے آ کر اسے اٹھا دیا۔

اور ٹیکسلا پہنچ کر وہ حتی المقدر کوشش کے ساتھ صرف بابا جان کو ہسٹری سنانے میں مشغول رہی۔

''یہ بدھسٹ یونیورسٹی کے مانومنٹس ہیں آپ کو یاد ہوگا، یہاں بدھ بھکشو پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اشوک دی گریٹ کے زمانے میں، بابا جان وہ بھی کیا دن ہوں گے جب ان خنک، نیم تاریک کچی دیواروں کے سائے میں بیٹھ کر وہ صرف ونحو کے علوم سیکھتے ہوں گے۔ جیومٹری، ریاضی، طبیعات مابعد الطبیعات، سیاست اور دنیا کے ڈھیروں علم اور جب شام میں وہ گھر گھر کھانا مانگنے جایا کرتے تھے تو لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہلے ان کے لیے کھانا نکالتے تھے اور ان کو عظیم انسان خیال کرتے تھے۔ تعلیم تو اصل میں وہ تھی یونیورسٹی بھی یہ ہی تھی، اب وہ بات کہاں۔'' وہ اپنے ذہن کی ساری الجھنیں بھلا کر اس دل پسند موضوع میں ایک خوبصورت دنیا میں کھو گئی۔

''قدیم دنیا کیا اتنی ہی پسند ہے آپ کو؟''

پھر اسے قریب سے آواز آئی۔ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا اور اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ کب بابا جان اس کے قریب سے اٹھ کر جاوید بھائی کے پاس کھڑے اس آرکیٹیکچر پر لیکچر لے رہے تھے۔

''جی ہاں!'' اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ ''قدیم دنیا منافقت ریا اور دھوکے سے پاک تھی اس لیے۔''

''خاصی تصوراتی سوچ ہے..... خیر اس میں آپ کا بھی کچھ اتنا قصور نہیں کچھ لوگ بہت سی باتیں

فرض کر لینے کی عادت فطری طور پر رکھتے ہیں۔ بہر حال میں خوش ہوں، اتنے کہر آلود موسم میں باہر نکلنا کوئی خاص عقلمندی تو نہیں مگر جاوید نے مجھے بتایا کہ آپ کو قدیم تاریخ اور جگہوں میں بے حد دلچسپی ہے تو میں نے سوچا کہ سال کا پہلا دن ایسی پسندیدہ جگہ پر گزارنا آپ کے لیے خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔'' اس نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

''میری خوشی کا باعث، مگر میری خوشی سے آپ کو کیا دلچسپی؟'' اس نے غیر ارادی طور پر اچانک کہا۔

''دلچسپی ہے یا نہیں، یہ ایک علیحدہ بات ہے، میں بس آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی یہ ڈری ڈری اور الجھی ہوئی شخصیت سے بعض اوقات مجھے وحشت ہونے لگتی ہے اور اس کی میں توجیہہ پیش نہیں کر سکتا کہ کیوں ہوتی ہے۔ دل سے بتائیے گا کیا آپ یہاں آ کر خوش ہوئیں؟''

اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر امید تھی۔

''مگر فلزا کو شاید یہ بات اچھی نہ لگے۔'' اس نے جواب میں ایک بے تکی سی بات کی۔

''فلزا!'' اس نے پٹخنے کے سے انداز میں زمین پر پاؤں مارا۔ ''فلزا کا ذکر درمیان میں کہاں سے آ گیا؟ میں آپ کی بات کر رہا ہوں۔''

''فلزا ہی کا ذکر تو آنا چاہیے۔ میری بات چھوڑیں۔'' اس نے اٹھ کر کچی چھت کے سائے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ اور باہر آ کر وہ دیر تک کھنڈر بنے کچے شہر کے آثارات کو گھورتی رہی۔

کبھی یہ کس قدر پرشکوہ اور رستا بستا شہر ہوگا۔ زندگی کے آثار مفقود ہو جائیں تو شہر بھی مردہ ہو جاتے ہیں اور دل بھی۔

ستوپہ کلاں کے پاس کھڑے کھڑے اس نے سوچا اور بابا جان کے پاس چلی آئی جو اس شہر کے بنانے والوں کی عقل پہ اش اش کر رہے تھے۔

''کیا سیوریج سسٹم ہے؟'' انہوں نے پتلی پتلی نالیوں کے آثار کی طرف اشارا کرتے ہوئے اس سے کہا۔ مگر جواب میں وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔ اب اس کا دل کسی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔

اسی شام وہ واپس چلا گیا تھا۔

☆☆

چھٹیوں کے فوراً بعد حسب معمول بابا جان نے اسے واپس جانے کی تلقین کی۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بابا جان کا حکم، حکم آخر تھا۔ اس بار اسے اتفاقاً پنڈی کی ایک لڑکی کا ساتھ مل گیا تھا۔ اس کا سفر اچھا گزر گیا۔ مگر ہاسٹل پر وہی چھٹیوں کے بعد والی اداسی کی کیفیت طاری تھی۔ کمزور اور ٹھنڈا سورج غروب ہو رہا تھا۔ لان میں زرد پتوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور ہاسٹل میں حیرت انگیز طور پر۔ لڑکیاں کم تھیں۔

اس کی ہمسفر پہلے ہاسٹل میں گھس گئی تھی۔ اور وہ حسب معمول دیر تک دروازے کے قریب کھڑی آنکھوں میں آئے آنسو روکتی رہی تھی۔ کمرے کی صفائی کے بعد باہر نکلنے پر کوریڈور سے گزرتی ایک

لڑکی نے اسے ایک اور مژدہ سنایا کہ میس بند ہے اگر وہ رات کا کھانا گول کرنے کا ارادہ کر بھی لیتی تو صبح کا ناشتا لینے کے لیے اسے کہیں جانا ہی پڑتا اور مشکل یہ تھی کہ ہاسٹل میں جتنے چہرے موجود تھے سب ہی سے وہ ناواقف..... تھی۔ بہت دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اٹھی اور کمرے کا لاک لگا کر نیچے آئی۔

''اسنیک بار بہتر ہے۔ کیفے بالکل بکواس رہے گا۔'' پیچھے کوئی کسی کو بتا رہا تھا۔ ہاسٹل کا عقبی گیٹ کھلا تھا۔ وہ درمیانی راستہ عبور کر کے مین روڈ پر آ گئی۔ یہاں چہل پہل تھی۔ بوائز ہاسٹلز کے مکین بھی دھڑ ادھڑ کیفے اور اسنیک بار کا رخ کر رہے تھے۔

''اکیلے کہیں جانا تو ایک دم مصیبت ہے۔''

اپنے خیال میں غلطاں وہ تیزی سے سڑک عبور کرنے ہی لگی تھی جب گاڑی کے ٹائر اس کے قریب چرچرائے اور ہیڈ لائٹس نے اسے روشنی میں نہلا دیا۔

''میں آپ کی طرف ہی جا رہا تھا۔'' گاڑی سے اتر کر قریب ہوتے سائے نے آ کر اس سے کہا۔

''فلزا ابھی واپس نہیں آئی۔'' اس نے بغیر اپنا ردعمل ظاہر کیے سکون سے کہا۔

''آج بھی میں فلزا کی نہیں' آپ کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ سختی سے بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ کا میس بند ہے۔ آپ آیئے میرے ساتھ۔''

''جی نہیں' میں اسنیک بار کی طرف جا رہی ہوں۔'' اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ اسنیک بار کی طرف نہیں' میرے ساتھ جا رہی ہیں۔ سارا آ جایئے۔ میں ہر بار کی طرح آپ کے سخت لہجے سے مرعوب ہونے والا نہیں اور اس وقت تک کھڑا رہوں گا جب تک آپ آ نہیں جائیں گی۔'' اس کا لہجہ بدستور سخت تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لڑکوں کا ایک گروپ سامنے سے آ رہا تھا اور ان میں سے دو اس کے کلاس فیلو تھے۔ وہ سارا رحمٰن تھی جس کی سب دل سے عزت کرتے تھے اور اس وقت اگر کوئی یوں اسے ساڑھے چھ فٹ کے وجود کے ساتھ عین سڑک کے درمیان کھڑا دیکھ لیتا تو عزت و احترام کا گراف آدھا بھی نہیں رہ جاتا۔ اس نے دانت پیسے اور تیزی سے چلتی گاڑی کی سمت آئی۔

''دروازہ کھلا ہے' کھولیے اور بیٹھ جایئے۔'' پیچھے سے آواز آئی۔

''پھپھو کا کہنا ہے کہ آپ ایک شریف انسان ہیں مگر معاف کیجیے گا آپ ہرگز نہیں ہیں۔'' اس کے اندر بیٹھنے پر اس نے غصے سے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔

''یہ ان کا کہنا ہے۔ میرا دعویٰ ہرگز نہیں۔'' وہ آہستگی سے مسکرایا اور گاڑی ریورس کر کے موڑنے میں مصروف ہو گیا۔ سارے راستے وہ خاموش رہا۔ اور خود بھی اس نے مارے غصے کے باہر نہیں دیکھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔

''آیئے۔'' گاڑی روک کر' باہر نکلتے ہوئے اس نے کہا۔ اس نے باہر دیکھا۔ وہ پُرشور جگہ تھی۔ روشنیوں سے بھرپور اور گاڑی ''ہانگ کانگ'' کے سامنے کھڑی تھی۔

''آ جایئے سارا' میں ابھی آپ کو Explain (وضاحت) کرتا ہوں۔'' اس نے دوبارہ کہا۔ وہ نیچے اتر آئی۔

''بات صرف اتنی سی ہے کہ مجھے آپ کے اصولوں میں دراڑیں ڈالنے کا کوئی شوق نہیں۔'' اپنے لیے کارنر کی ٹیبل منتخب کر کے بیٹھنے اور آرڈر دینے کے بعد اس نے کہا۔

''یہ آپ کی امی کی ہدایت تھی کہ آپ چونکہ اکیلی ہیں اور معاف کیجیے گا بقول ان کے کم عقل ہیں لہٰذا میں آپ کا خیال رکھوں۔ یہ ان کا اعتماد ہے ورنہ میں کیا چیز ہوں۔'' وہ عاجزی سے بولا۔

''اتفاق سے مجھے معلوم تھا کہ آج آپ واپس آ رہی ہیں اور یہ بھی کہ میس بند ہو گا۔ لہٰذا آپ کی امی کے کہنے کے مطابق ان سے کیا اپنا وعدہ نبھانے چلا آیا ورنہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔''

اس کا سر جھک گیا۔ ''امی کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا' اب اتنا عرصہ یہاں اکیلے گزارنے کے بعد بھی میں کم عقل ہوں۔'' اس نے شرمندگی سے سوچا۔

''مانا..... آپ کی نظروں میں' میں شریف آدمی نہیں ہوں مگر کچھ لوگوں کی نظر میں تو ہوں جبکہ آپ یوں بیٹھی ہیں جیسے آپ کو بھگا کر لایا ہوں۔''

پھر اس نے اس کو اس قدر تناؤ میں دیکھ کر کہا۔ اس نے خود کو ذرا سا پرسکون کرنے کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے آپ سے بدتمیزی کی۔ دراصل میں یوں راستہ روکے جانے اور اس طرح کے اصرار کی عادی نہیں ہوں' نہ ہی یہ مجھے کچھ اتنا پسند ہے۔ پھر بھی شاید مجھے اتنا غصے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''ارے چھوڑیے۔ آپ صاحب اختیار ہیں جو دل چاہے کہہ ڈالیے۔ یہ معذرت خواہانہ الفاظ آپ کے منہ پر جچتے نہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اچھا ایک بات بتایئے۔'' کھانے کے دوران طویل خاموشی کے بعد وہ بولا۔

''میں جب بھی آپ سے کوئی بات کرتا ہوں' آپ فلزا کو درمیان میں کیوں لے آتی ہیں۔ جب کہ میں آپ سے مخاطب ہوتا ہوں۔ صرف آپ سے مخاطب ہوتا ہوں۔ دوسرے کسی شخص کا ذکر ضروری نہیں سمجھتا۔ دیکھیے فلزا کو میری ہر بات کے ساتھ یوں منسلک نہ کیجیے' مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''آپ کیا مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔'' اس نے جواب میں اچانک سوال داغا۔

''ایک جانی بوجھی' سوچی سمجھی بات کو مزید کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔'' وہ سکون سے بولا۔

''مگر مزید کچھ سمجھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ اور وہ مزید یہ ہے کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میری آنکھیں اور ذہن بہت زیادہ کھلے ہیں اور۔''

''ہاں اتنے زیادہ کہ ان میں غیر ضروری چیزیں بھی سما جاتی ہیں' سارا' وہ باتیں دیکھا اور سمجھا کیجیے جو نظر آ رہی ہوں۔ گہرائی میں اترنے کی کوشش کریں گی تو یوں ہی جھنجلا جائیں گی۔'' وہ اس کی

بات کاٹتا ہوا بولا-

''اب میں واپس چلوں گی- بہت دیر ہوگئی-'' جواب میں اس نے کانٹا پلیٹ میں رکھا اور نیپکن سے ہاتھ پونچھے-

''شیور!'' اس نے بل منگوا کر پے کیا اور اس کے آگے چلتا باہر نکل آیا-

راستے میں شیزان کے قریب گاڑی کھڑی کر کے وہ اندر آ گیا- اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بڑا پیکٹ تھا-

''آپ انکار نہیں کیجیے گا کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ کو ناشتے کی دقت ہوگی-'' اس نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا-

''میں کل پھر آؤں گا-'' ہاسٹل کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس نے کہا-

''نہیں پلیز- یہ ہی بہت کافی ہے- کل آئیں گے تو مجبوراً مجھے سخت انکار کرنا پڑے گا- ویسے بھی کل میری فرینڈز آ جائیں گی- مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی-'' اس نے نرم لہجے میں اسے منع کرتے ہوئے کہا-

''رابعہ آپا کی طرف چلی چلیے گا-'' اس نے پھر کوشش کی-

''نہیں پلیز- شکریہ-'' وہ پست آواز میں بولی- اور ہینڈل دبا کر باہر نکلی-

''خدا حافظ-'' اس نے بلند آواز میں کہا اور اسے گیٹ پر دستک دے کر اندر جاتے ہوئے دیکھنے کے بعد گاڑی ریورس کر کے نکل گیا-

''کیا سمجھوں خدایا! میں کیا سمجھوں-''

اس نے کمرے میں آ کر ہاتھ میں پکڑے شاپر کو کھولتے ہوئے سوچا- شاپر میں ایک بڑی ڈبل روٹی، جام کی شیشی، مکھن، مارجرین دودھ کے پیکٹ، خشک دودھ کا ڈبا، پتی کا ڈبا اور بیکری کا کچھ سامان تھا-

''وہ کیا ہے، جو نظر آتا ہے وہ- یا پھر وہ جو جتانے کی کوشش کرتا ہے- میں تو پہلے ہی سخت مشکل میں ہوں- یہ ان چاہا عذاب اور آن پڑا-''

وہ سب چیزیں سنبھال کر بستر پر لیٹتی ہوئے سوچتی رہی-

اگلے ہی روز اس کی توقع کے برعکس فروا آ گئی- اور اسی شام فلزا بھی آ گئی-

''ایبٹ آباد میں تو طوفانی ٹھنڈ تھی- میں اسی لیے لیٹ ہوگئی-'' وہ بتا رہی تھی-

''اس کے علاوہ آنٹی شاہدہ بھی گئی ہوئی تھیں، ادھر پھپھو کے ساتھ فیصل آباد سے، ان کے وہاں ہونے کی وجہ سے دل ہی نہیں چاہ رہا تھا- اچھا اب میں ذرا چلوں گی سعد کو فون پر بتاؤں کہ آ گئی ہوں-'' وہ اس کے قریب سے اٹھ کر چلی گئی-

''شکر ہے- میں آئی تو میس کھل گیا-'' دوسری طرف فروا اپنی کہانی کہہ رہی تھی-

''ویسے تمہارے پاس اتنا سامان خوراک کہاں سے آیا تم سے تو اتنی دور اندیشی کی توقع نہیں کی جا سکتی-'' اس نے اس کی ٹیبل کے شیلف میں سر گھسا کر کہا-

''بس آ ہی گیا-'' وہ فلزا کی باتوں پر اداس سی ہوگئی تھی- اسی لیے آہستگی سے بولی-

ان دنوں وہ یقین اور بے یقینی کے دوراہے پر کھڑی تھی- جب فیصل آباد سے غیر متوقع طور پر پھپھو کا خط ملا-

''میں پنڈی جانا چاہتی تھی مگر موقع نہیں ملا-'' انہوں نے لکھا تھا- ''امی جان (میری ساس) بصد اصرار مجھے ایبٹ آباد لے گئیں- وہ سعد کے لیے فلزا کا رشتہ مانگنا چاہتی ہیں- بھابھی کا عندیہ لینے گئی تھیں- سچ پوچھو تو مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں- فلزا کے مزاج کو تم اچھی طرح جانتی ہو اور جب کہ مجھے معلوم ہے کہ سعد ایسا نہیں چاہتا- مجھے یہ بھی علم ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہے- مہینوں پہلے جب میں لاہور گئی تھی تو اس نے کچھ ایسی ہی بات کی تھی مجھ سے' مگر امی جان کا اصرار فلزا کے لیے ہے کیونکہ وہ ان کی قریبی دوست کی بیٹی بھی ہے- سعد ایک سعادت مند بیٹا ہے- بہت ممکن ہے کہ ان کی بات مان بھی لے- مگر تم اس کی طرف سے دل برا مت کرنا سارا- وہ اپنے الفاظ میں ہمیشہ سے سچا ہے-''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پھپھو نے اسے یہ خط کیوں لکھا تھا' مگر اتنا وہ جانتی تھی کہ اس کے بہت سے خود ساختہ تصورات اور مفروضے اس خط نے ضرور تباہ کر دیے تھے- اسے اپنے اردگرد ہر شے سے چڑ محسوس ہونے لگی-

''الفاظ کا سچا' اونہہ! الفاظ کا سچا-'' اس روز ڈاکٹر شہریار کے ''خواتین و حضرات مذہب کی فلاسفی دو طرح کی ہوتی ہے-'' کے دوران وہ غصے سے کھولتے ذہن کے ساتھ سوچتی رہی-

''دوغلا اور لفظ تراشی کا ماہر- وہ کیوں نہ چاہتا ہوگا فلزا کا ساتھ' اب کون سا اس کے بغیر زندگی گزار رہا ہے ہر وقت کا تو ساتھ ہے اور میرا نام بے وجہ پھپھو کے سامنے بدنام کیے رہا-''

اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس شخص سے نفرت محسوس ہوئی-

''ڈاکٹر شہریار کی کلاس میں اتنی بار ٹائم دیکھتی ہوں کہ میری نظریں اور کلائی دکھنے لگتی ہے-'' کلاس کے بعد کینٹین میں بیٹھے ہوئے فروا نے کہا-

''پھر خود کو تسلی دیتی ہوں کہ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی اور کلاس کے بعد وقت کا گزر جانا بڑی نعمت لگتا ہے-''

''نعمت یا لعنت؟'' اپنے خیالات کے زیر اثر اس نے غصے سے کہا- ''وقت ہی ساری مصیبتیں اور آفتیں ساتھ لاتا ہے-''

''لیکن وقت بالآخر گزر جاتا ہے- کبھی تم نے غور کیا کہ ان کٹھن لمحوں میں جب ڈاکٹر شہریار کی کلاس جاری ہوتی ہے' وقت ٹھہر جائے تو ہمارا کیا حال ہو-''

فروا اس کی کیفیت سمجھے بغیر اپنی بات پر مصر رہی-

''وقت کے گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا- جو مصیبت زندگی کے ساتھ ساتھ رہنی ہوتی ہے وقت گزر جانے سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا- ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب کا ذکر آئے تو نہ عذاب کی

سوچ آتی ہے نہ دکھ کی بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کا لفظ ذہن میں رہ جاتا ہے۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

''خدانخواستہ تمہیں کون سا دکھ لگ گیا ہے؟'' فروا ہنس کر بولی۔ ''آج شہباز اپنے نقطے اٹھاتا رہا اور تمہارا ذہن شاید حاضر نہیں تھا۔ اپنی خاموشی کو ناکامی سمجھ رہی ہو۔ کیا اس کا دکھ ہے۔''

''کسی بھی بات کا دکھ ہو' دکھ ہوتا ہے۔ خواہ ناکامی کا ہو یا خود آگاہی کا۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ اس نے سر جھکا کر فائل پر آڑی ترچھی لائنیں کھینچنا شروع کیں۔

اس روز اس کے دروازے پر پڑنے والی دستک کچھ غیر مانوس تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے رابعہ آپا کھڑی تھیں اور ان کے پیچھے فلزا تھی۔

''کیا حال ہے تمہارا؟ ایک بار کے بعد دوبارہ شکل نہیں دکھائی ایک وہ ہمارے میاں ہیں بار بار تمہارا پوچھتے ہیں۔''

وہ اس سے بے حد پیار سے ملنے کے بعد بولیں۔ اس نے انہیں بٹھایا اور فلزا کو دیکھا جس کا چہرا کوئی تاثر دیتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''بڑا اچھا صاف ستھرا کمرا ہے۔'' پھر انہوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

''بڑی خوش ذوق ہو۔ پھر سامنے کی دیوار پر لگی مشہور و معروف پینٹنگز کے امیجز پر ان کی نظر پڑی۔

''آپ بتائیں کیا پئیں گی چائے یا ٹھنڈا؟'' اس نے دروازہ کھول کر فروا کو آواز دینے سے پہلے کہا۔

''کچھ نہیں۔ آج تو میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ میرے گھر پر میلاد ہے اور میرا ہاتھ بٹانے والے بہت کم۔ چل رہی ہو نا۔''

وہ یقین سے بولیں۔ وہ ہرگز جانا نہیں چاہتی تھی۔ اب جب کہ اس کے بہت سے مفروضے بالکل بکھر چکے تھے اس ماحول کا تصور ہی باعث پریشانی تھا۔ مگر وہ جس خلوص کے ساتھ آئی تھیں اور اصرار کر رہی تھیں ان کے سامنے انکار بھی برا لگ رہا تھا۔ وہ بادل ناخواستہ تیار ہوئی نیچے آ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو یکسر نظر انداز کر کے رابعہ آپا سے ہی مخاطب رہی۔

ان کے گھر میں بھائی میاں تھے جنہوں نے بجائے اسے کام میں مصروف ہونے کا موقع دینے کے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔

''بڑے عرصے بعد ایک نادر شخصیت ہاتھ آئی ہے۔ یہ موقع کیسے ضائع کروں۔''

وہ کہہ رہے تھے۔ فلزا گھر میں بے حد مالکانہ انداز میں پھر رہی تھی۔ بھائی میاں اپنے کسی ملاقاتی سے ملنے باہر گئے تو وہ عرفی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ اس بھالو سے اب بھی کھیلتے ہیں۔'' اس نے اس کے اسٹفڈ (Stuffed) کھلونے کی طرف اشارہ کیا۔

''جی یہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ میں نے اسے بڑا ضد کر کے خریدا تھا ایک بڑی سی دکان سے۔'' وہ بتا رہا تھا۔

''اچھا کون سی دکان تھی وہ؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''آپ کو نہیں معلوم' آپ نے بھی تو کبھی خریداری کی تھی وہاں سے دماغ کی۔''

عرفی کے بجائے قریب سے گزرتے اس کے ماموں نے جواب دیا۔ وہ بھنا کر رہ گئی۔ وہ کمرے سے نکل چکا تھا ورنہ اب کے وہ جواب دینے ہی والی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر رابعہ آپا کا کچن میں ہاتھ بٹانے آ گئی۔ تقریب کے فوراً بعد اس نے واپسی کا شور مچا دیا۔

''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو' کاش تمہیں یہاں آنا جانا اچھا لگتا ہوتا۔'' رابعہ نے اس سے کہا۔

''مجھے اچھا لگتا ہے۔'' وہ شرمندہ ہو گئی۔ ''مگر مجھے باہر نکلنے کی کچھ اتنی عادت نہیں۔''

''تم اپنی کوئی خامی چھپا ہی نہیں سکتیں۔'' فلزا نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''نہیں' میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔'' وہ سختی سے بولی۔

''میں تمہیں خود چھوڑنے بھی جاؤں گی۔'' رابعہ آپا کہہ رہی تھیں چلنے سے پہلے بھائی میاں نے اسے گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کا تازہ ایڈیشن دیا۔

''مجھے معلوم ہے غلط ہاتھوں میں نہیں دے رہا۔''

وہ کہہ رہے تھے۔ وہ لوگ اتنے اچھے اور مخلص تھے مگر ایک اس اولین احساس نے اسے کیسی کیسی خوشی سے محروم کر رکھا تھا۔

اس سے اگلے ہی روز جب وہ فروا کے ساتھ بیٹھی اخبار جہاں کے تازہ شمارے میں نئی شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ بغیر دستک دیے دروازہ کھول کر فلزا اندر داخل ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' وہ میز کے ساتھ ٹک کر بولی۔ اور پھر جواب سنے بغیر رخ موڑ کر اس کا ہیئر برش بالوں میں چلانے لگی۔

''نیا رسالہ ہے۔'' میز پر رکھے بسکٹ کے ڈبے میں سے دو بسکٹ نکالتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''ہاں!'' فروا نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ بالوں میں دوبارہ برش پھیرتے ہوئے اس نے سامنے کے دروازے سے باہر دیکھا اور پھر اس کی طرف مڑی۔

''سارا۔ تم جانتی ہو کہ انسان اگر کھٹے انگوروں کے لیے دیر تک اچھلتا رہے' بالفرض اسے مل بھی جائیں تو وہ کبھی میٹھے نہیں ہو پاتے۔''

''ہاں۔ مگر میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ ویسے بھی مجھے انگوروں میں کوئی دلچسپی نہیں' کھٹے ہوں خواہ میٹھے۔''

وہ سمجھ کر بھی انجان بنتے ہوئے تحمل سے بولی۔ جواب میں وہ کچھ دیر سامنے لگے پوسٹر کو گھورتی رہی اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہے تو یہ کمینی سی بات' مگر نجانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ کاش پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں تم ہمارے ہاں نہ آئی ہوتیں۔''

''ہاں!''......اس نے سیدھے ہو کر تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے مزید سکون سے کہا۔

''میرا دل بھی یہ ہی کہتا ہے' مگر قسمت۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے' مجھے بھی انہی دنوں وہاں جانا تھا۔ یقین کرو' نجانے کیوں مجھے بھی اس بات کا دکھ ہے۔''

وہ اس کے سامنے بازو باندھے کھڑی کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر جس تیزی سے آئی تھی' اسی تیزی سے باہر نکل گئی۔

''خدا گواہ ہے' میں تم دونوں کی گفتگو کا ایک بھی لفظ سمجھ نہیں پائی۔'' فروا نے اس کے جاتے ہی اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ''انگور کھٹے' بیٹھے بٹھائے بھئی کون یہاں لومڑ ہے۔''

''اس کا فیصلہ شاید فلزا نہیں کر سکی۔'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد مسکرا کر کہا۔ اور جامِ جہاں نما پر جھک گئی۔

اگلا کچھ عرصہ فائنل ایگزام سے پہلے والی مصروفیت میں گزر گیا۔ اور ان دنوں وہ دونوں بہت جلد ہاسٹل ڈیپارٹمنٹ اور یونیورسٹی کے در و دیوار سے جدا ہو جانے کے غم میں مبتلا ہو رہی تھیں۔ ''یہاں بے حد اچھے دن گزرے تھے۔ کچھ برے بھی تھے ٹینشن اور بیزاری سے بھرپور' مگر ان کی یاد میں بھی اپنا لطف تھا۔ انہی در و دیوار اور سبزہ زاروں کے درمیان ہمارے قہقہے گونجتے تھے' باتوں کی آوازیں گم ہو جاتی تھیں۔ ڈیپارٹمنٹ میں کبھی بے حد فریش اور کبھی تھکے تھکے انداز میں لیکچر نوٹ کیے جاتے تھے۔ لائبریری کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر عالمی موضوعات ڈسکس ہوتے تھے اور لائبریری کے اندر کتابوں کے انبار میں گم ہو جانے کو جی چاہتا تھا۔'' فروا دن میں بار بار اسی قسم کی باتیں کیا کرتی۔

''اور ہاسٹل کے مزے کسے یاد نہیں آئیں گے' ڈیپارٹمنٹ سے واپسی پر سکون کا احساس' دوست دوستوں کی باتیں' آج کل کون سا اسکینڈل اونچا جا رہا ہے' کون سے ڈیپارٹمنٹ کی لڑکی اور کون سے ڈیپارٹمنٹ کا لڑکا۔ کون کس سے ملنے آیا ہے' کس کی گاڑی اس ساتھ والی سڑک پر رات گئے تک ہارن بجاتی گزرتی ہے' اور کس کی گاڑی کا میوزک سب سے اونچا ہوتا ہے۔ کون کون شام کو تیار ہو کر اس سڑک کے چکر لگا لگا کر ختم ہو جاتا ہے اور کون کس وقت ہاسٹل واپس آتا ہے۔ سارا۔ یہ سب یونہی اسی طرح رہے گا' ڈیپارٹمنٹ' کلاس رومز' ہاسٹل' ہمارے یہ کمرے' یہ پھول پودے مگر ہم نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد چاہے ہزار دفعہ آئیں۔ یہ تعلق کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ ہمارے سوا باقی سب کچھ قائم رہے گا۔ کتنی عجیب سی یہ باتیں ہیں' جو آج سے پہلے کبھی سوچی ہی نہ تھیں۔''

''تم خواہ مخواہ اداس ہو رہی ہو' ایسا ہونا تو فطری ہے۔ ان دنوں کو بھی یاد کرو جب ہم اس ہاسٹل سے بھاگ جانے کی خواہش کیا کرتے تھے۔ جب گھر سے واپس آتے ہوئے مین برج کی شکل دیکھتے ہی لگتا تھا۔ گویا کسی قفس میں داخل ہو رہے ہوں' یہ رویے اور احساسات ہی زندگی ہیں' ان کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔'' اس نے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

اور اسی شام فروا نیچے سے چائے لے کر آئی تو اس کے خیال میں اس کے پاس ایک بڑی خبر تھی۔

''وہ تمہارا قطب مینار باہر کھڑا کتنی دیر سے کسی پیغام رساں کا انتظار کر رہا ہے۔ مگر سب پیون نجانے کہاں غائب ہیں۔''

اس نے پہلے ہی دن سے سعد کو قطب مینار کا نام دے رکھا تھا۔

''فلزا تو میرے خیال سے ہاسٹل نمبر ٹو میں گئی ہوئی ہے میں نے کچھ دیر پہلے ہی اسے جاتے دیکھا ہے' اب بے چارا کیا کرے گا۔''

اس نے ہنستے ہوئے بتایا اور اس کی بات ختم ہونے کے ساتھ ہی ''سارا بی بی'' کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

''لو اب فلزا سے مایوس ہو کر غالباً تم پر اکتفا کرنا چاہتا ہے۔'' فروا نے خیال ظاہر کیا۔

''تم ذرا باہر نکل کر کہہ دو کہ میں نہیں ہوں۔'' اس نے سکون سے چائے کا مگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی' اس میں کیا حرج ہے۔'' فروا حیران تھی۔

''بس تم کہہ دو۔'' وہ مصر رہی۔

''سارا بی بی نہیں ہیں' آپ بتا دیں۔'' باہر نکل کر مجبوراً فروا کو کہنا پڑا۔

''اچھا چلو ذرا اچھرہ تک ہو آئیں۔ میں نے ایک شرٹ کے ساتھ شلوار میچ کرنی ہے۔'' چائے پینے کے بعد فروا کو خیال آیا۔ اور وہ بھی ذرا آؤٹنگ کے خیال سے مان گئی۔ مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ جسے کچھ دیر پہلے وہ اپنے ہاسٹل میں موجود نہ ہونے کا پیغام بھجوا چکی ہے۔ وہ ابھی تک نیچے ہی کھڑا ہوگا۔ گو اس وقت اس کے ساتھ فلزا موجود تھی مگر عین اس کے سامنے سے گزر کر باہر نکلتے ہوئے اس کا دل بری طرح کانپ رہا تھا۔

''اور کرو غلط بیانیاں۔'' بس میں بیٹھتے ہوئے فروا نے کہا۔ ''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا سارا کہ تم اس کو اتنا نظر انداز کیوں کرتی ہو' اگر تمہیں یہ ساری باتیں احمقانہ ہی لگتی ہیں تو دفع کرو نہیں بس عام نارمل انسانوں کی طرح اس سے مل لیا کرو۔ تمہارا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ تمہارے اپنے اندر ایک کشمکش جاری ہے۔ کیا تم بزدل ہو سارا.....؟'' اس نے چہرا گھما کر عین اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''یا پھر تمہیں کوئی کمپلیکس ہے' اگر وہ تمہیں اتنا ہی اچھا لگتا تھا تو اتنے سارے مواقع کیوں گنوا دیے۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

''نہ میں بزدل ہوں نہ مجھے کوئی کمپلیکس ہے۔ میں چاہتی تو اسے ناز و انداز دکھا کر زیر کر سکتی تھی' مگر اصول خواہش سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ میں اپنے اصولوں سے شکست کھا گئی ہوں۔ لیکن اس شکست کو شکست ہرگز نہیں سمجھتی۔'' اس نے بلا تکلف اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ محض الفاظ ہیں' اصل میں ہم لوگوں میں وہ جوہر ہی نہیں جو کسی مرد کو اسیر کرنے میں کام

آ سکیں- ہماری سادگی ہمارے حسن پر پردے ڈال دیتی ہے اور نہ ہی ہم بہت زیادہ ہوشیار ہیں-''
فروا نے فیصلہ سنایا-

''یہ غلط ہے' کیا ناز و انداز کسی اسکول میں سکھائے جاتے ہیں- یہ تو خود بخود سمجھ میں آ جاتے ہیں' مگر روایات و اخلاق کے جو اصول میں نے اپنے لیے وضع کیے ہیں ان سے خود بھی نہیں ٹکرا سکتی- فلزا اور اس کے درمیان جو انڈر اسٹینڈنگ ہے اس کو دنیا کی کوئی دوسری حقیقت نہیں جھٹلا سکتی- میں اتنی بے وقوف نہیں کہ اسے جھٹلانے کے لیے کوئی دوسری بڑی حقیقت بننے کی کوشش کرتی' خواہ واقعات اور مواقع مجھے کتنا ہی کیوں اٹریکٹ نہ کرتے-'' اچھیرہ میں گھومتے ہوئے اس نے فروا کو بتایا-

''اس کا مطلب ہے تم اسے کوئی ایسا کھلاڑی سمجھتی ہو جو ڈبل گیم کھیلنا چاہتا ہے-'' شاپنگ کے بعد چاٹ کھاتے ہوئے فروا نے کہا- ''کیا اس میں کوئی اخلاق یا شرافت سے گری ہوئی بات ہے؟''

''نہیں- میں نے ایسا نہیں کہا-'' وہ سکون سے بولی-

''دراصل تمہارے اصولوں نے اخلاق کردار کے جو معیار تمہارے لیے وضع کر دیے ہیں تم ان سے فرار حاصل کر ہی نہیں سکتیں بس یہ ہے کہ نہ تم بزدل ہو نہ کچھ اور' بس سیدھے رستے پر چل رہی ہو' یہ ہی اصل بات ہے-'' فروا نے اس کا دل خوش کر دیا-

☆☆

اپریل کی چھٹیوں کے ساتھ ہی وہ اپنی کتابوں کے ڈھیر اٹھائے گھر واپس آئی-

''کچھ عرصہ گھر میں رہ کر پڑھوں گی-'' اس نے بابا جان کو پہلے سے بتا دیا تھا- مگر گھر میں مہمانوں کی چہل پہل تھی- ایبٹ آباد سے آغا جی کی فیملی آئی ہوئی تھی-

''جاوید کا رشتہ طے کر دیا ہے' ہم نے سوچا لڑکی والے پنڈی میں ہیں' کیوں نہ ایک ہی جگہ تقریب کر لی جائے-'' عائشہ بھابی نے اسے بتایا-

اس کا دل خوش ہو گیا- ''چلو کچھ دن تو رونق رہے گی-''

تیسرے دن پھپھو اور ان کی ساس بھی آ گئیں- اور اگلے روز فلزا بھی لاہور سے سیدھی یہیں آئی' پھپھو کی ساس اسے رابعہ آپا کی طرح ہی لگیں- پرخلوص اور محبت کرنے والی- وہ بہت ایکٹیو ہو کر جاوید بھائی کی منگنی کی تیاریوں میں مصروف تھی-

''سارا' سارا!'' اس روز بھابی کے ڈریسنگ روم میں گھسے کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے قریب سے کہیں فلزا کی آواز آئی- اس نے چونک کر باہر جھانک کر دیکھا- فلزا اور عائشہ بھابھی باہر بیٹھی تھیں-

''آپ لوگ مجھے کیوں برا بھلا کہہ رہے ہیں' بہت اچھا کیا جو میں نے سعد کا پرپوزل ریجیکٹ کر دیا-'' فلزا کہہ رہی تھی- وہ تجسس کے مارے چیزیں چھوڑ چھاڑ کھڑکی کے قریب ہو گئی-

''حد بھی ہوتی ہے کسی بات کی' میں جو پچھلے تین سال سے اس کے ساتھ لگی ہوئی ہوں' مگر وہ صاحبزادے ہیں کہ ایک مرتبہ دیکھنے پر ہی سارا کا کلمہ پڑھنے لگے- جب سے میں لاہور گئی ہوں' اس

کے منہ سے میری تعریف میں ایک جملہ تک تو نکلا نہیں' البتہ سارا کے گن جی بھر کے گائے جاتے ہیں- آپ لوگ کہتے ہیں تم اس سے ملتی ہو گھومتی پھرتی ہو' پھر انکار کا کیا جواز' مگر اس ملنے اور گھومنے پھرنے کا کیا خاک کرنا ہے' جس کے دوران صرف سارا کے بارے میں گفتگو کرنا پڑے' آخر ایک بیک ورڈ' بجھی بجھی' اور قبرستانوں کا سا تاثر لیے لڑکی میں اسے نظر کیا آتا ہے' میں تنگ آ چکی تھی اس ساری صورت حال سے' اور اب میری باری تھی' اسی لیے میں نے اسے ریجیکٹ کر دیا- بڑا زعم تھا اسے اپنی مردانگی اور وقار کا- بہت اچھا کیا میں نے اس کے ساتھ' اس نے کم مجھے کلسایا ہے-''

فلزا کے اٹھنے پر اس نے سکون سے پردا برابر کیا' اور بکھری چیزیں سمیٹنے لگی-

جاوید بھائی کی منگنی کی تقریب پُر رونق تھی' اور اس نے اس میں جی بھر کر حصہ لیا- لاہور سے رابعہ آپا اور بھائی میاں کو بھی بلایا گیا تھا- بھائی میاں ہر ایک کے سامنے اس کی تعریفیں کرتے پھر رہے تھے-

''سارا کو ہسٹری میں بے حد دلچسپی ہے-'' انہوں نے بابا جان سے کہا-

''ہاں' جب بھی آتی ہے' ٹیکسلا جانے کی فرمائش ضرور کرتی ہے' میرے باقی بچے تو بور ہو چکے ہیں' وہاں جا جا کر' مگر اس کے لیے ہمیں بھی جانا پڑتا ہے-'' بابا جان نے جواب میں اس کی شکایت کی-

''کیوں بھئی سارا- اب کے ہمیں بھی دکھا دو ٹیکسلا؟'' بھائی میاں نے اس سے فرمائش کی-

وہ جھینپ گئی- کیا ضرورت ہے ہر کسی کے سامنے اس کی حماقتیں بیان کرنے کی- مگر اس کی امی اور بابا جان اس کام میں ماہر تھے-

وہ اس فرمائش کو ٹالنے کی کوششوں میں مصروف تھی- مگر وہ بھائی میاں کے پنڈی میں قیام کا آخری دن تھا- وہ بصد اصرار اسے اپنے ساتھ اٹھا لے آئے- جاوید بھائی بطور گائیڈ ساتھ تھے- منصور بھائی اور ان کی فیملی محض تفریح کے لیے چل رہی تھی- باقی کسی کو غالباً کوئی دلچسپی نہیں تھی' اس نے اس بار ذرا ہوشیاری دکھاتے ہوئے فٹافٹ منصور بھائی کی گاڑی میں بیٹھنے کی کی- جاوید بھائی کو گرے سوزوکی میں بیٹھنا پڑا- ان کے ساتھ رابعہ آپا اور عرفی بھی تھے-

''آؤ سارا! کچھ دیر ڈرائیو کرو-''

منصور بھائی جو کچھ عرصہ سے اس کے ڈرائیونگ انسٹرکٹر بنے ہوئے تھے- شان سے بولے- وہ اس کے شوق سے واقف تھے-

''ہرگز نہیں- میں اتنا ٹریفک فیس ہی نہیں کر سکتی' باہر نکل کر کر لوں گی-''

اس نے انکار کرتے ہوئے کہا اور بھائی میاں سے گفتگو میں مصروف ہو گئی-

پنڈی سے نکل کر منصور بھائی نے بطور امتحان اسٹیئرنگ اس کے حوالے کیا- اور وہ کچھ نئے تجربے کے خوف اور کچھ تھوڑے فاصلے سے پیچھے آتی گرے سوزوکی کے ٹینشن میں کانپنے لگی-

''ہائے اتنا تیز سارا-'' بھابی نے گھبرا کر کہا- ''ذرا آہستہ چلاؤ-''

''اگر ہم نے دودھ میں آئس کریم' پاؤڈر چینی اور برف ملا کر گاڑی میں رکھ لی ہوتی تو ٹیکسلا پہنچتے پہنچتے آئس کریم تیار ہو چکی ہوتی، سارا کی ڈرائیونگ کے صدقے۔''
بھائی میاں منہ میں پائپ دبا کر شرارت سے بولے۔ مگر منصور بھائی کسی طرف دھیان دیے بغیر مسلسل اسے انسٹرکٹ کر رہے تھے، یوں نہیں یوں۔ بریک پر پاؤں رکھو، اتنا دبا کر نہیں آہستہ، کلچ دباؤ۔ گیئر بدلو، آگے پیچھے نظر رکھو شاباش۔''
اور یہ آگے پیچھے نظر رکھنا ہی تو سب سے بڑی مصیبت تھی۔ جونہی اس کی نظر بیک ویو مرر پر پڑتی گاڑی رفتار پکڑ لیتی۔
وہ بس، بس کرتی رہی مگر منصور بھائی اسے سارے ٹیکنکس سکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اس خواہش پر غصہ آیا کہ وہ ڈرائیونگ سیکھے یا ٹیکسلا جائے۔ منصور بھائی گویا اسے سزا دینے پر تلے ہوئے تھے، ٹیکسلا کا آغاز دیکھ کر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ آثار قدیمہ تک پہنچتے پہنچتے وہ منصور بھائی سمیت ہر ایک چیز سے ناراض ہو چکی تھی۔
''خدا کا شکر ہے کہ آج ہم بچ گئے، یہ دونوں بہن بھائی تو ضد لگا کر کام کرتے ہیں۔'' بھابی نے گاڑی رکنے پر اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ جواب میں منصور بھائی ڈھٹائی سے ہنس دیے۔
''اسی میں تو مزا ہے، سارا بی بی کو بھی تو پتا چلے ڈرائیونگ سیٹ پر کیسے بیٹھا جاتا ہے۔''
''میں سوچ رہا تھا شاید آپ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر نائجل میلسن کا قبضہ ہو گیا ہے۔'' پچھلی گاڑی رکنے پر دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے کسی کی آواز آئی۔ ''یا ویسے ہی فارمولا ون گراں پری (GRAND PRIX) میں حصہ لینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' وہ بغیر نوٹس لیے ناراض بیٹھی رہی۔
''چلو غصہ تھوک دو سارا۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔'' منصور بھائی نے جھک کر کہا۔
''آؤ بھئی سارا تم ہمیں ہسٹری اور کلچر دکھانے لائی تھیں۔ فلسفے کی کہانی سنانے کا ارادہ تھا۔ اب ناراض ہو کر بیٹھی ہو۔''
بھائی میاں نے بلایا، اور انہی کے کہنے پر اسے گاڑی سے اترنا پڑا، اس کے سامنے اس کی پسندیدہ دنیا تھی، وہ سب کچھ بھلا کر بھائی میاں کو ایک ایک کونا دکھانے لگی۔ ''یہ محل، یہ یونیورسٹی، یہ کلاس روم، یہ استاد کا کمرا۔ یہ سب کچھ قدیم مگر کتنا سائنٹیفک ہے۔'' وہ زور و شور سے بول رہی تھی۔
''مگر جاوید میاں...... یہ جو سری کپ ہے، اس میں ذرا سا نیا پن نظر آتا ہے۔''
بھائی میاں اس کی سننے کے بعد جاوید بھائی سے مخاطب ہوئے اور وہ قدیم تاریخی یونیورسٹی کے اس کچے کلاس روم میں اکیلی بیٹھی رہ گئی۔
''اگر برا نہ مانیں تو کیا کچھ دیر کے لیے آپ کو ماضی سے نکال کر حال میں لایا جا سکتا ہے......''
اس کے سامنے سعد آن کھڑا ہوا۔ اور وہ اسی لمحے سے گھبرا رہی تھی۔

''بھائی میاں پتا نہیں کہاں چلے گئے۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
''جانا کہاں ہے۔ یہیں کہیں ہوں گے قدیم آرکیٹیکچر کی خوبیوں پر لیکچر جھاڑتے پھر رہے ہوں گے، آپ فی الحال مجھ سے مخاطب ہو سکتی ہیں۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
''آپ سے کیا بات کی جائے، آپ تو ان سب باتوں کو وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔'' اس نے اپنے بیگ کا فیتہ کھینچتے ہوئے کہا۔
''چلیں، آپ میری خاطر وقت کو استعمال کر لیں۔ میری تسلی کے لیے۔'' وہ مسکرایا۔
''میری سمجھ میں نہیں آیا آپ کیا کہہ رہے ہیں......'' اس نے تجاہل برتا۔
''اور پھر جب میں یہ کہتا ہوں کہ جو چیز آپ کے پاس سب سے زیادہ...... قابل قدر ہے، وہ پہلے سے ہی بگڑی ہوئی ہے تو آپ برا مان جاتی ہیں۔ دیکھیے میں آپ کی اسی بگڑی ہوئی سمجھ کا ذکر کر رہا ہوں، جو کوئی بات آپ کے پلے نہیں پڑتی۔''
''پھر آپ کیوں مجھے سمجھانے والی بات کرتے ہیں، یونہی رہنے دیجیے۔'' اس نے خفگی سے کہا۔
''اسی طرح تو خفا ہو جاتی ہیں ہمیشہ، بات کیا خاک کی جائے۔ اچھا میں بات شروع کرتا ہوں۔'' پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ ''آپ کو علم ہے کہ فلزا نے میرا وہ پروپوزل ریجیکٹ کر دیا ہے۔ جو میں نے خود سے بھجوایا ہی نہیں تھا بلکہ جو میری امی کی خواہش کا نتیجہ تھا۔''
''پھر'' اس نے سر اٹھایا۔
''پھر یہ کہ میں اس احسان پر فلزا کا بے حد ممنون ہوں۔ اس نے میرے سر سے بہت سے بوجھ اتار پھینکے ہیں۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔
''اچھا مبارک ہو۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔
''شکریہ، مگر کیا آپ نہیں پوچھیں گی کہ میں کیوں خوش ہوں۔ میرے سر سے کیا بوجھ اترے ہیں۔''
''نہیں۔ کیونکہ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔''
''کیوں...... کیوں نہیں ڈسکس کرتیں آپ مجھ سے میرے ذاتی معاملے......؟'' وہ تیزی سے اس سے قریب آ کر بولا۔ ''میں نے عرصہ پہلے ایبٹ آباد میں بھی آپ سے یہ ہی کہا تھا کہ......''
''مجھے پسند نہیں ہے، کسی کے بھی ذاتی معاملات میں دلچسپی لینا۔'' اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔
''ہا!'' وہ سیدھا ہوا...... ''یہ بھی آپ کے اصولوں میں سے ہو گا۔ مگر آج میں آپ کو اس ذاتی معاملے میں انوالو کر کے ہی چھوڑوں گا۔ آخر کب تک آپ آگے بھاگتی رہیں گی، فرار حاصل کرتی رہیں گی۔ یہ زندگی ہے۔ کوئی فارمولا ون ریس نہیں ہے جس کا مظاہرہ آپ نے کچھ دیر پہلے کیا۔'' اس نے اس کے قطعی لہجے پر چونک کر سر اٹھایا۔
''جی ہاں!'' وہ الفاظ پر زور دے کر بولا۔ ''اور مجھے نہیں معلوم کہ آپ مجھ سے فرار حاصل کر کے مجھے فلزا کے پلڑے میں کیوں ڈالنا چاہتی ہیں۔''

''میں آپ سے کوئی فرار حاصل نہیں کر رہی اور فلزا کے پلڑے میں تو آپ خود سے ہی پڑے ہوئے ہیں شروع ہی سے، میرا کیا ذکر؟'' اس نے سختی سے کہا۔

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟''

''خود فلزا نے، اور معاف کیجیے گا آپ کے اپنے معمولات نے۔ یہ فلزا ہی کا بیان تھا کہ آپ کو اس جیسے زندہ دل، خوش لباس اور طرح دار لوگ پسند ہیں۔ اور مزید یہ کہ آپ صرف اور صرف اسی کے ساتھ گھومنا پھرنا، اور ادھر ادھر آنا جانا پسند کرتے ہیں، آپ اس کے الفاظ کا بھرم توڑ کر کچھ اتنا اچھا نہیں کر رہے۔'' وہ اپنی فراخدلی سے مجبور تھی۔

''مبالغہ، گپ اور فینٹسی آپ کی یہ فرسٹ کزن معاف کیجیے گا۔ ان تینوں کا ایک نادر مجموعہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ کبھی موقع ملے تو اس سے پوچھیے گا کہ آپ کو پہلی مرتبہ ایبٹ آباد میں دیکھنے پر میں نے اس سے آپ کے بارے میں کیا کہا تھا۔ اور اس کے بعد بار بار آپ کے بارے میں اس سے کیا گفتگو ہوتی رہی۔ اور کیا یہ اس گفتگو کی تکرار...... کا ہی نتیجہ نہیں کہ اس نے امی کا بھجوایا پیغام مسترد کر دیا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے۔'' اس نے دوبارہ سے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بار تم مجھے ایبٹ آباد میں وقار انکل کے ہاں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اپنے بنائے پراٹھے پر شرمندہ ہوتے ہوئے ہی بہت اچھی لگی تھیں۔ مگر بڑے بے ضرر جذبے کے ساتھ جیسے کوئی پھول، کوئی خوبصورت رنگ یا لطیف خوشبو کسی کا دل موہ لے۔ پھر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے یہ دیکھا کہ تم باقی لڑکیوں سے مختلف ہو، سادا، کھری، اور صاف گو، یہ تمہاری ذہانت و قابلیت کے جوہر تو بعد میں بھائی میاں نے کھولے، خیر......''

وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔

''مگر میں نے ایک بات محسوس کی اور وہ یہ کہ مجھے دیکھتے ہی تمہاری آنکھوں میں غصہ اتر آتا ہے، اب تک میں نے شرماتی، مسکراتی، ناز و ادا دکھاتی لڑکیاں دیکھی تھیں۔ مگر اتنا غصہ اور ناپسندیدگی اپنے لیے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ خوشی کے کسی اظہار کے بجائے ناراضگی کا یہ انداز مجھے بھا گیا۔ اسی لیے ہمیشہ تمہیں زچ کرنے کو دل مچلتا رہا۔ شنکیاری میں، میں نے تمہیں بادلوں، ہواؤں اور چشموں میں گم ہوتے دیکھا۔ مجھے بڑا اچھا لگا۔ اس میں بڑا مزا آیا۔ جب تم ارد گرد سب کو نظر انداز کر کے صرف نظاروں میں گم رہنے کی اداکاری کرتیں، مجھے خوشی محسوس ہوتی۔ اسی لیے ایبٹ آباد واپسی پر میں نے تم سے یہ ہی کہنا چاہا۔ مگر تم نے موقع نہیں دیا۔ جب تم وہاں سے چلی گئیں، تو میں نے سوچا کہ یہ محض اتفاق تھا۔ اور ایسے دور آتے ہی رہتے ہیں۔ لاہور آ کر اپنی زندگی کی مصروفیات میں کھو کر بھول جاؤں گا، مگر ایسا نہیں ہوا، تم بار بار مجھے یاد آتی رہیں۔ پھر اتفاق سے فلزا لاہور چلی آئی۔ اس سے ملنے کے بہانے تم دیکھنے کو مل جاتی تھیں میں نے ہوسٹل کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ یہ چکر فلزا کو اور خود تمہیں بھی غلط فہمی میں مبتلا کر گئے۔ حالانکہ میں نے تم سے کہا

بھی تھا کہ میں تم سے ملنے کے لیے بھی تو آ سکتا ہوں۔ مگر تمہاری بے نیازی اور سرد مہری مجھے آگ لگا گئی، جب تم مجھے نظر انداز کر کے لڑکیوں کے ہجوم میں یوں گزر جاتیں جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو تو مجھے غصہ آنے لگا۔ کیوں میں ایک ذرا سی لڑکی کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں، میرا دماغ مجھے کہتا مگر دل ہر بار نفی کر دیتا۔ وہ صرف ذرا سی لڑکی نہیں ہے، انہی دنوں میں نے ایک اور بات محسوس کی اور وہ یہ کہ جیسے ہی میں تم سے ملتا بات کرتا تم فلزا کا ذکر بڑے کاٹ دار انداز میں درمیان میں لے آتیں۔ یہ تمہاری کسی اندرونی کشمکش کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ایک بار تمہیں بد اخلاق کہا تھا تو تمہارا رنگ زرد ہو گیا۔ تمہاری مکمل ہونے والی بات کا مذاق اڑایا تو تم خفا سی ہو گئیں' اسی لیے آخر تم میرے سارے جذبات سے اتنی بے تعلق اور بے خبر تو نہیں رہ سکتی تھیں، جب میں نے تمہاری خریداری کی بات کی تو تمہاری آنکھوں میں زخمی احساس اتر آیا۔ اس کے برعکس جب میں نے تمہیں اتفاق سے ہوسٹل میں چمک دمک والے کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر تعریف کی تو تمہارے چہرے پر خوشی کا تاثر اتر آیا۔ ہو سکتا ہے یہ سب میرا وہم ہو۔ غلط فہمی ہو کیونکہ باقی کے وقت میں تمہارا رویہ سخت اور بے لچک ہی رہا۔ مجھے دیکھتے ہی تمہاری ذات کے سارے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ ہزار دستکوں پر بھی کوئی جواب نہیں ملتا تھا، نہ ہی کوئی سوراخ ایسا ملتا کہ اندر جھانکا جا سکے۔

جب ہی میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ میں تمہارے بارے میں شاید عمر بھر کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکوں، مگر اس بے اعتنائی کے باوجود میں اپنے دل سے تمہارے خیال کو نہ نکال سکا۔ تمہارے اصولوں نے اگرچہ مجھے بڑا ستایا۔ مگر انہی اصولوں نے تمہیں میری نظروں میں معتبر بنا دیا، انمول اور پرکشش دوسری تمام لڑکیوں سے علیحدہ اور پروقار، اسی لیے میں تم سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی نہ کر سکا، مجھے ایسا لگتا، جیسے اگر میں ایسا کروں گا تو تمہاری انسلٹ کر بیٹھوں گا، تمہارے وقار اور احترام میں کمی کا مجرم بن جاؤں گا۔ مگر پھر بھی میں نے رابعہ آپا اور سلمہ بھابی سے تمہارا ذکر کر دیا۔ اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کو اپنا ہم خیال پایا۔ میری قسمت کہ جیسے ہی ہم مل کر کوئی پلان بنانے لگے درمیان میں امی آ گئیں۔ وہ فلزا کو میرے لیے منتخب کر چکی تھیں۔ میں ان دونوں شکر کرتا کہ تم سے کچھ کہہ نہیں بیٹھا تھا۔ ورنہ کسی نئی کشمکش میں پڑ جاتا، میں امی کے فیصلے سے روگردانی کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے کہ ان کی دل شکنی میرے بس سے باہر تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ فلزا جانتی ہے۔ میں اس کو کتنا پسند کرتا ہوں، اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور اس کے پاس آنا جانا صرف اس لیے ہوتا رہا کہ یہ اس کی امی اور بابا کا حکم تھا کہ اس کا خیال رکھا جائے۔ ایسا ہی ایک حکم جب تمہاری امی نے دیا تھا تو تمہیں یاد ہو گا میں نے اس کا پاس کرنے کی بھی پوری کوشش کی تھی، ورنہ فلزا ان ملاقاتوں میں تمہارے ذکر سے کتنا چڑتی تھی، وہ جانتی تھی۔'' وہ ہنسا۔

''مگر ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے، حقیقت بہرحال اپنی جگہ قائم ہے، آپ کی امی کو فلزا ہی پسند تھی۔''

اس نے بغیر کوئی تاثر دیے رسان سے کہا۔ وہ اس ساری کہانی کو ایک روز پہلے اپنے سامنے اسی ترتیب سے دہرا اور اس کے صفحوں کی ترتیب کے درست ہونے کا اعتراف کر چکی تھی۔ وہ کچھ دیر ہنستا رہا۔

''جب کوئی نادان شخص حقیقت پسندی کی باتیں کرنے لگے تو ہنسی آ ہی جاتی ہے معاف کرنا۔''
پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔
''اصل میں سارا۔ تمہارے اسی ایک جملے نے تمہاری ذات پر کب سے پڑا ایک پردہ اٹھا دیا۔''
''میری ذات پر کوئی پردہ پڑا ہوا نہیں ہے۔'' وہ رکھائی سے بولی۔
''یہ تمہارا دوسرا جھوٹ ہے، ایک جھوٹ تم نے ہوسٹل میں...... موجود ہوتے ہوئے بھی انکار کر کے بولا تھا۔ جبکہ فلزا سے ایک بار تم نے کہا تھا۔ کہ تم جھوٹ نہیں بولتیں۔''
''مجبوری ہو جائے تو بول بھی لیتی ہوں'' وہ صاف گوئی سے بولی۔
''مگر یقین کرو، اب کوئی مجبوری نہیں، ہم دنیا کے بہت سے معاملات کے متعلق غلط باتیں کرتے ہیں۔ غلط امیج، غلط نظریے قائم کرتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت تک قابل معافی ہوتا ہے۔ جب تک ہم بے خبر ہوتے ہیں۔ اب تو میں نے تمہیں حقیقت حال سنا دی ہے اب تو جھوٹ مت بولو۔ خود کو دھوکا مت دو۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ یہ قدیم دنیا۔ منافقت، جھوٹ اور ریا سے عاری تھی۔ ''اس نے کچی چھت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
''آؤ اس منافقت' جھوٹ اور ریا سے عاری قدیم دنیا کے سائے تلے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کا سب سے بڑا سچ بولیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔
''ہم اب تک جو سوچتے اور سمجھتے رہے ہیں' خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو جو دھوکے دیتے رہے ہیں۔ وہ سب غلط تھے۔ آؤ اعتراف کر لیں کہ جو کچھ اپنے دل میں جھٹلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، وہی سب سے بڑی حقیقت تھی آؤ سارا! ایک بار یہ سچ بول دیں۔''
اس نے سر اٹھا کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ اور پھر ارد گرد قدیم شکستہ دیواروں اور مٹے ہوئے نقوش کو۔
''سب سے زیادہ درست چیز وقت ہے، وہی رفتہ رفتہ ہر غلط اور صحیح بات کو سامنے لے آتا ہے اور وقت کا گزر جانا بہت بڑی نعمت ہے۔'' ایک بار فروا نے کہا تھا۔
''بہت سی باتیں فرض کر لینا کچھ اتنا غلط بھی نہیں ہوتا۔'' یہ بھی اسی نے کہا تھا۔
''جیسے یہ فرض کر لینا کہ جن انگوروں کے لیے فلزا دیر تک اچھلتی رہی' وہ اسے مل بھی جاتے تو کبھی میٹھے نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ یہ ہی مقسوم ازل نے لکھا تھا۔''
اس کے دل کے سارے بوجھ ہلکے ہو گئے اور اس نے بغیر کسی خفت اور فلزا کے سامنے شرمندگی کے احساس کے اپنے سامنے پھیلا ہوا مضبوط ہاتھ تھام لیا۔ زندگی کے اس سب سے بڑے سچ کا اعتراف کرتے ہوئے اس بار اس کے اندر کوئی کشمکش نہیں ہو رہی تھی۔

(ختم شد)